ردا ڈائجسٹ

JULY
2015



July 2015

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

جولائی 2015ء
جلد نمبر 20 شمارہ نمبر 7
قیمت 60 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
720 روپے

34535726

پبلشر و ایڈیٹر صالحہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۲۹/ڈی بلاک۔2۔ پی-ای-سی-ایچ-سوسائٹی، کراچی

افسانے

مستقل سلسلے

عید مبارک



صالحہ محمود

چھم چھم برسے ستاروں کی بارش، زمین پر جب تم پاؤں دھرو، مہک اٹھے زمین ساری رنگوں سے خواب بکھریں، دھرو جو پاؤں زمین پر تم دیئے جیسے چراغ جلیں، خواہشوں کے رنگ برسیں، مانگ کی سندر تا ہیں، جب تم رنگ بھرو، زمین پر جب بھی تم پاؤں دھرو مہک اٹھے نظارے سارے، قوسِ قزح زمین پر اترے، خدا کرے خوشی بن کر، تم جب بھی پاؤں زمین پر دھرو، چمن کے سارے پھول لہلہا اٹھیں، حسین چہروں پر غازاں اترے، شبنمی رات کے آنچل میں ستارے بھرو، رنگ موسم کے اتنے تیرا لوتم ہواؤں میں تتلی کی مانند اڑا کرو۔ زمین پر جب بھی تم پاؤں دھرو، یہ دعا ہے میری صدا مسکراتی رہو حسین چہرے خوش رنگ موسموں کی طرح مسکراتی آنکھیں، چاند ستارے لبوں پر کھلکھلاتی کلیاں حسیں بانہوں میں کھنکتی چوڑیاں، حسین رنگوں کے پیراہن پاؤں میں کھنکتی پائل صدا رہے یہ باقی جواہرِ رحمت برسے اس برس تمہارے سروں کی چادر پر رحمتوں کے پھول برسیں، یہ دعا ہے ہماری یہ آرزو ہے ہماری۔

ہمارے لکھنے والے حسین چہرے، لچکتی شاخوں کی کلیاں گنگناتے جھرنے برتی بارش یہ سب منظر تمہارے چلو آؤ بیٹھ کر سوچیں ایک دن بھی ایسا جہاں پر ہم اور تم ایک بار مل سکیں۔ یہ حسین مناظر ہوں اور ہماری کلیاں، محبتوں کے دبیز پردوں میں دکھائی دیتے ہیں سارے چہرے، رنگین آنچل میں حسین چہرے۔ دعا ہے لب پر ہماری سدا رہے یہ قائم و دائم برکتوں کی ساعتیں اور عید کی خوشیاں ہوں تمہیں مبارک۔ میرے چاہنے والوں یہ چھوٹا سا حسین تحفہ سنبھال رکھنا ڈائریوں میں یہ محبتوں کا پیغام میرا حسین چہرے لکھاریوں کے وہ شباب لفظوں کی سب کہانیاں سنبھال رکھنا، دھرنا زمین پر پاؤں سنبھال کر تم بہت حسین ہے سفر تمہارا۔ ردا کے سنگ یہ سفر تمہارا۔ حسین چہرہ قلم تمہارا اور دعا ہماری۔

نوٹ: قارئین الحمدللہ اس بار عید کے حوالے سے سب ہی رائٹرز نے بہت اچھا لکھا اور کچھ تحاریر عید کے حوالے سے بہت دیر سے موصول ہوئیں لہٰذا وقت اور صفحات کی کمی کے باعث سالگرہ نمبر میں آپ ان کو انشاء اللہ پڑھ سکیں گے۔ شازیہ مصطفیٰ اور نائیلہ طارق بھی اس ماہ بھی شاملِ اشاعت نہیں انشاء اللہ اگلے ماہ ان کی اقساط بھی شامل ہوں گی۔

آپی



صالحہ محمود

عشرۂ نجات

رمضان المبارک کا سب سے اہم عشرہ "عشرۂ نجات" ہے جس میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جہنم سے نجات عطا فرماتا ہے، اسی عشرۂ نجات میں "شب قدر" جیسی عظیم رات بھی آتی ہے جس میں عبادت کرنے کا اجر و ثواب ایک ہزار راتوں سے بڑھ کر ہے۔

اس عشرے میں ہم عبادت کرکے اپنی دین اور دنیا سنوار سکتے ہیں۔

حضرت محمد ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "رمضان المبارک ایک ایسا مہینہ ہے کہ اس کا پہلا عشرہ رحمت ہے یعنی پہلے دس دنوں میں رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ دوسرا عشرہ اس کا مغفرت ہے جس میں اللہ تعالیٰ روزہ دار کے گناہ معاف فرماتے ہیں اور تیسرا اور آخری عشرہ، عشرۂ نجات ہے جو جہنم سے چھٹکارے کا ہے"۔

انسان سارا سال دنیاوی جھمیلوں میں پڑا رہتا ہے لیکن بارہ مہینوں میں سے کم سے کم اس رمضان کے ایک مہینے میں تو ہر مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور تلاوت قرآن میں گزارے۔ سال بھر تو ہم روزی روٹی اور اہل و عیال کے لیے محنت کرتے ہیں تو کیا صرف اس ایک مہینے کو صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے مخصوص نہیں کیا جاسکتا، دنیاوی کام دھندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت یوں تو عام دنوں میں بھی فرض ہے اور ہر مسلمان کو یہ فرض ادا کرنا چاہیئے لیکن ماہ رمضان میں تو ہر مسلمان کی ہر ممکن کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ وہ گناہوں سے بچے اور اپنا زیادہ تر وقت عبادت میں گزارے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کی گئیں نعمتوں، برکتوں اور رحمتوں سے لبریز "رمضان" کا مبارک مہینہ، درحقیقت مسلمانوں کے لیے ایک بہترین موقع ہے کہ وہ اس مہینے میں تھوڑی سی توجہ اور محنت کے ساتھ عبادت کرکے خالق دو جہاں سے اپنے گناہوں کی بخشش کروالیں کیونکہ اس ماہ مبارک میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی طرف خصوصی توجہ کرتا ہے اور چھوٹے چھوٹے اعمال پر بھی بے حساب اجر و ثواب سے نوازتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ: "رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں"۔ (البقرہ: 185)

روزے کا مقصد محض بھوکا پیاسا رہنا نہیں ہے اس حوالے سے رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ: "جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا، تو اللہ کو کوئی حاجت نہیں کہ وہ کھانا پینا چھوڑ دے"۔ (صحیح بخاری) اسی طرح حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے

ارشاد فرمایا کہ: ”جو شخص (روزے کی حالت میں) ناجائز کلام کرنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانے پینے کو چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے“۔ (مشکوٰۃ)

ایک اور حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ”تم میں سے جس کسی کا روزہ ہو تو نہ وہ بے حیائی کی بات کرے، نہ جہالت کا ثبوت دے اور اگر کوئی اس پر جاہلانہ طور پر چڑھ آئے تو اسے یہ جواب دے کہ میں روزے سے ہوں“ ایک اور موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”کتنے ہی روزے دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا“۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”جو لوگ رمضان کے روزے ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھیں گے ان کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے“۔ (بخاری و مسلم)

رمضان کے مہینے میں مسلمانوں کو خوب دل لگا کر اللہ سے دعائیں مانگنی چاہئیں کیونکہ اس ماہ مبارک میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعائیں قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ”میں مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے مانگے“۔ رمضان کے مہینے میں اللہ تعالیٰ مومنوں کا رزق بھی بڑھا دیتے ہیں، حضرت محمد ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ”رمضان ایک ایسا مہینہ ہے جس میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے“۔ آپ مشاہدہ کریں کہ اس مہینے میں غریب سے غریب آدمی کا دسترخوان بھی کشادہ ہو جاتا ہے اور رمضان میں اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کی بارش سے کسی تخصیص کے بغیر چھوٹے بڑے، امیر اور غریب سب کو سیراب کر دیتا ہے، غرض یہ کہ رمضان کے مہینے کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی روحانی اور جسمانی تربیت اور اصلاح کا ذریعہ اور ان کے گناہوں کو بخشنے کا ایک بہانہ بنا دیا ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے استغفار کو غم وحزن سے چھٹکارے اور فراخی رزق کا سبب قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ: ”جو شخص کثرت سے استغفار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے غم کو دور کر دے گا، اس کو ہر تنگی سے نکالے گا اور اس کو ایسی جگہ سے رزق عطا کرے گا جہاں سے اس کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا“۔ (نسائی)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ”جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ شروع ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کمر کس لیتے اور شب بیداری کرتے یعنی پوری رات عبادت اور ذکر و دعا میں مشغول رہتے اور گھر کے لوگوں یعنی ازواج مطہرات اور دوسرے متعلقین کو بھی جگا دیتے تاکہ وہ بھی ان راتوں کی برکتوں اور سعادتوں میں حصہ لیں“۔ (صحیح بخاری و مسلم، معارف الحدیث)

حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ: ”جس نے رمضان میں کسی شخص کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا تو قیامت کے دن اللہ اسے حوض کوثر کا پانی پلائے گا جس کے بعد اسے جنت میں داخل ہونے تک کبھی پیاس نہیں لگے گی“۔

حدیث میں ہے کہ: ”اس مہینے جس نے کوئی نیکی کا کام کیا یا کوئی نفلی عبادت کی تو گویا اس نے غیر رمضان میں فرض ادا کیا“۔ یعنی نفل کا ثواب فرض کے برابر ملے گا۔

......☆......

شاہدہ علی

مکمل ناول

میری چاند رات ہو......

"ماما! ماما!" سات سالہ بچہ اپنی ماں کے پیچھے لپک رہا تھا، رو رہا تھا، اپنی جنم دینے والی کو تڑپ تڑپ کر آوازیں دے رہا تھا مگر وہ اس کی آوازوں کو ان سنا کر کے تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد گیٹ کے باہر پہنچ جانا چاہتی تھی جہاں گاڑی میں اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ جونہی وہ گیٹ عبور کر کے گاڑی تک پہنچی بچہ بھی بھاگ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ قبل اس کے کہ وہ گاڑی میں بیٹھ جاتی، بچے نے اس کا پلو تھام کر اسے روکنے کی کوشش کی۔

"نہیں ماما! نہیں ماما! میں بھی جاؤں گا۔" اس نے اپنی ماں کا پلو پکڑ کر کھینچا۔

"ہٹو، جاؤ مرو جا کر اپنے باپ کے پاس، میری جان چھوڑو تم سب لوگ، جونکوں کی طرح چمٹ گئے ہو مجھے۔" اس نے اپنا پلو چھڑوا کر بچے کو زور سے دھکا دیا تو وہ پشت کے بل پکی سڑک پر جا گرا۔ اتنی مہلت کافی تھی وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی اور گاڑی زن سے نکل گئی۔

☆☆☆

مطاہر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ آج اس نے پھر وہی خواب دیکھا تھا جو وہ سات سال کی عمر کے بعد تواتر



سے دیکھتا آرہا تھا۔ خواب دیکھنے کے بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا تھا اور پھر باقی کی رات بے چینی سے کروٹیں بدل بدل کر گزارتا تھا۔

آج کی رات بھی ممکن ہے نہ سو سکوں محسن
یاد پھر آئی ہے نیندوں کو اڑانے والی

بیس سال گزر چکے تھے اس واقعے بلکہ حادثے کو جب اس کی ماں اسے اور اس کے تین سالہ بھائی وصی کو چھوڑ کر خود نئے خواب سجانے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے پاپا ہارون صاحب پر آنے والے مالی بحران میں ان کا ساتھ نہ دے سکی، حالات سے گھبرا گئی تھی یا شاید کچھ اور تھا کہ وہ پاپا کو چھوڑ کر ان کے ایک مالدار دوست کے ساتھ چلی گئی۔ اس کی ماں بلا کی خوبصورت عورت تھی مگر اس میں وفا نہیں تھی۔ اس دوپہر وصی تو دادی کے ساتھ سویا ہوا تھا مگر مطاہر جاگ رہا تھا۔ جب اس کی ماں بیگ اٹھا کر جانے لگی تو وہ اس کے پیچھے لپکا، اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ اسے دھتکار کر چلی گئی۔

پہلے بھی ان دونوں بھائیوں کو ملازمہ ہی سنبھالتی تھی جس کی نگرانی زیادہ تر دادی ہی کرتی تھیں۔ اس کی ماں زیادہ تر اپنی سرگرمیوں اور دلچسپیوں میں مگن رہتی تھی۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ماں اپنے بچوں کے لئے بہت اہم ہوتی ہے۔ وہ صرف نظر بھی آتی رہے تو بچوں کے اندر بہار سی کھلی رہتی ہے۔ اگر وہ ان کی زندگی سے نکل جائے تو بچے مرجھا کر ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مائیں اپنی ذات پر ہر دکھ جھیل لیتی ہیں مگر اپنے بچوں کو آنچ بھی نہیں آنے دیتیں مگر اس کی ماں کو اپنے خواب اتنے پیارے تھے کہ اس نے اپنے پھولوں جیسے بچوں کی قیمت پر انہیں حاصل کر لیا تھا۔ دھتکار کے جانے کا وہ لمحہ دکھ بن کر مطاہر کے اندر جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔

دکھ انسان کے پیر میں چبھے ہوئے کانٹے کی طرح ہوتا ہے۔ جب تک اسے نکال کر پھینک نہ دیا جائے یہ تکلیف دیتا رہتا ہے۔ درد کو کم ہونے دیتا ہے نہ آگے بڑھنے دیتا ہے۔ سو بہتر یہی ہے کہ دکھ کے کانٹے کو جتنی جلدی ہو سکے نکال کر پھینک دیا جائے تاکہ تکلیف سے نکل کر آگے بڑھا جا سکے۔ مطاہر ایسا نہیں کر پایا تھا۔ بیس سال گزرنے کے باوجود دکھ کا یہ کانٹا اسے چبھ رہا تھا۔ وہ اسے بھولنا بھی چاہتا تو یہ خواب اس کی ساری کوششوں کو ناکام کر دیتا تھا۔ اس کے اندر آج بھی سات سال کا وہ بچہ سسکتا تھا جو ماں کے دھتکار کر چلے جانے کے بعد عورت ذات سے ہی متنفر ہو گیا تھا اور عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ نفرت اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ اس کے ساتھ کے سارے دوست بیاہے گئے تھے مگر وہ شادی سے انکاری تھا۔ سوچتا تھا کہ عورت اگر ماں کے روپ میں وفا نہ کر سکے تو پھر کسی اور رشتے میں اس سے وفا کی توقع کرنا عبث ہے۔ اس کے لئے دیے انداز اور سخت لہجے کی وجہ سے لڑکیاں اس سے کتراتی تھیں۔

ماں کے جانے کے بعد ان دونوں بھائیوں کی پرورش ان کی دادی نے کی۔ دونوں بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مطاہر جتنا خشک مزاج اور اکھڑ سا، وصی اتنا ہی بذلہ سنج اور خوش مزاج۔

بیوی کے جانے کے بعد ہارون صاحب اتنے دلبرداشتہ ہوئے کہ پھر انہوں نے کسی عورت کی طرف دیکھا تک نہیں اور اپنے آپ کو بزنس کی مصروفیات میں گم کر لیا۔ اتنی توجہ ملنے پر بحران کا شکار بزنس جلد ہی ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ اب ان کے پاس دنیا کی ہر نعمت تھی۔ نیک اولاد، مال و دولت سب سے بڑھ کر ماں کے وجود کا گھنا سایہ مگر ان کا دل اجڑا ہوا تھا جس کے کھنڈرات میں آج بھی ''فاریہ'' بستی تھی۔ اس کی بے وفائی کے باوجود وہ اسے بھلا نہ سکے تھے۔ وہ اس سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتے تھے مگر فاریہ بہت بدقسمت تھی جو تھوڑی تنگی برداشت نہ کر سکی اور ان کے پیار بھرے دل کو ٹھوکر مار کر چلی گئی۔ بعض اوقات انسان اپنے دل کے ہاتھوں بہت مجبور ہو جاتا ہے، اتنا مجبور کہ وہ اسے اپنی مرضی پر نچانے لگتا ہے۔ عقل و شعور بھی دل کے ہاتھوں مجبور شخص کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہارون صاحب بھی فاریہ کے معاملے میں دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ ان کی ماں نے بہت کوشش کی کہ وہ دوسری شادی کر لیں مگر دل کے ہاتھوں مجبور بیٹا صرف اس معاملے میں ماں کی نافرمانی کر گیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس ''مقبوضہ دل'' کے ساتھ وہ کسی کو کوئی خوشی نہیں دے سکیں گے۔ ان کی زندگی تو برباد ہو ہی گئی تھی اب اپنے ساتھ وہ کسی دوسرے کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اب تو بہت وقت گزر گیا تھا۔ ان کا بڑا بیٹا مطاہر تعلیم مکمل کر کے ان کے ساتھ بزنس چلا رہا تھا اور ان کا چھوٹا بیٹا وصی انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ سب کچھ اپنے اپنے مدار میں ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔

☆☆☆

''السلام علیکم دادی!'' مطاہر اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے صوفے پر جا بیٹھا۔ دادی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔

''وعلیکم السلام'' انہوں نے ایک نظر اس کے تھکے ہوئے چہرے پر ڈالی۔

''تھک گئے ہو؟'' انہوں نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کیا۔

''جی دادی! آج بہت مصروفیت تھی۔ لنچ بھی ڈھنگ سے نہیں کر سکا۔ اب شدید بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کو ہے تو دے دیں پلیز۔'' اس نے ریلیکس ہو کر صوفے سے ٹیک لگائی۔

''تم منہ ہاتھ دھو کر آجاؤ میں رشیدہ سے کہہ کر کھانا لگواتی ہوں۔'' وہ اٹھ گئیں۔

''مطاہر بیٹا! میں نے کچھ دن پہلے تم سے کوئی بات کی تھی۔'' دادی نے اس کے کھانے سے فارغ ہونے کا انتظار بھی نہ کیا۔

''کیا دادی؟'' اس نے چمچ سے چاول منہ میں ڈالے۔ صاف تجاہل عارفانہ برتا جا رہا تھا۔

''تمہاری شادی کے حوالے سے۔'' دادی اس کے انداز پر ہلکا سا تپیں۔

''دادی آپ کو بتا تو چکا ہوں کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔'' اس نے اطمینان سے کھانا ختم کیا۔ دونوں اٹھ کر لاؤنج میں آ گئے۔

''کیوں؟'' دادی اور وہ آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

''یہ آپ پوچھ رہی ہیں۔'' وہ استہزائیہ ہنسا۔

''میں تمہیں کتنی بار سمجھاؤں کہ ضروری نہیں ہے کہ ہر عورت فاریہ کی طرح ہو۔ جس طرح سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے ویسے ہی ساری عورتیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ تم میری بات سمجھتے کیوں نہیں؟'' دادی نے گویا اپنا سر پیٹ لیا تھا۔

''دادی! اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ جو لڑکی میری بیوی بن کر آئے گی وہ بے وفا نہیں ہوگی۔'' مطاہر ''میں نہ مانوں'' کی تفسیر بنا بحث کر رہا تھا۔

وصی وہاں آیا تو مطاہر کی آخری بات سن کر اور دادی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اندازہ لگا چکا تھا

کہ ان میں کیا بات ہو رہی ہے۔

"دادی! آپ ایسا کریں مطاہر بھائی کی شادی زبردستی کروادیں۔" وہ آرام سے مطاہر کے ساتھ جا بیٹھا۔

"لگتا ہے اب یہی کرنا پڑے گا۔" مشورہ دادی کے دل کو لگا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"بھائی! آپ کی شادی ہوگی تو میرا نمبر آئے گا۔ آپ کو کیا بتاؤں مجھے شادی کا کتنا ارمان ہے مگر میں دادی کو نظر نہیں آؤں گا جب تک کہ آپ کی شادی نہیں ہو جاتی اور آپ شادی کے لئے مانیں گے نہیں اس لیے میں نے دادی کو "زبردستی" والا مشورہ دیا ہے۔" مطاہر نے وصی کو گھورا تو وہ وضاحت دے کر خوش آمدانہ طریقے سے اس کے کندھے دبانے لگا۔ مطاہر نے غصے سے اسے پرے دھکیلا تو وہ "نہیں بھائی نہیں بھائی" کہتے ہوئے اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ اس کے انداز پر مطاہر کی ہنسی چھوٹ گئی تو وصی بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔

"بھائی! پھر آپ نے شادی کے بارے میں کیا سوچا؟" دونوں کی ہنسی تھمی تو وصی نے سنجیدگی سے پوچھا اور جواب میں مطاہر نے اس کی پشت پر زور کا گھونسا مارا۔

"ہائے میری ہونے والی بیوی! دیکھو میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں کہ تم سے ملنے کی خاطر اپنے بڑے بھائی کے دھموکے کھا رہا ہوں۔ جانے ہم کب ملیں گے۔" وصی کی فضول ہائے وائے شروع ہوئی تو مطاہر مسکراہٹ دبائے اٹھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد وصی بھی کپڑے جھاڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دادی نے اپنے کمرے کے کھلے دروازے سے دونوں بھائیوں کی ساری گفتگو سنی تھی۔

"میرا بچہ، اسی کے دم سے تو اس قبرستان جیسے خاموش گھر میں زندگی کی جھلک دکھتی ہے۔" انہوں نے غائبانہ طور پر وصی کی پیشانی چومی۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارا صاحبزادہ تمہارے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ جیسے تم نے فاریہ کے بعد شادی نہ کرنے کی قسم کھائی تھی ویسے اس نے سرے سے شادی نہ کرنے کی قسم کھالی ہے۔" دادی نے صبح ناشتے کی میز پر ہارون صاحب کی کلاس لی۔

"اماں! آپ زبردستی نہ کریں جب اس کا دل مانے گا کرلے گا شادی بھی۔" ہارون صاحب نے حسب سابق بے فکری سے کہا۔

"کب مانے گا اس کا دل اٹھائیس سال کا ہونے والا ہے۔ اب میں کہے دیتی ہوں اس کو سمجھالو ورنہ میں اپنی کرنے پر آئی تو تم باپ بیٹے کی بالکل نہیں سنوں گی۔ پھر نہ کہنا بتایا نہیں۔" دادی ان کے انداز پر جل ہی گئیں۔

"اماں! پلیز پریشان نہ ہوں، کرتے ہیں کچھ۔" انہوں نے ناشتہ چھوڑ کر ناراض ماں کے ہاتھ تھام لیے تو وہ غصے سے سر جھٹک کر رہ گئیں۔

☆☆☆

"بابا! یہ لیجیے گرما گرم چائے۔" حرا چائے کے دو مگ ٹرے میں رکھ کر لان میں آ گئی۔ موسم بہت اچھا ہو رہا تھا سو دونوں باپ بیٹی نے شام کی چائے لان میں بیٹھ کر پینے کو ترجیح دی۔ حرا کی امی فاطمہ بیگم اپنے کسی عزیز کی عیادت کو گئی ہوئی تھیں۔ ابھی اس نے ٹرے لان ٹیبل پر رکھی ہی تھی کہ ہارون صاحب کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ گاڑی سے اتر کر وہ سیدھے ان کی طرف چلے آئے۔

"السلام علیکم! بھئی واہ میں تو بڑے وقت سے پہنچا ہوں۔ چائے کی اتنی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔" انہوں نے گہری سانس لے کر مگوں سے اڑتی بھاپ کو اپنے اندر اتارا۔

"جی انکل! آپ آیئے بیٹھیے اور اپنے دوست کے ساتھ چائے انجوائے کیجیے۔" حرا اپنی کرسی سے اٹھ گئی۔

"ارے نہیں بیٹا! تم بیٹھو اور چائے پیو۔ میں یہاں بیٹھ جاتا ہوں۔" وہ دوسری کرسی پر جا بیٹھے۔

"انکل! یہ چائے تو اب آپ ہی کو پینا پڑے گی۔ میں اپنے لیے اور بنالوں گی۔" حرا نے اپنا کپ اٹھا کر ہارون صاحب کی طرف بڑھایا۔

"ہاں بھئی! دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام۔" انہوں نے مگ تھام لیا۔

"اوہ...... ہوں...... گھونٹ گھونٹ پہ لکھا ہے پینے والے کا نام۔" حرا سر ہلا کر کھلکھلائی۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" ہارون صاحب نے مگ لبوں سے لگا کر ایک سپ لیا۔

"واہ مزا آ گیا۔ یار ذوالفقار میں تو تمہارے گھر بہانے بہانے سے صرف چائے پینے ہی آتا ہوں۔ حرا کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے واقعی لاجواب ہوتی ہے۔" انہوں نے خالی مگ ٹرے میں رکھا۔

"ہارون! میں اور تمہاری بھابھی اب حرا کی شادی کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ اگر تمہاری نظر میں کوئی اچھی فیملی ہو تو بتانا۔" ذوالفقار نے حرا کے جانے کے بعد ہارون سے کہا۔

"شادی؟" ہارون نے اچنبھے سے پوچھا۔

"اس میں اتنا حیران کیوں ہو رہے ہو۔ بچے بڑے ہو گئے ہیں اور ہم بوڑھے۔" ذوالفقار نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"وہ تو خیر تم ہو ہی گئے ہو۔ میں تو بھائی ابھی تک جوان جہان ہوں۔" ہارون صاحب نے شرارت سے کہا۔

"اچھا چل مذاق چھوڑ اور جو کام میں نے تمہیں کہا ہے اس کے لئے کوشش ضرور کرنا ورنہ میں تمہاری بھابھی کو تمہارے پیچھے لگا دوں گا پھر وہ تمہارے خوب کان کھینچیں گی۔" ذوالفقار نے اسے فاطمہ بیگم کا ڈراوا دیا۔

"نا یار! بھابھی کان بہت زور سے کھینچتی ہیں۔ میں اس سے پہلے ہی کچھ کرتا ہوں۔" ہارون نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

ذوالفقار ہارون کا بہترین دوست تھا جس نے ہر اچھے برے وقت میں اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اس کے تین بچے تھے۔ بڑا بیٹا شادی کے بعد اپنی فیملی سمیت باہر سیٹل تھا۔ اس سے چھوٹی حرا جو تعلیم مکمل کر کے فارغ تھی۔ پھر اس سے چھوٹا بیٹا تھا جو پڑھنے کی غرض سے اپنے بھائی کے پاس تھا۔ آج کل گھر میں کل ملا کر یہ تین نفوس تھے۔

☆☆☆

"اماں! وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ ادھر ہم مطاہر کی شادی کرنے کا سوچ رہے ہیں اور ادھر ذوالفقار اپنی حرا کی۔ اتنی چھوٹی سی تھی گودوں کھلایا ہے میں نے اسے اور آج اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ اس کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ذوالفقار نے مجھ سے بھی کہا ہے کہ کوئی اچھا خاندان نظر میں ہو تو اسے بتاؤں۔" ہارون صاحب معمول کے مطابق رات کو اپنی ماں کے پاؤں دباتے ہوئے آج کا احوال بیان کر رہے تھے۔

"ہارون! تم اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتے ہو اور ذوالفقار اپنی بیٹی کی...... تو...... کیوں نا تم دونوں

آپس میں مل جاؤ۔ تمہارے بیٹے کی شادی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور اس کی بیٹی کی شادی کا بھی۔'' اماں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد انہیں نئی راہ دکھائی۔

''واقعی بزرگ بزرگ ہی ہوتے ہیں، اماں! حیرت ہے مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟'' ان کے ہاتھ اماں کے پیروں پر رک گئے تو وہ مسکرا دیں۔

☆☆☆

''ہیلو ذوالفقار! کیسے ہو؟'' اگلے دن آفس پہنچ کر ہارون صاحب نے سب سے پہلے ذوالفقار کو فون ملایا۔

''ٹھیک، پر تمہیں کیا ہوا؟ کل تو مل کر گئے ہو اور آج اتنی صبح فون۔'' وہ حیران ہوئے۔

''کیا کروں، تم نے اتنا بڑا کام میرے ذمہ لگا دیا اور ساتھ بھابھی کا ڈراوا بھی میں تو ساری رات سو بھی نہیں سکا مگر میں نے تمہارا کام کر دیا ہے۔'' ہارون صاحب کا لہجہ خوشگوار تھا۔

''ہیں، اتنی جلدی؟'' ذوالفقار ان کی بات سمجھ کر بس اتنا ہی کہہ پائے۔

''ہاں! تو میرے پاس اپنی حرا کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ ہے۔ لڑکے کا نام ہے مطاہر، اس کے باپ کا نام ہے ہارون۔ باپ بیٹا دونوں مل کر اپنا بزنس چلا رہے ہیں۔ گھر میں لڑکے کا ایک چھوٹا بھائی اور دادی ہیں بس...... اور مزے کی بات یہ ہے کہ سب گھر والوں کو حرا پہلے سے بہت پسند ہے۔ بولو تمہیں یہ رشتہ منظور ہے؟'' ہارون صاحب نے ساری تفصیلات یوں بیان کیں جیسے واقعی کسی انجان فیملی کا تعارف کروا رہے ہوں۔ لہجے میں محسوس کی جانے والی شرارت اور خوشی تھی۔

''وہ کیا ہے کہ لڑکا تو مجھے بہت پسند ہے مگر اس کا نامعقول باپ مجھے کچھ خاص پسند نہیں اس لیے میں سوچ سمجھ کر، مشورہ کر کے جواب دوں گا۔'' انہوں نے ہارون کی شرارت کا جواب شرارت سے دیا تھا۔ ہارون قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تو دوسری طرف ذوالفقار بھی مسکرا دیے۔

☆☆☆

ذوالفقار نے فاطمہ بیگم سے بات کی تو وہ بہت خوش ہوئیں۔

''اللہ کا شکر ہے، اگر حرا کی شادی مطاہر سے ہو جائے تو سمجھیں کہ وہ اپنے ہی گھر میں ہے۔ اسے کوئی پریشانی نہیں ہو گی، انشاء اللہ۔'' فاطمہ بیگم خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھیں۔ ان کے اس بیان پر قریب کھڑی تقدیر دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

''واہ بھئی! یہ دونوں میاں بیوی میں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں؟ کچھ ہمیں بھی تو خبر ہو۔'' حرا ان کے پاس آ بیٹھی۔

''ہماری بیٹی اب بڑی ہو گئی ہے تو ہم سوچ رہے ہیں کہ اس کی شادی کر دی جائے۔'' ذوالفقار نے اپنی نازوں پالی کو محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

''بابا!...... وہ ٹھٹکی۔

''ہاں بیٹا، بیٹیوں کو اپنے گھر جانا ہی ہوتا ہے۔'' فاطمہ بولیں۔

''تو کیا یہ میرا گھر نہیں ہے؟'' وہ تھوڑا روٹھی۔

''ہے، بالکل ہے مگر ہم نے تمہارے لیے اس سے بھی اچھا گھر ڈھونڈا ہے۔'' ذوالفقار نے کہا۔

''بیٹا تمہارے ہارون انکل نے اپنے بیٹے مطاہر کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔ ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے مگر فیصلہ وہی ہو گا جو تم چاہو گی۔'' فاطمہ بیگم نے دھیمے لہجے میں کہا۔ حرا اس اچانک صورتحال پر نروس سی ہو گئی۔ بابا کی موجودگی میں ایسی باتیں، اسے شرم آنے لگی۔

''بھئی بس کرو۔ ہماری بیٹی کو پریشان نہ کرو۔ حرا بیٹا آپ اچھی طرح سوچ سمجھ لو، دل مطمئن ہو تو ہاں کر دینا ورنہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو گا۔'' ذوالفقار نے اس کے تاثرات دیکھ کر کہا۔

''اب جاؤ میرے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔'' انہوں نے اسے منظر سے ہٹنے کا موقع دیا۔

''مطاہر'' رات کو حرا سونے کے لیے لیٹنے لگی تو بابا ماما کی باتیں اس کے ذہن میں گونجنے لگیں۔ اس نے مطاہر کا نام دہرایا تو اس کے تصور میں سنجیدہ اور سوبر سے مطاہر کا سراپا لہرایا۔ وہ اس سے کئی بار مل چکی تھی۔ اس کا سنجیدہ انداز اسے دوسروں سے ممتاز کرتا تھا۔ جونہی مطاہر اس کے تصور میں آیا وہ مسکرا دی۔ دل ایک نئے انداز سے دھڑکنے لگا تھا۔

''ناٹ بیڈ۔'' اس نے دھم سے سر تکیے پر رکھا اور کمبل سر تک تان لیا۔

☆☆☆

مطاہر آج لیٹ آیا تھا۔ سب کھانا کھا چکے تھے۔ وصی اپنے کسی دوست کی طرف گیا ہوا تھا۔

''مطاہر فارغ ہو کر میرے کمرے میں آنا۔ میں تب تک نماز پڑھ لوں۔'' دادی اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔

''جی دادی!'' مطاہر نے پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے مصروف سے انداز میں کہا۔

مطاہر فارغ ہو کر دادی کے کمرے میں چلا گیا۔ ہارون صاحب بھی وہیں بیٹھ کر ان کے پاؤں دبا رہے تھے۔ برسوں سے ان کا معمول تھا کہ رات کو سونے سے پہلے اپنی ماں کے پاؤں دباتے تھے۔

مطاہر نے کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے ہارون صاحب کو اشارے سے پوچھا ''کیا بات ہے؟'' جواب میں انہوں نے لاعلمی سے کندھے اچکا دیے حالانکہ سب کچھ ان کے علم میں تھا۔ مطاہر نے کرسی اٹھا کر دادی کے بیڈ کے قریب کر لی۔

''مطاہر! میری تمہارے نزدیک کیا اہمیت ہے؟'' دادی خلاف معمول بہت سنجیدہ تھیں۔

''جی دادی! یہ کیسا سوال ہے؟'' وہ الجھا۔

''جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔'' ان کی سنجیدگی میں ذرا برابر کمی نہیں آئی تھی۔

''دادی! میں آپ کے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔'' اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔

''مجھے تمہاری جان نہیں چاہیے۔ مجھے...... تمہاری...... ہاں چاہیے۔''

''ہاں؟ مگر کس لیے؟'' وہ اور حیران ہوا۔

''شادی کے لیے۔'' مختصر سوال کا مختصر جواب حاضر تھا۔

''آپ لوگ سب کچھ جانتے ہیں پھر بھی مجھے فورس کرتے رہتے ہیں، میں بتا تو چکا ہوں مجھے شادی نہیں کرنی۔'' وہ حسب سابق بھڑکا اور اپنے باپ کو شکوہ کناں نظروں سے دیکھا۔

''اور میں تمہیں کتنی بار سمجھا چکی ہوں کہ ماضی میں جینے والا انسان ہر لحاظ سے گھاٹے میں رہتا ہے۔ ماضی کو بھول جاؤ اور زندگی کی خوشیوں سے اپنا حصہ وصول کرو۔'' دادی کا لہجہ قدرے سخت ہوا۔

"میرے لیے یہ ناممکن ہے۔" مطاہر نے حتمی انداز اپنایا۔

"میں نے تمہارے لیے ذوالفقار کی بیٹی حرا کو پسند کیا تھا۔ مگر تمہیں تو شادی نہیں کرنی۔ تو ٹھیک ہے ہارون تم میری سیٹ کنفرم کروادو میں کراچی نگہت (بیٹی) کے پاس چلی جاؤں اور پھر کبھی یہاں واپس نہیں آؤں گی۔ تم لوگوں کی جو مرضی ہو کرتے رہنا۔" دادی نے غصے سے ہارون صاحب کو مخاطب کیا۔

"دادی پلیز!" مطاہر اٹھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا اور ان کے کندھے تھام لیے۔ انہوں نے خفگی سے منہ موڑ لیا۔

"اب جاؤ، تمہارے پاس صبح تک کا وقت ہے۔ اچھی طرح سوچ لو۔ ہاں کی تو ٹھیک ہے ورنہ میں نگہت کے پاس چلی جاؤں گی اور تم لوگ میرا مرا منہ دیکھو گے۔" انہوں نے مطاہر کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیے تو وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ دادی اور ہارون صاحب ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

"اب دیکھنا صبح کیسے ہاں کرتا ہے۔ ہر طریقے سے منا کر دیکھ لیا تھا۔ نہیں مانا تو مجھے یہ حربہ استعمال کرنا پڑا۔" دادی نے تکیے سے ٹیک لگالی۔

مطاہر لاکھ شادی سے انکاری تھا مگر وہ دادی کی ناراضی نہیں سہہ سکتا تھا۔ دادی ہی ان دونوں بھائیوں کا سب کچھ تھیں جنہوں نے ان دونوں کے لیے ماں سے بڑھ کر قربانیاں دی تھیں۔ اب وہ انہیں اپنی زندگی سے کیسے جانے دیتا۔ وہ برا پھنسا تھا۔ "ہاں" کرتا تو خود کو کیسے سمجھاتا جو عورت کو کسی بھی روپ میں خاص طور پر بیوی کی حیثیت سے اعتبار دینے کو تیار نہیں تھا اور "نہ" کرتا تو دادی سے جدا ہو جاتا۔ دادی کو بہت کم غصہ آتا تھا مگر جب آتا تھا تو پھر وہ جو ٹھان لیتیں وہی کرتی تھیں۔ اس نے بے بس سے انداز میں خود کو بستر پر گرادیا۔

☆☆☆

رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح مطاہر کی آنکھ بہت دیر سے کھلی۔ آج کسی نے اس کو جگایا نہیں تھا۔ ورنہ پہلے دیر ہونے کی صورت میں دادی اس کو آوازیں دے کر خود جگاتی تھیں۔ مگر آج انہوں نے اس کے کمرے میں جھانکا بھی نہیں تھا جس سے ان کی ناراضی کی شدت واضح ہو رہی تھی۔ وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو کر آیا تو دادی اور وصی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ وہ بھی ادھر ہی چلا آیا۔

"دادی آپ کا جو دل چاہے کریں مگر اس طرح ناراض نہ ہوں پلیز۔" مطاہر نے اپنا بیگ سائیڈ پر رکھا اور دادی کے ساتھ بیٹھ کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"سوچ لو، میری بے عزتی نہ کروا دینا، کہیں کل کو تمہارا ارادہ بدل جائے تو میں اس عمر میں لوگوں سے معافیاں مانگتی پھروں۔" دادی ہر کام پکے پیروں والے کرنے کے موڈ میں تھیں۔ وصی دونوں کو ہونقوں کی طرح دیکھے جا رہا تھا اور بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ ماتھے پر تیوریاں سجائے مطاہر کو گھورنے لگا۔

نہیں دادی! آپ کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ بس آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔" مطاہر نے ان کے کندھے پر سر رکھ دیا تو دادی اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مسکرا دیں جو ناراضی ختم ہونے کا اشارہ تھی۔

"یہ آپ دونوں کس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں؟ کوئی مجھے کچھ بتائے گا؟" وصی خود کو چغد محسوس کر رہا تھا سو جل کر پوچھنے لگا۔

"یہ تمہیں دادی بتائیں گی۔ میں اب چلتا ہوں پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔" مطاہر اپنا بیگ اٹھا کر چلا گیا۔

"واہ......واہ...... دادی! یہ کارنامہ انجام دے کر آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ آپ واقعی وصی ہارون محمود کی دادی ہیں۔" ساری بات سن کر وصی نے دادی کا منہ چوم لیا۔

"مگر تم اتنے خوش کیوں ہو رہے ہو؟" دادی نے اسے پرے دھکیلا۔

"اس لیے کہ بھائی کے بعد مابدولت کی باری ہوگی دولہا بننے کی۔ دادی ویسے اس معاملے میں، میں آپ کو بالکل تنگ نہیں کروں گا۔ فٹ سے شادی کے لیے ہاں کہہ دوں گا۔" وصی کے انداز پر دادی نے اسے ایک زوردار دھپ لگائی۔

"ہک......ہاہ...... ایک تو میری قسمت دیکھو جو شادی کے لیے نہیں مانتا سب اس کے پیچھے پڑے ہیں اور جو تیار ہے اس پر سب تشدد کرتے رہتے ہیں۔" وصی بڑبڑ کرتے ہوئے اٹھ گیا۔

☆☆☆

پھر سب کچھ فٹافٹ ہوتا چلا گیا۔ آج مطاہر حرا کو بیاہ کر لے آیا تھا۔ دادی اور ہارون صاحب کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وصی بہت خوش تھا کہ اس کی زندگی میں بہن کی جو کمی تھی وہ پوری ہونے جارہی تھی۔ حرا بھی دل میں نئے ارمان اور جذبے سجائے بہت خوش تھی۔ سب خوش تھے سوائے مطاہر کے۔ اس کی سنجیدگی اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔

"بھائی یار! اپنے منہ کے زاویے تو ٹھیک کریں۔ قسم سے میں نے اپنی زندگی میں اتنی روتی شکل والا دولہا پہلی بار دیکھا ہے۔" وصی نے اس کے سنجیدہ انداز پر چوٹ کی مگر ادھر پروا کسے تھی۔ ساری رسموں کے بعد دادی حرا کو اس کے کمرے میں چھوڑ آئیں۔

"میں اسے کبھی خود سے قریب نہیں آنے دوں گا اور نہ ہی خود کبھی اس کے قریب ہوں گا تاکہ کل کو یہ مجھے چھوڑ کر جانا چاہے تو مجھے کوئی جذباتی دھچکا نہ لگے۔"

نئی زندگی کے پہلے قدم پر ہی وہ دل میں بدگمانیاں پال رہا تھا۔ اسے ایک لمحے کے لیے یہ خیال نہ آیا کہ عورت تو وفا کے خمیر سے گندھی ہوتی ہے۔ ہاں کچھ عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو وفا سے خالی ہوتی ہیں۔ ان کے اندر باہر ہر طرف صرف "میں" ہی ہوتی ہے مگر ایسی عورتیں آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ چند بے وفا عورتوں کے کردار کو سامنے رکھ کر ہر عورت پر "بے وفا" ہونے کی مہر لگا دی جائے۔ مطاہر اس وقت یہی کر رہا تھا۔ اس نے بغیر پرکھے حرا پر "بے وفائی" کی مہر ثبت کر دی تھی۔

حرا گھونگھٹ کی اوٹ سے مطاہر کو دیکھ رہی تھی جو کبھی صوفے پر بیٹھ جاتا تھا۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا تھا اور کبھی جا کر کھڑکی میں کھڑا ہو جاتا تھا۔ جیسے وہ کسی بڑی الجھن میں ہو اور اسے اس کا سرا نہ مل رہا ہو۔ معاً اس کے قدم بیڈ کی طرف بڑھے۔ حرا کا دل ہتھیلیوں میں دھڑکنے لگا۔

"میں بہت تھک گیا ہوں۔ سونا چاہتا ہوں۔ تم بھی تھک گئی ہو گی کپڑے بدل کر سو جاؤ۔" مطاہر نے اس کا گھونگھٹ اٹھانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ حرا ہتک کے شدید ترین احساس سے برف ہو گئی۔ وہ تکیہ اٹھا کر بیڈ کے ایک طرف لیٹ گیا۔ کافی دیر بعد حرا جو اٹھی اس کا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس نے بے اختیار اپنی انگلیوں سے چہرے کو چھوا اور اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔

مطاہر اس کو کچھ تو کہتا اس کا کوئی قصور تو گنواتا۔ اس پر کوئی الزام لگاتا تو کوئی بات بھی تھی مگر اس نے تو

حرا کو خاموشی کی ایسی مار ماری تھی کہ حرا کی انا، خودداری اور دل سب لہولہان ہو گیا تھا۔ مطاہر کے کہے ایک جملے اور انداز نے حرا کو اس کی اوقات بتادی تھی۔ وہ جو ارمانوں بھرا دل لیے کوئی تعریفی کلمہ سننے کے انتظار میں تھی اسے مطاہر نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ وہ اس کے لیے ایک ان چاہے بوجھ کی طرح ہے جس کو زبردستی اٹھانے کی کوشش میں وہ تھک کر چور ہو گیا ہے۔ سوچیں اس پر حملہ آور تھیں اور آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے۔ بہت سارو چکنے کے بعد اس نے خود کو کنٹرول کیا۔ کپڑے بدلے، منہ ہاتھ دھویا اور اپنی جگہ پر آکر لیٹ گئی۔ نامانوس جگہ اور کچھ ذہنی پراگندگی کی وجہ سے اسے ٹھیک سے نیند نہ آئی اور اس کی آنکھ بہت سویرے کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر شاور لیا اور نماز پڑھی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دل خالی سا تھا۔ لفظوں سے پہلے آنسو بہہ گئے۔ وہ رب تو انسان کے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے خیالات کو بھی پوری جزئیات سے جانتا ہے۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھوں اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے پیچھے چھپی ہوئی دعاؤں کو اس پروردگار نے حرف بہ حرف سنا تھا۔

دادی کمرے میں آئیں تو حرا میرون اور پنک اسٹائلش سے سوٹ میں ملبوس بہت اچھی لگ رہی تھی مگر وہ اس کی قدرے اتری صورت دیکھ کر چونک گئیں۔ دادی کو دیکھ کر حرا نے خود پر بشاشت طاری کرنے کی کوشش کی اور مسکراتے ہوئے ان کے گلے سے لگ گئی۔ دادی نے اس کا ماتھا چوم کر اس کو دعائیں دیں۔ مطاہر واش روم میں تھا۔ دادی نے فی الحال کچھ بھی پوچھنے کا ارادہ ترک کیا اور ناشتے کا کہہ کر پلٹ گئیں۔

"دادی ناشتہ کرنے کا کہہ کر گئی ہیں۔" حرا نے نظریں اٹھائے بغیر مطاہر کو اطلاع دی۔ وہ شیشے کے سامنے کھڑا اپنے گیلے بال سنوار رہا تھا۔ اس نے شیشے میں سے اسے ایک نظر دیکھا جو اپنی انگلی میں موجود انگوٹھی کو گول گول گھمارہی تھی۔

"چلو!" وہ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں ملبوس تیار کھڑا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ڈائننگ ٹیبل تک آئے۔ ٹیبل پر اس وقت صرف وصی اور دادی ہی تھے۔ باقی مہمان ناشتہ کر چکے تھے۔ ولیمہ چونکہ رات کا تھا تو سب ادھر ادھر نکل چکے تھے۔ ابھی وہ دونوں بیٹھے ہی تھے کہ حرا کی کزنز اور سہیلیاں ناشتہ لے کر آگئیں۔ وہ سب سے فرداً فرداً گلے ملی۔ وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھی تو اس کی پلکیں بھیگی ہوئی سی تھیں۔ جسے کسی اور نے نوٹس کیا ہو یا نہ مطاہر نے بڑے غور سے دیکھا تھا۔

"وہی دغاباز عورتوں کی طرح مگرمچھ کے آنسو۔" اس نے پلیٹ سامنے کی اور ناشتہ کرنے لگا۔

"حرا! مطاہر بھائی نے تمہیں منہ دکھائی میں کیا دیا ہے؟" اس کی کزن علینا نے بلند آواز میں پوچھا۔ حرا اس سوال پر چپ کی چپ رہ گئی۔ کیا جواب دیتی کہ اس کا گھونگھٹ تک الٹنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی تو منہ دکھائی کیسی؟ یا یہ کہ اسے منہ دکھائی میں ذلت ملی ہے۔

"بتاؤ نا حرا! لگتا ہے کوئی بہت خاص چیز ہے۔ اسی لیے حرا بتا نہیں رہی۔" اس کی بیسٹ فرینڈ نے ٹکڑا لگایا تو سب ہنس پڑیں۔ دادی نے اس کی خاموشی پر مطاہر کی طرف دیکھا تو وہ نظر چرا گیا۔

"ارے تم لوگ کیا میری بھابی کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ دل سے بڑا بھی کوئی تحفہ ہوتا ہے۔ مطاہر بھائی نے انہیں منہ دکھائی میں اپنا دل دے دیا ہے اور اس کے سامنے کسی اور تحفے کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ کیوں بھائی؟" وصی نے مطاہر کو مخاطب کیا۔

"ہاں، بالکل بالکل۔" مطاہر نے دادی کی نظروں سے خائف ہو کر بے اختیار کہا تو حرا کی کزنز اور

سہیلیوں نے "او......" کی زوردار آواز نکالی۔ آج پہلی دفعہ مطاہر کو وصی کی بک بک پر پیار آیا تھا جس سے بگڑتی بات سنبھل گئی تھی۔

"حرا بیٹا! تم تھوڑی دیر آرام کر لو پھر شام کو تمہیں پارلر وغیرہ بھی جانا ہے تو تھک جاؤ گی۔ دادی نے اسے کمرے میں بھیجا۔ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد دادی اس کے روبرو تھیں۔

"حرا بیٹا! سچ سچ بتانا، مطاہر نے تمہیں منہ دکھائی میں کیا دیا ہے؟" وہ اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ حرا نے ان کی طرف دیکھ کر خاموشی سے نفی میں گردن ہلادی۔

"مجھے اس سے یہی امید تھی۔ یہ لو کوئی پوچھے تو کہنا منہ دکھائی میں یہ کڑے ملے ہیں۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور ہاتھ میں پکڑی صندوقچی نما ڈبیا سے دو کڑے نکال کر اسے پہنا دیے۔ حرا نے بڑی مشکل سے خود کو رونے سے روکا۔ دادی اس کی کیفیات سمجھ رہی تھیں۔

"بیٹا! تم تو سب جانتی ہو کہ ان کی ماں انہیں کس طرح چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ مطاہر یہ بات آج تک نہیں بھولا۔ عورت ذات پر اس کا اعتبار آج تک بحال نہیں ہوا مگر تم پریشان نہ ہونا۔ اسے ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت لگے گا اور تمہیں صبر سے اس وقت کا انتظار کرنا ہے۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے کہ تم جلد ہی اسے اس کے خول سے باہر نکال لو گی۔ تم گھبرانا بالکل نہیں ہم سب گھر والے ہر پل تمہارے ساتھ ہیں تم کبھی خود کو اکیلا نہ سمجھنا۔ کبھی مطاہر کی شکایت کرنا ہو تو بھی سیدھی میرے پاس آنا میں اس کے کان کھینچ کر اس کو سیدھا کر دوں گی۔" دادی نے اسے گلے سے لگا لیا۔ ان کی تجربہ کار آنکھیں بہت کچھ بھانپ چکی تھیں۔ ولیمے کی تقریب کے اختتام پر حرا اپنے گھر والوں کے ساتھ چلی گئی۔

☆......☆

"مطاہر! میرے کہنے پر شادی کر تو لی ہے مگر اب مجھے کسی شکایت کا موقع نہ دینا۔" دادی نے اسے بہت کچھ جتا دیا تھا اور جو نہیں جتایا تھا وہ چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق مطاہر نے خود ہی سمجھ لیا تھا۔

"ہوں! وہی مکار عورتوں والی لگائی بجھائی اور اوچھے ہتھکنڈے۔" مطاہر زہر خند ہوا۔ اس نے سارا الزام حرا کے سر تھوپ دیا کہ اسی نے دادی سے شکایت کی ہو گی۔ غور کرتا تو سمجھ جاتا کہ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ وہ تو شکر تھا کہ حرا نے خود پر قابو رکھا تھا۔ اپنے ماں باپ تک کو خود پر بیتی کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ اگر جو وہ کچھ کہہ دیتی تو اچھا خاصا تماشا بن جاتا۔

"تم نے دادی سے میری شکایت کی ہے؟" وہ حرا کے سر ہوا۔

"شکایت؟" اس کا لہجہ سوالیہ ہوا۔

"ہاں۔"

"کیا شکایت؟" وہ سوتی کھیلنے لگی۔

"یہی کہ میں نے تمہیں......" وہ رکا کہ کیا کہے مگر حرا اس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھ چکی تھی۔

"یہ کوئی ایسا شاندار کارنامہ نہیں ہے جسے میں ہر ایک کے سامنے فخر سے بیان کروں گی۔ مجھے اپنی خودداری اور عزت نفس بہت عزیز ہے اور میں یہ بات دوسروں کو بتا کر اپنی مزید تذلیل نہیں کروا سکتی۔" حرا کے الفاظ گہرا طنز لیے ہوئے تھے۔

"تو پھر دادی نے مجھے ڈانٹا کیوں ہے؟" اسے ابھی بھی یقین نہیں آیا تھا۔

"یہ آپ انہی سے پوچھ لیں تو بہتر ہے۔" وہ اٹھ کر الماری کی طرف بڑھ گئی۔

ایپل گرین اور لائٹ براؤن موتیوں کے کام والا فراک پاجامہ پہنے، سلیقے سے کیے میک اپ میں وہ دل میں اتر جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی مگر کسی کے دل میں اترنے کے لیے ضروری ہے کہ اگلے کے دل کے دروازے کھلے ہوں۔ مطاہر کے دل کے دروازے ابھی حرا کے لیے بہت مضبوطی سے بند تھے سو اس نے حرا کو نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا۔

☆......☆

چند ہفتوں میں وہ یہاں پوری طرح ایڈجسٹ ہو چکی تھی سب کے قریب آ چکی تھی سوائے اس کے جس کا ہاتھ تھام کر وہ اس گھر میں آئی تھی جس کے ساتھ وہ ایک کمرے میں رہتی تھی۔ جس کی بیوی کہلاتی تھی مگر بیوی کی حقیقت کیا تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا
آنکھ کا دھوکا کہوں اس کو کہ سائے کا وجود
میں اسے محسوس کر سکتا تھا چھو سکتا نہ تھا
خود چڑھا رکھے تھے تن پر اجنبیت کے غلاف
ورنہ کب اک دوسرے کو ہم نے پہچانا نہ تھا
(عدیم ہاشمی)

مطاہر کا سلوک حرا کے ساتھ جیسا بھی تھا مگر ان چند ہفتوں میں وہ اس کے لیے بہت اہم ہو گیا تھا۔ وہ چپکے چپکے اسے چاہنے لگی تھی۔ وہ چوروں کی طرح چھپ چھپ کر اسے دیکھتی تھی۔ رات کو وہ سو جاتا تو حرا اٹھ کر اسے یک ٹک دیکھتی رہتی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ اس کے بالوں کو سہلائے اور اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ان کی حدت محسوس کرے۔ وہ کیا کرتی کہ جس شخص کو چاہنے اور سراہنے کا اس کے پاس سرٹیفکیٹ تھا وہ اسی کو یوں چاہ رہی تھی جیسے کوئی جرم کر رہی ہو۔

"یہ دودھ لے لیں۔" مطاہر اسٹڈی ٹیبل میں بیٹھا کوئی کام کر رہا تھا جب حرا نے سائیڈ پر گلاس میٹ رکھ کر اس پر دودھ کا گلاس ٹکا دیا۔ مطاہر نے حسب سابق کوئی جواب نہیں دیا تھا بس چند لمحے ہاتھ روکے تھے جس کا مطلب تھا کہ اس کی بات سن لی گئی ہے کرنے کو اور کچھ تھا نہیں سو وہ اپنے کپڑے الماری میں دوبارہ سیٹ کرنے لگی۔

"یہ چوڑیاں اتار دو۔ ان کی آواز مجھے ڈسٹرب کر رہی ہے۔" آج دادی نے اس کی دونوں کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں بھر دی تھیں جواب کپڑے سیٹ کرتے ہوئے اس کی کلائیوں میں کھنک رہی تھیں۔ حرا نے اپنی کلائیوں میں موجود چوڑیوں کو رشک سے دیکھا جن کی کھنک نے مطاہر جیسے سنگ دل کو "ڈسٹرب" کر دیا تھا۔ کہاں وہ دو ماہ سے اس کے ساتھ تھی اور اسے اس کی موجودگی کا احساس تک نہیں تھا۔

"تم نے سنا نہیں، میں کیا کہہ رہا ہوں؟" وہ ان سنا کر کے اپنے شغل میں مصروف رہی تو مطاہر قدرے جھنجلایا۔

"میں یہ چوڑیاں نہیں اتار سکتی۔" حرا نے صاف انکار کر دیا۔

"کیوں؟" مطاہر تپا۔

"دادی نے پہنائی ہیں اس لیے۔" حرا کو اس کا تپنا مزا دینے لگا۔

وہ پتا نہیں کس حساب کتاب میں الجھا ہوا تھا تھوڑی دیر اور برداشت کیا پھر اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

"تم یہ چوڑیاں اتارتی ہو یا میں خود اتاروں؟" مطاہر نے غصے سے اس کے کندھے تھام کر اسے اپنے مقابل کیا۔

"خود اتار دیں۔" حرا نے اپنے دونوں بازو اس کے سینے کے ساتھ ٹکا دیے۔ اس سے اس کے چہرے پر بڑی البیلی سی چمک تھی۔ وہ بے خود سا اسے دیکھے گیا۔

"اب دیکھ کیا رہے ہیں، اتاریں ناں۔" حرا کی شرارتی آواز نے اس کا سحر توڑا تو وہ اسے ہلکا سا دھکا دے کر کمرے سے نکل گیا۔ حرا اس کے انداز سے لطف لیتے ہوئے مسکرا دی۔

☆......☆

"واہ بھابھی! کیا بریانی بنائی ہے آپ نے۔ قسم سے مزا آ گیا۔ ورنہ رشیدہ کے ہاتھ کے بدذائقہ کھانے کھا کھا کر میں تو کھانوں کے اصل ذائقے ہی بھول گیا تھا۔" آج حرا نے خود بریانی بنائی تھی۔ ٹیبل پر سبھی موجود تھے۔ وصی نے بلا مبالغہ چوتھی بار اس کی تعریف کی تھی۔ مطاہر خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔

"بھائی میرا شکریہ تو ادا کر دیں۔ اتنی دیر سے آپ کی تعریف کر رہا ہوں۔" وصی نے مطاہر کو مخاطب کیا۔

"میری تعریف؟" وہ حیران ہوا۔

"ہاں بھئی آپ کی نصف بہتر کی تعریف کر رہا ہوں تو یہ تعریف آپ کو ہی پہنچ رہی ہے نا کیوں کہ میاں بیوی کی عزت سانجھی ہوتی ہے۔ کیوں دادی؟" وصی نے بات کرتے کرتے دادی سے تصدیق چاہی۔

"ہاں اگر دل کو لگے تو۔" دادی نے مختصر بات کی۔

حرا سوچ رہی تھی کہ وہ واقعی ہی مطاہر کی نصف تھی اس نے اسے مکمل کیا ہی نہیں تھا۔

وہ پلیٹ میں چمچ سے چاول ادھر ادھر کر رہی تھی۔

"آپ کے کھانے کی رفتار سے اندازہ ہو رہا ہے کہ بریانی آپ کو بھی بہت پسند آئی ہے۔ اب اگر آپ بھابھی کی تعریف میں دو لفظ کہہ دیں گے تو آپ کے الفاظ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آ جائے گی۔" وصی مسلسل اسے حرا کی تعریف کرنے پر اکسا رہا تھا۔

"واقعی بریانی بہت اچھی بنی ہے۔" وصی سے بچنے کے لیے اس نے حرا کو مخاطب کیے بغیر رسمی سے انداز میں کہا۔

☆......☆

دادی اور وصی کے ساتھ اس کی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ وصی بہنوں کی طرح اس کے لاڈ اٹھاتا اور دیوروں کی طرح اس سے فرمائشیں کرتا۔ دادی اسے زندگی کی اونچ نیچ سمجھاتیں اور بیاہتا زندگی کو کامیاب بنانے کے گر بتاتیں۔ دادی کے کہنے پر اس نے تیار شیار ہو کر مطاہر کے ارد گرد رہنا شروع کر دیا تھا مگر مقابل پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

کچھ دنوں سے مطاہر نوٹ کر رہا تھا کہ حرا ایک دم سے تیار ہو کر آنے بہانے اس کے ارد گرد چکرانے لگی تھی۔ اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتی کبھی سامنے بیٹھ کر اسے تکتی رہتی تھی۔ مطاہر کو اس کے اس عمل سے شدید چڑ ہونے لگی تھی۔ وہ اسے اتنے تیار حلیے پر اکثر ٹوک دیتا تو وہ "دادی نے کہا ہے"

کہہ کر بری الذمہ ہو جاتی۔

''ہونہہ مکار عورتیں پہلے خود کی طرف مائل کرتی ہیں اور پھر چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔'' وہ زہر خند ہوا۔

''مطاہر یہ دیکھیں دادی نے مجھے کتنی خوب صورت رنگ دی ہے۔'' وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا تھا جب حرا نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا تو وہ جو پہلے ہی اس کے بارے میں سوچ سوچ کر جل رہا تھا تپ ہی گیا۔

''کیا تکلیف ہے تمہیں؟ کیوں ہر وقت سر پر سوار رہتی ہو؟'' مطاہر نے اس کا ہاتھ دبوچ کر جھٹکا دیا تو تکلیف کی شدت سے اس کی سسکی نکل گئی اور آنسو پلکوں پر آن رکے۔ مطاہر اسے گھور رہا تھا اور وہ آنسو پینے میں مصروف تھی۔

''حرا بیٹا!'' ہارون انکل اسے پکارتے ہوئے ادھر ہی آ رہے تھے۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسوؤں کو حلق میں اتارا اور ہاتھوں سے اپنے چہرے کو تھپتھپایا۔

''جی انکل؟'' حرا آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے ہارون کی طرف متوجہ ہوگئی۔ مطاہر اس کے سیلف کنٹرول پر حیران رہ گیا مگر اس کے دل میں بدگمانی کی دیواریں اتنی موٹی تھیں کہ حرا کی ساری خوبیاں ان سے ٹکرا کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی تھیں۔ اب بھی وہ حرا کے اس انداز پر تنفر سے بھویں اچکانا نہیں بھولا تھا۔

''بیٹا جی! تم لوگوں نے کہیں سیر و سیر کے لیے نہیں جانا کیا؟ تین ماہ ہو گئے اور ابھی تک تم لوگوں نے کوئی پروگرام ہی نہیں بنایا۔'' ہارون انکل بیٹھ گئے۔

''کیوں مطاہر؟'' انہوں نے مطاہر سے استفسار کیا۔

''بابا! آپ کو معلوم ہے کہ آج کل میں اتنے اہم پراجیکٹ پر کام کر رہا ہوں اسے بیچ میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ گھومنے تو کبھی بھی جایا جا سکتا ہے۔'' مطاہر نے در پردہ صاف انکار کیا تھا۔

''اچھا جیسی تم لوگوں کی مرضی۔'' وہ کہہ کر اٹھ گئے۔

''حرا بیٹا! اچھی سی چائے پلواؤ۔''

''جی انکل۔'' وہ بھی ہارون صاحب کے پیچھے چلی گئی۔

☆......☆

ہارون انکل اور مطاہر دو دن کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ دادی کے بھتیجے کے بیٹے کی شادی تھی۔ ولیمے پر دادی حرا اور وصی گئے۔

حرا نے دادی کی فرمائش پر ڈیپ ریڈ کلر پر سلور تلے اور نگوں کے کام والی ساڑھی باندھی تھی۔ ہیوی جیولری، گھنے بالوں کی چوٹی دائیں کندھے پر ڈالی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں اور چوڑیوں کے آگے دونوں ہاتھوں میں موتیے کے گجرے جو دولہے کی بہنوں نے اسے پہنائے تھے۔ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ تقریب میں اس کی بہت تعریف ہوئی تھی۔ اس کے دل نے چپکے سے خواہش کی کہ کاش اس وقت مطاہر بھی اس کے ساتھ ہوتا۔

آج رات ہی انکل اور مطاہر کی واپسی تھی سو وہ ولیمے کی تقریب سے جلدی اٹھ آئے۔ گھر واپس آ کر حرا سیدھا اپنے کمرے میں آئی تا کہ جلدی سے چینج کر سکے۔ ساڑھی اور ہیوی جیولری کی وجہ سے اسے بہت الجھن ہو رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر کمرے میں آئی تو مطاہر بازو آنکھوں پر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ اس کا پاؤں

ہل رہا تھا جس کا مطلب تھا وہ سو نہیں رہا۔

''آپ کب آئے؟'' وہ بیڈ کے قریب آئی۔

''تھوڑی دیر پہلے۔''

''اور انکل؟''

''وہ کل آئیں گے۔''

''کھانا کھایا آپ نے؟''

''نہیں کھانا، ایک کپ کافی پلا دو۔'' وہ اسی پوزیشن میں لیٹے لیٹے اس سے بات چیت کر رہا تھا۔ حرا نے چینج کرنے کا ارادہ ترک کر کے پہلے کافی بنانے کو ترجیح دی۔ اس نے دادی کو مطاہر کے آنے کا بتایا اور کافی بنا کر کمرے میں آ گئی۔

''یہ لیں کافی۔'' اس نے کپ بڑھایا تو چوڑیاں کھنک گئیں۔

''تم سے کتنی بار کہا ہے کہ......'' وہ جھٹکے سے اٹھا تو حرا پر نظر پڑتے ہی اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ سرخ ساڑھی میں بھرپور طریقے سے تیار گویا وہ اسے جلا کر خاک کرنے کے ارادے سے کھڑی تھی۔ وہ کافی کا کپ تھامنا بھول گیا۔

''تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟'' لہجہ ناگواری سے بھرپور تھا۔ حرا نے کافی کا مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''کیوں کیسی اتنی اچھی لگ رہی ہوں آج میں۔'' حرا شیشے کے سامنے جا کر ساڑھی کا پلو پکڑ کر لہرانے لگی۔ وہ اٹھ کر اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ وہ جو پلو لہرا کر یکدم مڑی تھی اس سے ٹکرا گئی اور ساڑھی کا پلو اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے جا گرا۔ وہ فوراً جھکی اور پلو تھام کر جونہی سیدھی ہوئی مطاہر نے اس کے منہ پر پورے زور سے تھپڑ دے مارا۔ اس کے ہونٹ کا کنارا پھٹ گیا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہ واہیات لباس پہننے اور اس طوائفوں والے حلیے میں میرے سامنے آنے کی۔'' وہ بالکل ہی آؤٹ ہو گیا۔

''طوائف۔'' وہ تھپڑ کی تکلیف بھول گئی۔ اس لفظ نے اسے پاتال کی گہرائی میں دھکا دے دیا۔

''میں بیوی ہوں آپ کی۔'' اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی تھی۔

''بیوی اور طوائف میں کیا فرق ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ بیوی بھی بستر کی ساتھی ہوتی ہے اور طوائف بھی۔ جیب خالی ہو تو طوائف چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور بیوی بھی تو پھر ان دونوں میں کیا فرق ہوا بولو؟'' وہ نہ جانے کہاں جا پہنچا تھا۔ اس کی زبان ساتھ دیتی تو وہ کہتی کہ بیوی صرف بستر کی نہیں زندگی کے ہر دکھ سکھ کی ساتھی ہوتی ہے۔

مطاہر نے حرا کی دونوں کلائیاں پکڑ کر جھنجھوڑیں تو بہت سی چوڑیاں ٹوٹ کر اس کی کلائیوں میں چبھ گئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ دروازے کے باہر کھڑی دادی بت بن گئیں وہ تو مطاہر سے ملنے آئی تھیں۔ جان گئی تھیں کہ اس کے احساسات کو کیا چوٹ پہنچی ہے جس دن اس کی ماں انہیں چھوڑ کر گئی تھی اس نے بھی سرخ ساڑھی باندھی تھی مگر حرا سے ایسا سلوک کرنا کہاں کی عقل مندی تھی۔ مطاہر نے اسے صوفے پر دھکیل دیا۔ وہ ساری رات صوفے پر اسی پوزیشن میں پڑی رہی۔ اٹھ کر کپڑے تک بدلنے کی ہمت نہ کر سکی۔ صبح مطاہر جلدی چلا گیا۔ دادی اس کے پاس آئیں تو وہ ان کے گلے سے لگ کر بلک اٹھی۔

''دادی! میں ہار گئی۔ میں ان کا اعتبار بحال نہیں کر سکی۔'' وہ روتی رہی اور دادی اس کی پشت سہلاتی رہیں۔ ان کے پاس تسلی کے لیے لفظ ختم ہو گئے تھے۔ رات کو مطاہر کافی لیٹ آیا مگر دادی اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کی وہ کلاس لی کہ اس کی سات پشتوں کو بھی دادی کا غضب یاد رہتا۔ دادی سے ڈانٹ کھا کر وہ تن فن کرتا کمرے میں آیا۔ حرا وہاں نہیں تھی۔ وہ باہر نکلا تو وہ اسے کچن میں نظر آئی۔ وہ سیدھا اس کے سر پر جا پہنچا۔

''تم شکایتیں لگانے سے باز نہیں آؤ گی؟'' ہمیشہ کی طرح اس نے کچھ بھی پوچھے بغیر فرد جرم عائد کر دی تھی۔

''میں نے کچھ نہیں کہا۔'' وہ مڑ کر ساس پین میں ابلتی چائے کی طرف دیکھنے لگی۔

''تو انہیں کیا الہام ہوا ہے؟'' مطاہر نے اس کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' حرا کے انداز نے مطاہر کو اور تپا دیا۔

''تمہیں کیوں نہیں معلوم مکار عورت، تم عورتوں کی خصلت میں مکاری اور بے وفائی ہے۔'' اس نے زہر اگلا۔

''اسٹاپ اٹ مطاہر! ہر وقت عورت کی بے وفائی کا راگ الاپتے رہتے ہیں، کبھی اپنے رویے پر نظر ڈالی ہے؟ اگر آپ کی زندگی میں ماں کی حیثیت سے آنے والی عورت بے وفا تھی تو اس کا کیا مطلب ہے کہ ساری دنیا کی عورتیں بے وفا ہیں۔ نہیں سب بے وفا نہیں ہوتیں۔ آپ کو دادی نظر نہیں آتیں جو اپنے شوہر کے وفات پا جانے کے باوجود ان سے وفا نبھا رہی ہیں۔ یہ ان کی اپنے شوہر سے وفا ہی ہے کہ وہ ان کے بیٹے کی اولاد کو سینے سے لگا کر بیٹھی ہیں۔ انہیں دیکھ کر آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ دنیا کی ساری بیویاں اور مائیں ایسی باوفا ہوتی ہیں۔ یقیناً نہیں آیا ہوگا خیال کیوں کہ آپ خود ایک گھٹیا اور کم ظرف انسان ہیں۔'' مطاہر نے اس کے دونوں بازو سختی سے تھام کر اس کی بات کاٹ دی۔

''تو کیوں رہ رہی ہو اس کم ظرف انسان کے ساتھ۔ جاؤ چلی جاؤ، جان چھوڑو میری۔'' مطاہر نے اس کو پیچھے کی طرف جھٹکا دے کر اس کے دونوں بازو چھوڑ دیے اور خود باہر نکل گیا یہ دیکھے بغیر کہ وہ چولہے سے ٹکرا گئی تھی۔ اس کے ٹکرانے سے ساس پین کا توازن بگڑا اور گرم گرم ابلتی ہوئی چائے اس کا بازو جلا گئی تھی۔ ہاف سلیوز کی وجہ سے چائے ڈائریکٹ اس کے بازو پر گر کر اسے اچھا خاصا جلا گئی تھی۔

''چلی جاؤں گی۔'' وہ روتے روتے بڑبڑائی۔ ساری رات پچھلے برآمدے کی لان میں اترنے والی سیڑھیوں پر بیٹھی رہی۔

☆......☆

صبح سب ناشتہ کر رہے تھے جب حرا ایک بیگ تھامے وہاں آئی۔

''دادی، انکل میں نے ماما کو فون کر کے گاڑی منگوائی ہے۔ میں گھر جا رہی ہوں۔'' اس نے باری باری دونوں کو مخاطب کیا۔ آج اس نے ان سے اجازت طلب نہیں کی تھی ان کو آگاہ کیا تھا۔ مطاہر کے علاوہ سب پریشانی سے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''کیا ہوا بھابھی؟'' سب سے پہلے وصی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' حرا نے بیگ دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا تو اس کے بازو سے دوپٹہ سرک گیا۔

''یہ کیا ہوا؟'' تینوں کے یک زبان بولنے پر بے نیاز بنے مطاہر نے سر اٹھایا تو چمچ اس کے ہاتھ سے

پلیٹ میں گر گیا۔ حرا کا دایاں بازو کہنی سے لے کر کلائی تک بری طرح جلا ہوا تھا اور چھالوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی مگر آنکھیں پانیوں سے یوں بھریں کہ سامنے کا منظر دھندلا گیا۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے دل پر اس سے زیادہ گہرا زخم آیا ہے جس کی جلن اور تکلیف کلائی کے اس زخم سے بہت زیادہ ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا اور بیگ اٹھا کر نکلتی چلی گئی۔ دادی نے غصے سے چمچ پلیٹ میں پٹخا۔ ہارون صاحب پریشان سے سب کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔

''سب کی شکلیں کیا دیکھ رہے ہو یہ سب کیا دھرا تمہارے بیٹے کا ہے۔'' دادی نے ہارون صاحب کو لتاڑ کر گویا مطاہر پر آنے والا غصہ نکالا تھا۔

''بھائی! آپ نے بہت غلط کیا ہے۔'' وصی تاسف سے کہہ کر ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ گیا۔ دادی اور بابا بھی اٹھ گئے وہ اکیلا بیٹھا سوچتا رہ گیا کہ حرا کا بازو جل کیسے گیا۔

☆......☆

جب سے حرا کا فون آیا تھا ماما بہت پریشان تھیں۔ ڈرائیور کو بھیج کر دونوں میاں بیوی باہر لان میں کھڑے ہو کر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ دونوں کے انداز میں بے تابی اور پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ جونہی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی وہ دونوں تقریباً بھاگ کر قریب گئے حرا دروازہ کھول کر اتری اور ماما کے گلے سے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ اس کے رونے سے ماما بابا دونوں گھبرا گئے تھے۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' ذوالفقار صاحب نے اس کا بازو تھام کر اسے مام سے الگ کرنا چاہا تو اس کے منہ سے سسکی نکل گئی اور اس نے بے ساختہ اپنا بازو چھڑایا۔ ان کے قدرے زور سے پکڑنے پر بہت سے چھالے پھوٹ گئے تھے۔ ذوالفقار صاحب نے اس کا بازو ایک دم چھوڑا اور پھر زخم پر نظر پڑتے ہی دوبارہ تھام لیا۔

''یہ کیا ہوا؟'' وہ تڑپ گئے۔ حرا اس وقت کسی سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ دونوں اسے اندر لے گئے۔ اس کی زبانی سارے حالات سن کر ماما تو سکتے میں آ گئیں اور بابا مارے غصے کے کانپنے لگے۔

''ہارون! میں نے تمہارے بیٹے کو اپنی بیٹی اس لیے نہیں دی تھی کہ وہ اسے لاوارث سمجھ کر اس کے ساتھ جو چاہے کرتا پھرے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ تم نے میرے اعتبار کو کرچی کرچی کر دیا ہے۔'' ذوالفقار صاحب فون ریسیو ہوتے ہی بغیر دعا سلام کے ہارون صاحب پر برس پڑے۔ جواباً وہ خاموش رہے۔

''اب بولو، چپ کیوں ہو، بولتے کیوں نہیں؟ میری بیٹی کی اس حالت کا کیا جواز دو گے تم؟'' انہیں ہارون صاحب کی خاموشی بری طرح کھل رہی تھی۔

''ذوالفقار! میرے پاس ایسے الفاظ ہی نہیں ہیں جن کا استعمال کر کے میں تم سب سے معافی مانگ سکوں۔'' ہارون صاحب شکستہ دل ہو رہے تھے۔

''تم معافی مانگ بھی لو تو کیا ہوگا؟ میری بیٹی کی حالت نہیں دیکھی تم نے دیکھی بھی ہوگی تو محسوس نہیں کی ہوگی کیوں کہ تمہاری اپنی کوئی بیٹی جو نہیں ہے اور دوسروں کی بیٹیوں کے حوالے سے ہمارے دل بہت سخت ہوتے ہیں۔'' ذوالفقار صاحب کا غصہ کسی طور ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔

"ایسے نہ کہو ذوالفقار! حرا مجھے بیٹیوں سے بڑھ کر عزیز ہے۔ بس تم یقین رکھو کہ میں مطاہر کو اس معاملے میں کوئی رعایت نہیں دوں گا۔ پلیز تم جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کرنا۔ میں تمہاری طرف آؤں گا پھر مل کر اس مسئلے کا کوئی حل نکالتے ہیں۔" ہارون صاحب شدید شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ دوسری طرف سے کال ڈسکنیکٹ کر دی گئی۔ ہارون صاحب گہری سانس بھر کر رہ گئے۔

"بابا! آپ پلیز دادی، ہارون انکل اور وصی کو کچھ مت کہیے۔ ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ سب تو مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔" شام تک حرا کی حالت کافی سنبھل چکی تھی لہٰذا وہ ان لوگوں کی وکالت کرنے لگی تھی جو سچ ہی تھا۔

"یہ کیسی محبت ہے ان کی کہ تمہارے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا اور انہیں خبر ہی نہ ہوئی؟" ماما اس کے بار بار کہنے پر چڑ گئیں۔

"ماما! میں نے کہا تو ہے کہ وہ لوگ بے قصور ہیں۔ جب تک ان کو معاملے کی خبر ہوئی تب تک میں گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔" حرا نے اپنا بینڈیج والا بازو احتیاط سے اپنی گود میں رکھا۔

اتنے میں گیٹ کھلا اور ہارون انکل کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔

"ہارون انکل اور دادی آئے ہیں۔ پلیز ان کو کچھ مت کہیے گا۔" دونوں کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر حرا نے پھر ماما بابا کی منت کی۔

"دادی!" وہ ان کے گلے سے جا لگی۔ دادی نے اس کی پیشانی چومی اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ ہارون انکل نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"تم دونوں میرے بچوں کی طرح ہو۔ یہ دیکھو میں تم دونوں سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں۔" دادی نے ذوالفقار اور فاطمہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"اماں پلیز!" ذوالفقار نے فوراً ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"مطاہر نے ہمیں آپ کے سامنے آنکھ اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا مگر بھابھی آپ یقین رکھیے ہم سب حرا کے ساتھ کھڑے ہیں۔" ہارون نے فاطمہ کو مخاطب کیا۔ دونوں کو یقین آ گیا تھا کہ جو بھی مسئلہ تھا وہ حرا اور مطاہر کے درمیان ہی تھا۔ یہ لوگ واقعی لاعلم تھے اور اب جب علم ہوا تو اعلیٰ ظرف لوگوں کی طرح آ کر نہ صرف معافی مانگی بلکہ حرا کی حمایت کا اعلان بھی کیا۔

ذوالفقار اور فاطمہ کے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ کیا کر سکتے تھے؟ کچھ بھی نہیں اگر کچھ کر سکتے تو اپنی بیٹی کی تقدیر سے یہ تلخ لمحے کھرچ کر نکال دیتے مگر کیا کیا جائے کہ انسان تقدیر بدلنے پر قادر نہیں ہے۔ وہ بس اللہ کو پکار سکتا ہے اس کے سامنے دست سوال دراز کر سکتا ہے اور اللہ اپنے بندوں کی ہر پکار کا جواب ضرور دیتا ہے۔ جلد دے یا دیر سے۔ بس صبر سے انتظار شرط ہے، پھر وہ ذات اپنے بندے کا دامن اپنی رحمتوں سے بھر دیتی ہے۔ سو اس لمحے ذوالفقار اور فاطمہ نے بھی یہی کیا تھا اپنے اللہ کو پکارا تھا۔

☆......☆

حرا کے جانے کے بعد سب نے مطاہر کا مکمل بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ وہ کب آتا تھا؟ کب جاتا تھا؟ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر ان کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھتا تو وہ ایک ایک کر کے اٹھ جاتے اور وہ دیکھتا رہ جاتا۔

"السلام علیکم دادی!" آج مطاہر آیا تو دادی لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

"وعلیکم السلام!" دادی نے طوعاً کرہاً جواب دیا کہ سلام سننے والے پر اس کا جواب دینا فرض ہو جاتا ہے تو انہوں نے روکھے سے لہجے میں جواب دے کر فرض ادا کیا تھا۔

"دادی! وصی کہاں ہے؟" اس نے دادی کے اگنور کرنے والے انداز کو دیکھ کر خوامخواہ پوچھا۔

"پتہ نہیں، مجھے کچھ ضروری کام ہے۔" وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں تو مطاہر ہونٹ دانتوں میں دبا کر صوفے پر گر گیا۔

مطاہر پورے انہماک سے لیپ ٹاپ پر مصروف تھا جب اسے چوڑیوں کی کھنک سنائی دی۔

"تم سے کتنی بار کہا ہے کہ......" اس نے بے ساختہ کہا مگر کمرے میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ سر جھٹک کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ پھر جب جب وہ کمرے میں آتا سونا کمرا اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ کبھی سوتے میں اسے لگتا حرا کمرے میں پھر رہی ہے۔ کبھی کام کے دوران اسے لگتا وہ اس کے قریب کافی یا دودھ رکھ کر مڑی ہے مگر یہ سب فریب نظر تھا۔ کمرے میں وہ اکیلا ہوتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب وہ اس کے قریب تھی تو اس نے اسے کسی قابل نہیں جانا اور اب جب وہ دور چلی گئی تھی تو اس کا دھیان بھٹک بھٹک کر اس کی طرف جانے لگا تھا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کی اہمیت کا احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب وہ ہم سے چھن جائے یا دور چلا جائے۔ حرا بھی مطاہر سے دور ہوئی تو اسے اس کی اہمیت کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس سے دور تو تھی مگر وہ ابھی بھی اس کی دسترس میں تھی۔ وہ چاہتا تو اپنی انا پر پاؤں رکھ کر دونوں ہاتھ بڑھاتا اور اپنے دامن کو محبتوں سے بھر لیتا۔

سب ہر ہفتے حرا سے ملنے جاتے تھے ایک وہی بے خبر تھا۔ وصی اکثر حرا کے پاس جاتا اور ایک بھائی کی حیثیت سے اس کا حوصلہ بڑھاتا اس کی دل جوئی کرتا۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔

☆......☆

"دادی یہ رہی لسٹ اور سامان سارا کچن میں رکھوا دیا ہے۔ آپ اس کے مطابق چیک کروا لیں۔" رمضان المبارک شروع ہونے میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ دادی نے رمضان کے حساب سے سارے مہینے کا بازو سامان منگوا لیا تھا۔ ہر سال یہ کام مطاہر کی ذمہ داری ہوتا تھا مگر اس سال یہ کام وصی سے کروایا گیا تھا کیوں کہ اس کے بائیکاٹ میں کسی قسم کی نرمی کے چانسز نہیں تھے۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"چلیے۔" مطاہر آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا جب اسے حرا کی آواز سنائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو خالی کمرا سائیں سائیں کر رہا تھا۔

"تو تم مان لو مطاہر حرا نے تمہارے دل کو چھو لیا ہے۔ جانے انجانے میں تم اس کی کیئر اور محبت کے عادی ہو گئے ہو۔" شیشے میں نظر آتا اس کا عکس اس سے مخاطب تھا۔

"نہیں میں بابا جیسی محروم زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔ میں اسے کبھی اپنی کمزوری نہیں بننے دوں گا کیوں کہ انسان ہمیشہ اپنی کمزوری کے ہاتھوں ہی مات کھاتا ہے۔" اس نے اپنے عکس کی نفی کی۔

"تو کون کہہ رہا ہے کہ اسے اپنی کمزوری بناؤ تم اسے اپنی طاقت بنا لو۔ مرد اگر عورت کو اپنی خالص محبت سے باندھ لے تو وہ اس کی سب سے بڑی طاقت بن جاتی ہے۔" اس کے عکس نے ایک اور کوشش کی۔

"مگر بعض عورتیں خالص محبت کو بھی ٹھکرا دیتی ہیں۔" وہ اپنی بات پر بضد تھا۔

"بعض عورتیں...... ہر عورت ایسا نہیں کرتی اور تمہیں ابھی تک یہ احساس نہیں ہوا کہ حرا کیسی عورت ہے۔ بے وقوف وہ ایسی عورت ہے جو ساری زندگی تمہاری محبت میں بندھی رہنا چاہتی ہے مگر تم نے محبت سے اسے قریب کرنے کے بجائے سختی سے اس کے نازک دل کو کچل دیا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے اسے منا کر لے آؤ۔" مطاہر اپنے عکس سے نظریں چرا کر اٹھ گیا۔ مطاہر اور یہ بات آسانی سے مان لیتا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

☆......☆

رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ رمضان میں دادی کی اپنی مصروفیات ہوتی تھیں۔ غریبوں تک راشن پہنچانا۔ زکوٰۃ کا حساب کتاب اور ادائیگی اس کے علاوہ ان کی خصوصی عبادات اور تسبیحات وغیرہ۔ اس مہینے میں وہ بہت کم فارغ نظر آتی تھیں۔ اب بھی مطاہر کی ان سے سحری اور افطاری کے وقت ہی خاموش ملاقات ہوتی تھی۔

"تراویح پڑھ کر آج میری بات سننا۔" حرا کو تین مہینے ہونے کو آئے تھے اور ان تین مہینوں میں ہارون صاحب نے بلا مبالغہ مطاہر کو کوئی تیسری بار خود سے مخاطب کیا تھا۔

"یہ کاغذات لے جاؤ اور انہیں پڑھ کر دستخط کر دینا۔" ہارون صاحب نے ایک فائل مطاہر کی طرف بڑھائی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے فائل الٹ پلٹ کر کے دیکھی۔

"تمہاری آزادی کا پروانہ۔ تم جا کر پڑھ لو خود ہی سمجھ جاؤ گے۔" ہارون صاحب نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

مطاہر ڈھیلے قدموں سے چلتا اپنے کمرے میں آیا اور کاغذات کھول کر پڑھنے لگا۔

"میں مطاہر بن ہارون اپنے پورے ہوش و حواس میں حرا بنت ذوالفقار کو طلاق دیتا ہوں۔" کاغذات پڑھ کر اس نے فائل غصے سے دور پھینکی۔ پوری عبارت پڑھ کر اس کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ حالانکہ اسے تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ اس کی جان چھوٹ رہی تھی۔ مگر وہ تو الٹا بے چین ہو گیا تھا۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

ساری رات وہ بے چینی کا شکار رہا۔ سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ سحری کے وقت وہ بہت خاموش تھا۔ سبھی بہت خاموش تھے۔ اس نے دادی کی آنکھوں میں نمی چمکتے دیکھی۔ وہ بے چین ہو گیا۔ اس کا دل چاہا وہ اٹھ کر دادی کو اپنے سینے سے لگا لے مگر فی الوقت وہ ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔

☆......☆

آج بیسواں روزہ تھا۔ حرا افطاری کے نام پر چند گھونٹ پانی پیے اور ایک کھجور کھا کر مغرب کی نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ ہر نماز کے بعد وہ اپنے اللہ سے مطاہر کا ساتھ مانگتی تھی۔ اس کی محبت کے لیے جھولی پھیلاتی مگر اس کے دل کی بے چینی ختم نہ ہوتی۔ رات دیر تک عبادت کرتے ہوئے ایک ایسا وقت بھی آتا کہ وہ دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتی تو لفظ ساتھ چھوڑ جاتے۔ وہ خالی ہتھیلیاں پھیلائے اپنے ہاتھوں کی لکیروں

کو تکتی رہتی۔

کبھی کبھی حرا کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ میں اس لکیر کا اضافہ کر لے جو اسے اس کے مطاہر سے ملا دے مگر ایسا صرف سوچا جا سکتا تھا کیا نہیں جا سکتا تھا۔ انسان لاکھ کوشش کر لے وہ اپنے مقدر کی لکیروں کو بدل نہیں سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ جانے اب تک کتنے لوگ اپنے مقدر کی لکیروں کو مٹا کر اپنی من پسند لکیریں لگا لیتے۔

☆......☆

"وصی یار تم لوگ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟" آج پچیسواں روزہ تھا۔ بابا نے وصی کو مطاہر سے کاغذات لینے بھیجا تھا۔

"ہم کیا کر رہے ہیں؟ آپ خود ایسا چاہتے ہیں۔" وصی نے اس کی بات کا خاصا برا مانا تھا۔

"بابا سے کس نے کہا ہے کہ میں حرا کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔" گویا الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

"آپ کے رویے نے بھائی۔ آپ کے اخلاق کی بدصورتی چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ آپ بھابھی کو بسانا نہیں چاہتے۔" آج وصی بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"حرا بھابھی آپ سے بہت محبت کرتی ہیں مگر آپ نے ان کے محبت بھرے دل کو ٹھوکر مار کر لہولہان کر دیا ہے۔ جب آپ کو انہیں اپنے ساتھ نہیں رکھنا تو پھر فیصلے میں اتنی دیر کیوں؟ سائن کریں اور قصہ ختم کریں۔" وصی کرسی پر ٹک گیا۔

"اگر میں حرا کے زخمی دل کا مرہم بننے کا فیصلہ کر لوں تو تم میرا ساتھ دو گے؟" مطاہر نے اپنی چیختی چلاتی انا کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ کر اپنے دل کی بات کی۔ وصی حیرت سے پوری آنکھیں کھول کر اسے تکنے لگا۔ پھر وہ اٹھا اور مطاہر کا چہرہ ٹٹولنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" مطاہر اس کے انداز پر قدرے خفا ہوا۔

"بھائی دیکھ رہا ہوں کہ یہ آپ ہی ہیں یا آپ کی جگہ کوئی اور پلاسٹک سرجری کروا کر آیا ہے۔" مطاہر نے اس کی پیٹھ پر دھموکا جڑا۔

"اف! مگر اب یہ مکا کھا کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ مطاہر ہی ہیں۔" وصی حرا کے لیے خوش تھا۔ بہت خوش۔

ستائیسویں روزے کو عشاء کی نماز کے بعد مطاہر کو دادی کے کمرے میں طلب کیا گیا۔ دادی، بابا وصی سب وہاں موجود تھے۔ وہ دروازے کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمہیں میں نے کچھ کاغذات دیے تھے۔" ہارون صاحب کی ادھوری بات بہت مکمل تھی۔ مطاہر نے وصی کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ تم نے بتایا نہیں۔

"بابا! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ......" وصی کی آدھی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ ہارون صاحب نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کروا دیا۔

"مطاہر! میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔" ہارون صاحب نے دوبارہ اسے مخاطب کیا۔

"بابا! میں...... میں...... ایسا تو نہیں چاہتا۔" وہ اٹک اٹک کر اتنا ہی کہہ پایا۔

"صاحب زادے! آپ بتانا پسند کریں گے کہ اصل میں آپ کا منشا کیا ہے؟" دادی نے کڑک کر پوچھا۔

"میں......حرا کو واپس لانا چاہتا ہوں۔" اس نے دادی کو دیکھا۔

"تا کہ تم پھر سے اسے اپنے سخت رویے کی مار مار سکو۔" دادی کسی رعایت کے موڈ میں نہیں تھیں۔

"نہیں دادی! اب کے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" وہ برا پھنسا تھا۔

"دیکھو مطاہر! تم میرے بیٹے ہو تو حرا مجھے بیٹیوں سے بڑھ کر عزیز ہے۔ اب تک جو ہو چکا سو ہو چکا مگر اب میں بالکل نہیں چاہوں گا کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی ہو۔ زندگی کی خوشیوں پر اس کا بھی حق ہے۔ تم ہمارے پریشر میں آ کر اپنے اوپر جبر مت کرو، جو تمہارے دل کی خوشی ہے وہی کرو۔" ہارون صاحب کا انداز بے لچک تھا۔ مطاہر نے بے بسی سے وصی کی طرف دیکھا۔ اس نے نظروں ہی نظروں میں اسے تسلی دی۔

"بابا! بھائی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ انہیں ایک موقع دے دیں پلیز۔" وصی نے اس کی طرف داری کی۔

"تمہارے پاس کل تک کا وقت ہے ایک دفعہ پھر سوچ لو۔ اب کسی کوتاہی کی گنجائش نہیں ہے۔" بابا اٹھ گئے۔

پھر اگلے روز مطاہر نے واقعی اپنے دل کا فیصلہ سنایا۔ اس نے دادی اور بابا سے معافی مانگی اور انہیں یقین دلایا کہ اب حرا کو اس کا جائز مقام ملے گا اور اس سال کی عید حرا کی پوری زندگی پر محیط ہو گی، انشاء اللہ۔

☆......☆

آج انتیسواں روزہ تھا۔ اس دفعہ عید انتیس کی ہونے کے چانس تھے۔ آٹھ بجے کے قریب عید کا چاند نظر آنے کا اعلان ہوا تو ہر طرف جیسے رونقیں جاگ اٹھیں۔ گلی محلوں اور بازاروں میں زندگی ٹھاٹھیں مارنے لگی۔ ایسے پر رونق موقع پر تین نفوس ازحد اداس تھے۔ ذوالفقار، فاطمہ اور حرا۔

حرا کی پچیس سالہ زندگی میں یہ پہلی چاند رات اور عید تھی جس پر وہ اداس تھی۔ ورنہ عید کے حوالے سے اس کا جوش اور تیاریاں دیدنی ہوتی تھیں مگر اب کی بار اس کا دل اجڑا اجڑا تھا تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ماما بابا کے کئی بار کہنے کے باوجود اس نے عید کی کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ ماما بابا اپنی لاڈلی کی اجڑی حالت دیکھ کر دن میں کئی بار آنسو پونچھتے تھے۔

سونی گھر کی چوکھٹ
اور میرا دل
منتظر تیری آہٹ کا
تو آئے تو
آج دل شاد ہو
خوب صورت سی بات ہو
چلے آؤ
کہ میری چاند رات ہو......

افطاری کے بعد سے حرا اپنے کمرے میں تھی۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے اداس بیٹھی تھی۔ باہر چاند رات کی رونقیں عروج پر تھیں۔ اسے مطاہر کے رویے کے پیش نظر کوئی خوش فہمی نہیں تھی مگر پھر بھی اس کا دل اس کی آمد کا شدت سے منتظر تھا۔

اس کے کمرے کا دروازہ دھیرے سے کھلا۔ وہ یونہی بیٹھی رہی۔ کوئی دھیرے سے چل کر آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے مطاہر کو دیکھ کر وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ اسے لگا اس کا گمان مجسم ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ اسے کمرے میں اس کی موجودگی پر یقین کرنے میں چند لمحے لگے تھے۔ جونہی اسے یقین آیا وہ یکدم کھڑی ہوئی اور اس کے گلے سے لگ کر رو دی۔ مطاہر نے اسے اپنی پناہوں میں لے لیا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ نہ جانے کتنے ہاتھ پاؤں جوڑنا پڑیں گے مگر یہاں تو......" تھوڑی دیر بعد مطاہر نے معنی خیزی سے بات ادھوری چھوڑی تو حرا جیسے حواس میں آئی۔ اپنی اس بے اختیاری پر خفت سے سرخ پڑ گئی۔ اس نے فوراً اس سے الگ ہونے کی کوشش کی جسے مطاہر نے ناکام بنا دیا۔

"میں نے سوچا تھا کہ میرے سخت رویے سے تنگ آ کر تم خود ہی مجھے چھوڑ دو گی۔ یوں میرے سر پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ مگر تمہارے جانے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ تم تو میرے دل و جان سے چٹ گئی ہو۔ اب کسی صورت چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔" مطاہر نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اونچا کیا اور اپنی محبت کی لو دیتی آنکھیں اس کے چہرے پر جما دیں۔

"آپ چھوڑ کر تو دکھائیں میں اپنی اور آپ کی جان ایک کر دوں گی۔" حرا نے مطمئن ہو کر اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپا لیا۔

"وہ تو ہو گئی جان مطاہر۔" مطاہر نے اپنی ٹھوڑی اس کے سر پر ٹکا دی۔

بعض اوقات کسی شخص کا خود چل کر آ جانا ہر ناراضی اور گلے شکوے کو مٹا دیتا ہے۔ مطاہر کے آ جانے اور مان سے منا لینے نے حرا کے دل سے ہر شکوہ دھو دیا تھا۔ اب اس کے دل کے شفاف آئینے میں مطاہر کی تصویر پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔

وہ دونوں نیچے آئے۔ حرا، دادی، انکل اور وصی سے ملی۔ سب بہت خوش تھے۔

"بھائی جلدی کریں۔ بھابھی کی پہلی عید ہے ہمارے ہاں، ان کی عید کی شاپنگ بھی کروانی ہے۔ ان کی یہ عید بہت یادگار ہونی چاہیے۔" وصی نے بڑے مودب انداز میں کہا تھا۔

"تم پریشان نہ ہو سب ہو جائے گا۔ تم دادی اور بابا کو لے کر گھر جاؤ۔" مطاہر نے اسے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔

"میرے بغیر؟" وہ تڑپ گیا۔

"جی آپ کے بغیر۔" مطاہر نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

"لو جی بیوی کے سامنے ہی بھائی کو کیسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا ہے۔" وصی اپنے انداز میں شروع ہو چکا تھا۔

"ارے نہیں وصی! تم چلو ہمارے ساتھ۔" حرا نے اس کو تسلی دی۔

"جی نہیں مجھے آپ کے شوہر نامدار سے مار نہیں کھانی۔ بس آپ سب میری ایک بات سن لیں۔ میری ہونے والی بیوی جب میری بیوی بن جائے گی تو تم دونوں بھی خود ہی شاپنگ کرنے جائیں گے آہو......"

اس کی باتوں سے سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ خوشیاں ہالہ بنا کر ان سب کے گرد ناچنے لگی تھیں۔

☆......☆

ناولٹ

یہ عید اور وہ اک پاگل سی لڑکی

اسے شاید کچھ ہی دیر میں ابتدائے موت ہو جاتی تھی۔ وہ موت جس سے انسان تمام عمر بھاگتا ہے، ہزاروں حربے آزماتا ہے لیکن وہ اسے نہیں چھوڑتی ہمیشہ اس کے تعاقب میں رہتی ہے اور ایک وقت



ایسا آتا ہے جب وہ اس کا رستہ روکے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کی بے بسی پر قہقہے لگاتی ہے اس کا مذاق اڑاتی ہے اور انسان بے بس سا اسے دیکھتا رہ جاتا ہے۔ تب اسے خیال آتا ہے کہ اس نے تو اپنی ساری عمر یونہی گنوا دی بغیر کسی مقصد کے تب وہ بے حد پچھتاتا ہے۔ وہ بھی اس وقت پچھتا رہی تھی سامنے کھڑا وکیل اس سے اس کا گناہ پوچھ رہا تھا۔ سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ کتنی دیر سے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ وہ بے گناہ ہے بے قصور ہے۔ پر کوئی اس پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ اس نے بے اختیار اپنی آنکھیں زور سے بند کر لی تھیں جیسے وہ حقیقت سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس نے اختیار دل میں دعا مانگی تھی۔ "اے اللہ! مجھے ذرا سی زندگی اور دے دے میرے مالک۔" وہ اس وقت خود کو بے حد بے بس محسوس کر رہی تھی اتنا کہ حد نہیں تب ہی اس کا فیصلہ ہونے لگا۔ اریج بیٹا! جاؤ اندر سے سبزی لے آؤ، تمہارے ابو آنے والے ہوں گے۔" وہ بری طرح پڑھنے میں گم تھی جب اماں کی آواز پر وہ چونکی اور اٹھ کر اندر سے سبزی اٹھا کر اماں کے ساتھ بیٹھ کر بنانے لگی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے اس کی نظر اندر داخل ہوتے ببلو پر پڑی تو وہ چونک کر اٹھی۔ ببلو کی شرٹ پھٹی ہوئی تھی۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ رخسار سوجھے ہوئے تھے۔ وہ اور اماں تڑپ کر آگے بڑھیں اماں اسے گلے سے لگاتے ہوئے پریشانی سے بولیں۔

"کیا ہوا میرے لال، کس نے مارا تجھے؟"

"ابرش پانی لے آؤ بھائی کے لیے۔" اریج فکرمندی سے ببلو کو دیکھتے ہوئے بولی تو پریشان سی ابرش جلدی سے بھاگ کر پانی لے آئی۔

"کیا ہوا تھا میرے بہادر بھائی کو۔" اسے پانی دے کر وہ پریشانی سے بولی تو وہ روتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ اماں! میری لڑائی ہوگئی تھی جہاں پر اسکول کے باہر میں چھولے بیچتا ہوں نا اس لیے لڑکے مجھے فقیر فقیر کہنے لگے اور کہنے لگے کہ میں بھیک مانگتا ہوں چور ہوں تو میں نے کہا نہیں میں نہ بھیک مانگتا ہوں نہ ہی چور ہوں تو انہوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔" وہ معصومیت سے بولا تو بے اختیار اریج کو اپنے دس سالہ بھائی پر ٹوٹ کر پیار آیا وہ اس کے سر پر پیار کر کے محبت سے کہنے لگی۔

"نہ امیر لوگ بڑے ہوتے ہیں اور نہ ہی غریب لوگ چھوٹے ہوتے ہیں بلکہ اللہ کی بارگاہ میں سب برابر ہیں۔ تمہیں پتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے روزانہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے تھے۔ ایک دن اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ موسیٰ جاؤ اور اپنے سے کسی کمتر کو تلاش کر کے لاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم خداوندی سے ساری کائنات چھان ماری مگر اپنے سے کم کسی کو نہ پایا۔ شام کو خالی ہاتھ لوٹے۔ اللہ پاک نے فرمایا: اے موسیٰ اگر آپ ایک بکری کے بچے کو بھی لے آتے تو ہم آپ کو نبوت سے محروم کر دیتے۔ اس واقعے کا مطلب ہے کہ کسی کو اپنے سے حقیر نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ اللہ نے ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خوبی رکھی ہے اور اللہ کی نظر میں سب برابر ہیں۔"

"تو پھر آپی! یہ دنیا کے لوگ ایک دوسرے میں اتنا فرق کیوں رکھتے ہیں۔ غریبوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟" اس کے چپ کرنے پر ببلو مزید بولا تو اریج کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو چلے آئے۔

"مفلسی انسان کو اپنی عمر سے کئی گنا بڑا کر دیتی ہے۔"

"یہ تو انسانوں کی سوچ ہے اور پھر سب آخرت میں اپنے اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہوں گے، خیر آؤ کپڑے بدل کر منہ ہاتھ دھولو۔" وہ محبت سے بولی تو ببلو اپنے کانوں کو پکڑ کر شرمندگی سے

بولا تھا۔

"آپا! مجھے معاف کر دیں وہ لڑائی میں انہوں نے کافی ساری مٹی چھولوں پر ڈالی تھی۔"

"کچھ نہیں ہوتا تمہاری تو غلطی نہیں ہے نا، چلو اٹھو اب۔" وہ پیار سے اس کے بال بگاڑ کر بولی تو وہ اس کے گلے لگتا اٹھ کر ابرش کے ساتھ چل دیا۔

"مجھے تم پر فخر ہے اریج بیٹا۔ بہت سمجھ دار ہو تم۔" عائشہ بیگم نم آنکھوں سے مسکرا کر بولیں تو وہ ان کے ہاتھوں کو تھام کر عقیدت سے بولی۔

"آپ کی بیٹی جو ہوں۔ چلیں اب سبزی بنا لیں ابو آتے ہوں گے۔" اس کی بات پر انہوں نے مسکرا کر اپنی ہونہار بیٹی کو دیکھا تھا۔

بیٹھے بیٹھے اس کی کمر شل ہو چکی تھی۔ کل سے اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ بھوک کی وجہ سے کمزوری ہو گئی تھی اسے۔ یہ قانون کا نظام بھی بڑا عجیب ہے ہمیشہ جھوٹ کو ہی سچ مانتا ہے۔" وہ اپنے خیالوں میں گم تھی جب گالیاں بکتی جیلر عورت اندر داخل ہوئی۔

"ارے حرام خوروں، اٹھو کھانا کھا لو، چلو نکلو......" وہ دوبارہ گالیاں بکنے لگی۔ ساتھ ساتھ سب جیلوں کے تالے بھی کھولنے لگی۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ یہ کیسی عورت تھی وہ جس کے دل میں دل نہیں پتھر تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بھوک سے اس کی بری حالت تھی۔ سب کے پیچھے چلتے ہوئے وہ بڑے سے میدان میں آگئی جہاں لمبی لائن میں اسے کھڑا ہونا پڑا۔ اس کے قدموں نے اس کا سہارا اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ سن ہوتے دماغ کے ساتھ وہ بمشکل کھڑی رہی اور جب اس کی باری آئی تو بڑی سی دیگچی کا ڈھکن یہ کہہ کر بند کر دیا گیا۔ "اب ختم ہو چکا ہے کھانا نکلو۔" اسے بے اختیار بے حد رونا آیا تھا اس نے ایک نظر اپنے ہاتھوں میں پکڑی پلیٹ کو دیکھا اور روتے ہوئے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ آنسو تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا اسے یاد آیا کہ وہ بچپن سے بے حد بھوک کی کچی رہی تھی۔ اس وقت اسے نہ جانے کیا کچھ یاد آ گیا تھا کہ ایک آواز پر چونک کر سر اٹھایا۔ "لو میرے ساتھ کھانا کھا لو۔"

اس نے ایک نظر اپنے سامنے رکھی اس تھوڑی سی دال اور ایک روٹی کو دیکھا پھر اس دینے والی کو اس کے بال اس کے چہرے کے دونوں اطراف بکھرے ہوئے تھے۔ پیلے دانت اور سرخ چھوٹی چھوٹی آنکھیں اسے بے حد بدصورت بنا رہی تھیں اس کے ساتھ بیٹھتے ہی اسے اپنے اردگرد بدبو پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن وہ ہر بات نظرانداز کر کے جلدی جلدی کھانا کھانے لگی کہ کہیں سامنے والی اپنا ارادہ نہ بدل لے۔

"مسلمان ہو؟" وہ اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی تو وہ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"اریج۔" وہ اپنی انگلیوں کو چاٹتے ہوئے بولی پھر سامنے بیٹھی عورت سے پوچھنے لگی۔

"اور تم مسلمان ہو؟" اس کی بات پر وہ مسکرا کر بولی۔

"اگر صرف کلمہ پڑھ لینے والے کو مسلمان کہتے ہیں تو میں ہوں۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس کا پیٹ اب بھر چکا تھا اسی لیے سکون سے بولی۔

"سمعاویہ۔"

"چلو اٹھو! یہاں سے یہاں پر باتیں کرنے نہیں آئی ہو تم لوگ۔" اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی سوال جواب کرتی وہی جیلر عورت دوبارہ آ گئی تو وہ دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆......☆

"مے آئی کم ان میم؟" انہوں نے بے اختیار نظر اٹھا کر دیکھا پھر مسکرا کر ہمیشہ کی طرح محبت سے بولیں۔

"ارے اریج بیٹا! آؤ میں نے ہی تمہیں بلوایا تھا آؤ بیٹھو۔"

"جی تھینک یو میم!"

"وہ اصل میں میری دوست ہے مسکان اسے ٹیوٹر چاہیے تھی۔ اچھا معاوضہ دے گی۔ دو بچے ہیں اس کے بہت ذہین ہیں اسی لیے میں نے تمہارا نام لے دیا ہے اور ہاں اس کا شوہر یہاں نہیں ہوتا دبئی میں کام کرتا ہے۔ یہ ایڈریس لو، کل چلی جانا۔"

"تھینک یو میم! تھینک یو سو مچ، آپ جانتی ہیں اگر آج میں سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہی ہوں تو صرف آپ کی وجہ سے۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب امی مجھے میٹرک کروا کر یہاں سے نکلوا رہی تھیں۔ تب آپ نے پروفیسر صاحب سے بات کر کے میری فیس معاف کروائی تھی اس دن اگر آپ ایسا نہ کرتیں تو میرا پڑھنے کا خواب شاید کبھی پورا نہ ہوتا اور پھر صرف آپ کی وجہ سے میں پورے اعتماد کے ساتھ گھروں میں ٹیوشن دینے جاتی ہوں اگر آپ نہ ہوتیں تو شاید ہم بھوکے مر جاتے۔" وہ احترام سے بولی تو میم سمیرا نرمی سے اسے ٹوک کر بولی۔

"نہیں بیٹا! تھینک یو کہنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے اور رزاق تو وہ ہے ہمارا رب وہی ہمیں رزق دیتا ہے۔ بس وسیلہ کسی اور کو بنا دیتا ہے۔ میں نے تمہیں ہمیشہ اپنی بیٹی مانا ہے اسی لیے تم مجھے عزیز ہو۔"

"اچھا میم! میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی اور مسکرا کر باہر نکل آئی۔

☆......☆

وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی تو ہمیشہ کی طرح ابا نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔

"آ گیا میرا بیٹا!"

"جی بابا! آپ نے کھانا کھا لیا۔"

"ہاں! تم جانتی ہو مجھے اپنے آپ سے بھی شرمندگی ہوتی ہے کہ ایک بیٹی کی کمائی میں کھا رہا ہوں اور جب ببلو کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں، میں چھولوں کی پرات دیکھتا ہوں تو قسم سے مر جانے کا دل کرتا ہے۔ مجھے معاف کر دو بیٹی کہ میں تمہیں وہ سب کچھ نہ دے سکا جس کی تمہیں ضرورت تھی جو تمہارا حق تھا۔" وہ اس کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر دکھ سے بولے تو وہ نرمی سے مسکرا کر بولی۔ "کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ بابا! قسم سے مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے اور جہاں تک میرے کمانے کا سوال ہے تو بابا کام تو ہم سب کرتے ہیں۔ صبح کو ببلو اسکول جاتا ہے۔ شام کو چھولے لے کر گلی میں بیچتا ہے۔ امی کپڑے سلائی کرتی ہیں۔ میں ٹیوشن دیتی ہوں۔ ابرش اور ابرج پڑھنے کے ساتھ ساتھ امی کی مدد بھی کرتی ہیں اور آپ ابو آپ بھی تو کام کرتے ہیں۔ ویسے بھی بابا جس طرح میں چھوٹی سی تھی اور آپ نے مجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا اس قابل بنایا کہ کچھ کر سکوں تو اس میں سے اگر میں اپنا تھوڑا فرض پورا کر دیتی ہوں تو اس میں تو کوئی بڑی بات نہیں ہے نا بابا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ملک پرویز اور عائشہ نے فخر سے اپنی بیٹی کو دیکھا تھا۔

☆......☆

رات کی تاریکی نے جیسے ہی امریکہ کی سینٹر جیل کو اپنی لپیٹ میں لیا تو اسے اس پراسرار ماحول سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اسی جیل میں سمعاویہ بڑے آرام سے بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کے منہ سے جب جب دھواں نکلتا تو اسے ایکدم سمعاویہ سے وحشت ہونے لگتی۔ تبھی اس نے چونک کر دوسری لڑکی کو دیکھا تھا جو اس کی جیل میں تقریباً اندھیرے میں بیٹھی تھی۔ سر پر اس کے ہمیشہ دوپٹہ رہتا تھا اس کے لب ہمیشہ ورد کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ بیٹھے بیٹھے زور زور سے رونے لگتی۔ اکثر سجدے کی حالت میں پڑی سسکتی رہتی۔ اس کے رونے سے ارتجل کو ایسے محسوس ہوتا کہ جیسے جیل کی سخت چٹان سی دیواریں بھی اس کے ساتھ چیخ چیخ کر رو رہی ہوں۔ لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب اس نے اس لڑکی کو اپنے بال بکھیرتے دیکھا اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے بال اپنے چہرے کے اردگرد ڈال لیے اور اپنے کپڑوں پر مٹی لگانے لگی۔ ایسے کرتے ہوئے وحشت سے اس کا چہرہ ایکدم بھیانک ہو گیا تھا۔ اسے سمعاویہ کی طرف دیکھا جو بالکل پرسکون بیٹھی تھی وہ ہکلا کر بولی۔

"یہ کیا کر رہی ہے سمعاویہ؟"

"یہ اپنی عزت بچانے کی کوشش کر رہی ہے تم اگر چاہو تو تم بھی کر سکتی ہو۔" وہ اسی سکون سے بولی تو وہ ایک پل کے لیے کچھ نا سمجھی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی کہ شاید وہ مذاق کر رہی ہو، لیکن اس کے چہرے پر موجود سنجیدگی اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ بالکل سیریس ہے۔ اس لڑکی کی دیکھا دیکھی اس نے بھی اپنی بالکل وہی حالت بنا لی اور اگلے دس منٹ میں اس پر ایسی حقیقت کھلی جو اسے ششدر کر گئی۔ جیلر عورت کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا وہ شاید DSP تھا وہ ہر جیل کے باہر رکتا اپنی سرخ ہوس بھری آنکھوں سے گھورتا اور چل پڑتا۔ شدید خوف سے اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ چلتے چلتے وہ اس کی جیل کے پاس آ کر رک گیا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اس کے سامنے والی جیل کے اندر داخل ہوا جہاں تین عورتیں تھیں اور پھر اگلا منظر دیکھ کر اس نے شدت سے مر جانے کی دعا کی تھی جس عورت کو اس نے پکڑا تھا اس کی چیخوں سے پوری جیل لرزہ اٹھی تھی۔

☆......☆

"اری او عائشہ بیگم! مبارک ہو خوش خبری ہے تمہارے لیے۔"

"کیا ہوا ببلو کے ابو؟" وہ ہڑبڑا کر اٹھیں تو کچن میں کام کرتی اریج، ابرش، دونوں صحن میں چلی آئیں کیوں کہ آج اتوار تھا۔ اسی لیے وہ گھر پر تھی۔ اس نے ابا کو اتنا خوش پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اسی لیے ان کی حیرت جائز تھی۔ جب کہ ابا سب کے حیران چہروں کو دیکھ کر بولے۔

"ارے پریشان کیوں ہو رہے ہو تم سب، عائشہ بیگم! آپ کی بہن شمع کا فون آیا تھا اکرم کی دکان پر سلام کہہ رہی تھی اور آج کل میں وہ پاکستان آ رہی ہے۔" ان کی بات پر عائشہ بیگم کے خوشی کے مارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ صرف ایک ہی تو ان کی بہن تھی جو کہ امریکہ میں رہتی تھی نہ باپ تھا نہ ماں اور نہ ہی بھائی اسی لیے ان کی خوشی فطری تھی۔

"ارے شمع میری بہن آ رہی ہے اتنے سالوں کے بعد او خدا بڑا شکر ہے۔" وہ خوشی سے کہہ رہی تھیں جب کہ اریج پریشان سی کچن میں چلی آئی۔

"آپی! کتنی اچھی خبر ہے ہماری خالہ آ رہی ہیں کتنا مزا آئے گا نا آپی۔" ابرش خوشی سے بولی تو اریج بمشکل مسکرا کر رہ گئی۔ اس کی پریشانی بھی صحیح تھی۔ اتنی مہنگائی میں گھر کا خرچ مشکل سے چل رہا تھا، اوپر سے خالہ۔ یہ نہیں تھا کہ اسے ان کا آنا برا لگا تھا اصل وجہ یہ تھی کہ وہ امریکہ کی رہنے والی ان کے ساتھ دال روٹی تھوڑی کھائے گی لیکن یہ سوچ کر اسے اطمینان ہوا کہ جہاں میم سمیرا نے اسے جانے کا کہا تھا وہ وہاں سے فیس ایڈوانس لے لے گی پھر شاید گزارا ہو ہی جائے۔ وہ اپنے

کمرے میں گئی میم سمیرا کا دیا ہوا کارڈ اٹھایا اور چادر پہنتی باہر اماں کے پاس آ کر انہیں بتانے لگی۔

"اماں! میں ایک گھر میں جا رہی ہوں انہیں بچوں کے لیے ٹیوٹر چاہیے تھا۔ آپ دعا کرنا۔"

"یہ بھی بھلا کہنے کی بات ہے تم آرام سے جاؤ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" رکشے والے کو ایڈریس بتا کر وہ اس میں سوار ہو گئی۔ اس نے کبھی شمع خالہ کو نہیں دیکھا تھا نہ ہی کبھی ان سے بات ہوئی تھی اس کی لیکن اماں اکثر اسے بتاتیں تھیں کہ خالہ اور اماں صرف دو ہی بہنیں تھیں۔ کوئی بھائی نہیں تھا پھر شمع نے اپنے کالج فیلو سے بھاگ کر شادی کر لی تھی جو کہ بہت امیر تھا اور ان کے ساتھ ایسی امریکہ گئیں کہ کبھی واپس پلٹ کر نہ آئیں۔ ہاں کبھی کبھار وہ ابو کے دوست اکرم کی دکان پر ابو سے بات کر لیتی تھیں اور امی کو سلام دعا بھیج دیتیں۔ اس نے بچپن سے کوئی رشتہ نہیں دیکھا تھا سوائے اپنی فیملی کے ابو بتاتے تھے کہ ابو لوگ چار بھائی تھے وہ سب سے بڑے تھے لیکن جب ان لوگوں پر غربی نے اپنے پر پھیلا لیے اس وقت تینوں بھائیوں نے ان سے منہ پھیر لیا تھا لیکن اس کے باوجود ابو کو ان لوگوں سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن وہ اکثر سوچتی تھی کہ رشتے تو احساس سے ہوتے ہیں اگر احساس نہ ہو تو مضبوط سے مضبوط رشتہ بھی ایک کچے دھاگے کی طرح ہوتا ہے جو ایک جھٹکے سے ٹوٹ جاتا ہے تو پھر یہ کیسا رشتہ تھا جس میں صرف نام تھا نہ احساس نہ ہی خوشی مان اور یقین ہوتا ہے۔

"باجی گھر آ گیا ہے۔" وہ اپنے خیالوں میں گھری تھی۔ جب رکشے والا دوسری بار کوفت سے بولا تو وہ شرمندہ ہوتے ہوئے جلدی سے رکشے سے اتری اور اپنے پرس میں سے اس نے پیسے نکالنے کے لیے ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ اسے جھٹکا لگا۔

اس کا پرس بالکل خالی تھا اسے یاد آیا کہ جلدی میں وہ بغیر پرس چیک کیے ہی گھر سے چلی آئی تھی اور اب شرمندگی سے اس کا برا حال تھا جب کہ رکشے والا کوفت سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے بے اختیار دوسری بار پرس کو دیکھا کہ شاید پیسے ہوں اور اسے دکھائی نہ دیے ہوں لیکن خالی پرس اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

"باجی! جلدی کریں مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ کوفت بھرے لہجے میں بولا تھا جب کہ مارے بے بسی کے اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ تبھی اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو رکشے والا مڑ کر جا رہا تھا۔ اس نے حیرت سے اپنے اردگرد دیکھا تو سامنے ایک لڑکا اپنی آنکھوں میں شرارت لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہا تھا اور اریج کو یقین تھا کہ رکشے والے کو پیسے اسی نے ہی دیے تھے ورنہ وہ اس طرح چپ چاپ نہ چلا جاتا مارے شرمندگی کے وہ ہکلا کر بولی۔

"وہ اصل میں جلدی میں مجھے دھیان نہیں رہا کہ......"

"نو اٹس اوکے، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے بولا پھر جانے کے لیے مڑا تو اچانک رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شرارت سے بولا۔

"ویسے آئندہ خیال رکھیے گا۔ ہر بار میرے جیسا ہیرو مدد کے لیے نہیں آتا۔" اس کی بات پر اس نے بے اختیار اپنی نظر جھکا لیں پھر تھینک یو کہنے کے لیے جیسے ہی سر اٹھایا وہ لڑکا بقول اس کے ہیرو منظر سے غائب تھا۔

وہ کچھ دیر شرمندگی سے کھڑی رہی پھر کارڈ پر ایک نظر ڈال کر سامنے بنے خوب صورت بنگلوں پر نظر ڈالی اور ایک بنگلے کی بیل بجا دی جس کے گیٹ کے باہر لگی تختی پر "خوشیوں ولا" لکھا ہوا تھا۔ تبھی

ایک لڑکی نے گیٹ کھولا جو کہ پچیس سال کی ہو گی لیکن اپنی خوب صورتی کی وجہ سے بیس سال کی لگتی تھی اریج اعتماد سے بولی۔

"السلام علیکم! میرا نام اریج ہے مجھے میم سمیرا نے ٹیوٹر کے لیے بھیجا ہے۔"

"او مائی گاڈ! تم ہو اریج، یار قسم سے میں سوچ رہی تھی کہ کوئی موٹی سی خاتون ہو گی اپنی آنکھوں پر بڑی سی عینک لگائے میرے بچوں کو گھور گھور کر ہی بیمار کر دے گی۔" وہ باتونی سی لڑکی کی باتوں پر بے اختیار ہی کھلکھلا کر ہنس دی تو وہ مزید بولی۔

"بائی دا وے، میرا نام مسکان ہے۔"

"آئی تھنک باقی کی باتیں آپ لوگ اندر آ کر کر سکتی ہیں بھابھی۔" اندر سے کسی لڑکی کی آواز آئی تو مسکان شرمندہ ہوتے ہوئے اسے اندر لے گئی۔ سرخ اینٹوں سے بنا وہ عالیشان گھر اپنے مکینوں کے ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھا وہ اس کے ساتھ اندر چلی آئی۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ واپس گھر چلی آئی۔

☆......☆

وہ سمعاویہ سے لپٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی جب کہ سمعاویہ نرمی سے اس کے بالوں کو سہلا رہی تھی۔ ارتجل کو ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مرتی جا رہی ہو اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ تبھی وہ چونک کر سمعاویہ سے الگ ہوئی اور حیرت سے بولی۔

"تم نے اپنے کپڑے پر مٹی کیوں نہیں لگائی تم سکون سے کیوں بیٹھی ہو۔" اس کی بات پر وہ تمسخر اڑا کر بولی تو اسے خود اپنی آواز کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"عزت ہمیشہ وہ لوگ بچانے کی کوشش کرتے ہیں جن کی کوئی عزت ہوتی ہے اور ایک طوائف اپنی عزت کبھی بچانے کی کوشش نہیں کرتی۔" اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سمعاویہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر کرب پھیلتا جا رہا تھا۔

"تم نے صحیح سنا ہے ارتجل! میں ایک طوائف ہی ہوں لیکن میں نے اپنے آپ کو خود ہی ایسا بنایا ہے۔ ایک وقت تھا جب میرے بھی ماں باپ تھے، خوشیاں میرے گھر میں بھی رقص کرتی تھیں۔ میں اپنے بہن بھائیوں کی جان تھی ہر فیصلہ ویسے ہی ہوتا تھا جیسا میں چاہتی ہم امیر نہیں تھے مگر پھر بھی ابو میری ہر بات ہر خواہش کو پورا کرتے تھے لیکن میرا لالچ کبھی ختم نہیں ہوا۔ زیادہ اور زیادہ کی چاہ مجھے بے گھر کر گئی۔ میری امیر لڑکیوں سے دوستی تھی اور ان ہی کی وجہ سے لڑکوں سے بھی میری دوستیاں بڑھتی چلی گئیں اور ان لڑکوں میں سے اقرام نامی لڑکے کو مجھ سے محبت ہو گئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ میرا ہر خواب پورا کرے گا۔ میری زبان پر کبھی حرف شکایت نہیں آنے دے گا اور میں اس کی باتوں میں آ گئی۔ مجھے تو کبھی کسی لڑکے سے محبت ہوئی ہی نہیں۔ میں تو صرف بہت ساری دولت پانا چاہتی تھی۔ اسی دولت کی چاہ نے مجھے رات کی تاریکی میں دہلیز پار کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں یہ بات بھول گئی تھی کہ جس لڑکی کا ایک قدم رات کی تاریکی میں گھر سے باہر نکلتا ہے اس کا اگلا قدم کوٹھے کی دہلیز پر ہی پڑتا ہے۔ اقرام نے بھی مجھے کوٹھے پر لے جا کر بیچ دیا۔ میں روئی گڑگڑائی لیکن میں اپنی عزت نہیں بچا سکی اور پھر پورے دو سال کے بعد کوٹھے پر پولیس کی ریڈ پڑی اور میں یہاں پر آ گئی۔ مجھے تین سال کی سزا سنائی گئی اور یہ میرا تیسرا سال ہے کچھ مہینوں بعد میں یہاں سے رہا ہو جاؤں گی مگر یہ بات صرف میں جانتی ہوں کہ میں رہا ہو کر بھی نہیں ہو پاؤں گی۔ کسی نے سچ ہی تو کہا ہے کہ جس عورت کو صبر کرنا نہیں آتا وہ اپنے سر پہ ہاتھ رکھ کر روتی ہے۔"

اس کی آنکھ سے کئی آنسو نکلے اور رخسار پر بہتے

چلے گئے۔ اس نے دکھ سے سامنے بیٹھی سمعاویہ کو دیکھا تھا اسے اس کا دکھ اپنے دل پر محسوس ہو رہا تھا وہ بات بدل کر بولی۔

"یہ جو لڑکی ہے یہ یہاں کیسے؟"

"کس کس کی داستان سنو گی تم یہاں پر ہر طرف داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ یہ لڑکی کون ہے کہاں سے آئی ہے۔ مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ اس کا نام مارگریٹ ہے اور کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں میرا نام مارگریٹ نہیں ہے بلکہ ماریہ ہے۔" وہ اچانک بولی تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا جس کی بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔ وہ خود ہی بولنے لگی جب کہ وہ دونوں ساکت سی اسے سن رہی تھیں۔

"میری ماں مسلمان تھی وہ یہاں امریکہ پڑھنے کے لیے آئی تھی۔ پھر اسے مارٹن میرے بابا سے محبت ہو گئی دونوں نے شادی کرلی۔ میرا باپ عیسائی تھا وہ کچھ عرصہ ساتھ رہے اور میرے پیدا ہونے پر میری ماں مجھے مارٹن کے حوالے کر کے طلاق لے کر پاکستان واپس چلی گئی کیوں کہ میرا باپ عیسائی تھا میری ماں کو اس کے مذہب سے نفرت تھی اور میرے باپ کو میری ماں کے دونوں ہر روز لڑائی کرتے تھے ایک دوسرے کے ساتھ گالی گلوچ کرتے۔ باپ اسے مار نہیں سکتا تھا کہ میری ماں اسے جیل بھیج دیتی اسی بات سے وہ ڈرتا تھا۔ میری ماں کے چلے جانے کے بعد میرا باپ آزاد ہو گیا وہ ہر روز عورتوں کو گھر لے آتا اور میرے سامنے ہی ان کی کمر میں بانہیں ڈالے اپنے کمرے میں گم ہو جاتا۔ اس وقت میری عمر صرف آٹھ سال تھی مجھے نہیں پتہ تھا کہ میرا مذہب کیا ہے۔ میں کون ہوں؟ بابا نے میری دیکھ بھال کے لیے ایک آیا رکھ دی جو مسلمان تھی۔ وہ میری ہر ضرورت کو پورا کرتی تھی۔ وقت پر کھانا دینا، نہلانا، کپڑے بدلنا وہ سب کام کرتی لیکن ایک مشین کی طرح، مجھے کبھی ممتا بھری گود نصیب نہیں ہوئی۔ کبھی باپ کا پیار نہیں ملا مجھے، کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ پیار کیا ہوتا ہے میرا باپ صرف نام کا باپ تھا۔ اسے میرے وجود کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شاید میں بھی ان بناوٹی لوگوں کی دنیا میں گم ہو جاتی اور میرا آج بہت مختلف ہوتا میں بھی احساسات سے عاری ایک روبوٹ ہوتی۔ میری آیا جسے میں آنٹی کہہ کر بلاتی تھی اسے جب میں نماز پڑھتے دیکھتی تو اکثر حیرت سے سوال کرتی۔ آنٹی آپ سجدہ کسے کرتی ہو اور نماز کیوں پڑھتی ہو؟ ان کا جواب آج بھی مجھے یاد ہے۔ انہوں نے کہا تھا میں سجدہ اُسے کرتی ہوں جس نے تمہیں مجھے اور ہم سب کو پیدا کیا ہے اور نماز اس لیے پڑھتی ہوں کہ نماز بے حیائی سے روکتی ہے۔ تب مجھے دین اسلام سمجھ میں آیا۔ ہاں ایک بار میں نے آنٹی سے سوال کیا تھا کہ آنٹی اسلام میں عورت کو پردے کا حکم کیوں دیا گیا کیوں اسے چادر اور چار دیواری میں قید رہنے کا حکم ملا؟ تب انہوں نے مسکرا کر کہا تھا بڑی آسان سی بات ہے مارگریٹ جس طرح قرآن پاک عظیم ہے اور اس پر ہمیشہ غلاف چڑھا رہتا ہے اللہ نے اسے چھپا کر رکھنے کا حکم دیا ہے اور خانہ کعبہ یعنی اللہ کا گھر عظیم ہے لیکن اس پر ہمیشہ پردہ پڑا رہتا ہے تو اسلام نے مسلمان عورت کو اتنا عظیم مقام عطا کیا ہے کہ اسے ہمیشہ چھپا کر رہنے کا حکم دیا ہے۔ اگر تمہاری نظر میں چادر اور چار دیواری ایک قید ہے تو تم مجھے بتاؤ کہ کیا آزادی اس چیز کا نام ہے کہ عورتوں کو سرے عام برہنہ حالت میں رہنا چاہیے۔ کیا آزادی اسے کہتے ہیں کہ لڑکیاں ساری ساری رات نامحرم مرد سے فون پر باتیں کرتی رہیں۔ ارے اسلام میں تو عورت کو اپنے دیور سے بھی پردہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے دیور

کو موت قرار دیا ہے تمہیں پتہ ہے ایک بار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حضرت عائشہؓ بیٹھی تھیں کہ ایک صحابی آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے جو کہ نابینا تھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے ان سے پردہ نہیں کیا تو آپؐ نے پوچھا کہ انہوں نے صحابی سے پردہ کیوں نہیں کیا۔ تب انہوں نے کہا کہ محمدؐ یہ تو نابینا ہیں تب آپؐ نے فرمایا کہ تم تو نابینا نہیں ہو یعنی ایک اندھے سے بھی پردہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک بات پردہ صرف اس چیز کا نام نہیں ہے کہ بڑا سا برقع پہن لیں بلکہ پردہ تو اس بات کا نام ہے کہ آپ کی آنکھوں میں حیا ہو کیوں کہ ہر گناہ کی ابتداء آنکھوں سے ہی ہوتی ہے۔ تب مجھے دین اسلام کی سمجھ آئی تب میں نے اسلام قبول کیا میرے اسلام قبول کرنے پر مارٹن کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں نے مکمل پردہ کرنا شروع کیا تب مجھے اندازہ ہوا کہ میں کس قدر گمراہی میں جی رہی تھی۔

☆......☆......☆

اس نے امی کے کمرے میں جا کر انہیں سلام کیا اور محبت سے بولی۔

"میں آج مسکان آپی کے گھر ٹیوشن کے لیے جا رہی ہوں پلیز دعا کیجیے گا میرے لیے۔"

"میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ مجھے دعا کے لیے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری ہر دعا تمہارے ساتھ ہے۔ اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ مسکان کیسی عورت ہے؟"

"ارے امی! مسکان آپی کو دیکھو تو یقین نہ آئے کہ دو بچوں کی ماں ہے۔ بالکل لڑکی ہے۔ اتنے بڑے سے گھر میں وہ اس کے دو بچے اور ایک دیور رہتا ہے خیر اس کے دیور سے تو میں نہیں ملی اس کے بچے بڑے ذہین ہیں۔ میں چلتی ہوں دیر ہو رہی ہے اور پہلے دن کا میں امپریشن بالکل خراب نہیں کرنا چاہتی، ٹھیک ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی تو عائشہ بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے ڈھیروں دعاؤں سے نوازا تو وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی۔

خالہ کا کچھ پتا نہیں تھا وہ مہینے میں آتیں یا پھر دس بیس دنوں میں اور اوپر سے امی بڑی خوش تھیں بکسوں سے رضائیاں نکلوا کے انہیں دھوپ لگوائی۔ چار پائیوں پر نئی چادریں ڈالیں، پردے دھو کر دوبارہ لگوائے سارے گھر کی صفائی کروائی اریج جب جب انہیں صفائی کرتے دیکھتی تو اکثر دل میں سوچتی۔

ہم انسانوں کے گھر جب کوئی بادشاہ یا پھر کوئی امیر مہمان آرہا ہوتا ہے تو ہم سارے گھر کی صفائی کرتے ہیں۔ جالے اتارتے ہیں۔ پینٹ کرواتے ہیں کہ آنے والا مہمان یا پھر بادشاہ آکر خوش لیکن ہمارا دل جس میں نفرت کے جالے اور حسد کی بدبو پھیلی ہوئی ہے گناہوں کے سیاہ نشان لگے ہوئے ہیں تو ہم توبہ کے آنسو سے اسے دھو کر کیوں صاف نہیں کرتے۔ جب ہمیں پتہ ہے کہ کوئی امیر یا پھر بادشاہ گندے گھر میں نہیں آتا تو پھر بادشاہوں کا بادشاہ ہمارا رب ہمارے گناہوں سے بھرے دل میں کیسے آئے گا؟" وہ چونکی اس وقت جب رکشے والے نے اسے کہا۔ "میڈم گھر آگیا ہے۔" وہ خفت سے مسکراتے ہوئے اسے کرایہ دینے لگی اور خوشیوں والا کی بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ واچ مین نے گیٹ کھولا تو وہ سیدھی چلتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہو گئی لیکن اگلے ہی پل حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ جب اس نے مسکان کے ساتھ اسی ہیرو کو بیٹھے دیکھا۔

"ارے اریج! تم کھڑی کیوں ہو آؤ بیٹھو۔" جبھی مسکان کی نظر اس پر پڑی تو وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا کر بولی پھر چونک کر بولی۔

''اریج! یہ میرا دیور ہے کیف اور کیف یہ ابراہیم اور اریبہ کی ٹیوٹر ہے۔''

''السلام علیکم کیسی ہیں آپ؟'' وہ شرمندہ سی کھڑی تھی جب کیف آنکھوں میں شرارت بھر کر بظاہر سنجیدگی سے بولا تو وہ بمشکل سلام کا جواب دے کر ایک طرف بڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ جب کہ مسکان اس کے گریز کو محسوس کر کے کیف سے بولی۔

''چلو اٹھو کیف آؤ ہم کچن میں آج شامی بناتے ہیں۔'' اس کی بات پر وہ اٹھتے ہوئے شرارت سے بولا۔

''پلیز بھابھی! اپنے ہاتھوں سے بنے شامی کباب آپ اریج کو مت کھلانا ورنہ یہ کبھی اس گھر کا رخ نہیں کرے گی (اور میں نہیں چاہتا کہ یہ یہاں پر آنا بند کرے)۔'' آخری بات وہ صرف سوچ کر رہ گیا جب کہ وہ نظریں چرا کر رہ گئی تو بھابھی اس کا کان پکڑ کر مروڑتے ہوئے بولی۔

''خبردار! جو میرے بنائے کھانے میں کوئی نقص نکالا تو چلو اب کچن میں اور اریج کو آرام سے بچوں کو پڑھانے دو۔''

''تو میں نے کون سا انہیں روکا ہوا ہے کیوں اریج کیا میں نے آپ کو پڑھانے سے منع کیا ہے۔'' وہ آنکھوں میں شرارت لیے اس سے بولا تو اس نے بوکھلا کر مسکان آپی کو دیکھا جب کہ کیف کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ وہ جب بھی اریج کو دیکھتا تو اسے محسوس ہوتا کہ جیسے اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی ہو۔ پھر اسے اپنا وہم سمجھ کر سر جھٹک گئی اور پھر اس دن کیف نے اپنے جذبوں کا اظہار کر دیا حسب معمول وہ بچوں کو پڑھا رہی تھی کہ اریبہ معصومیت سے بولی۔

''آنٹی! آپ تو بالکل پریوں کی طرح ہیں رات کو چچا کہہ رہے تھے کہ آپ ہمیشہ کے لیے ہمارے ساتھ رہیں گی سچ میں۔'' اس نے گڑبڑا کر کیف کو دیکھا جو جذبوں سے بھری آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا پھر کیف بولا۔

''ارے یہ کیا بتائیں گی، ہم ان کے امی اور ابو سے مانگیں گے انہیں کیوں؟'' اس کی بات پر اریج کا دل رک کر دھڑکا تھا۔ پھر سر جھٹک کر رہ گئی اور اپنے دل کو ڈانٹ کر بولی۔

''یہ امیر لوگوں کی دل لگی ہے نادان سنبھل جا یہ امیر لوگ کبھی کسی سے محبت نہیں کرتے۔''

☆......☆

''کل کی فلائٹ ہے تمہاری خالہ کی۔'' وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی اماں نے خوشی سے بتایا وہ مسکرا کر رہ گئی۔

''میں نے تمہارا اور ابرش کا کمرہ صاف کروا کر تمہاری خالہ کے لیے سیٹ کر دیا ہے۔''

''جی امی! میرے سر میں بہت درد ہے میں کچھ دیر آرام کرنا چاہوں گی۔'' وہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی آئی اور سر تک چادر لے کر سوتی بن گئی۔ حالانکہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بار بار اسے کیف کی وہ محبت بھری آنکھیں یاد آ رہی تھیں۔ کچھ خیال بھی کبھی اس قدر اذیت ناک ہوتے ہیں جنہیں سوچتے ہوئے آپ کو اپنی روح نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

خالہ کی آمد ایسی تھی جیسے سخت گرمیوں میں بارش کی پہلی بوند خاص کر اماں ان سے مل کر بہت خوش ہوئیں وہ جب سے آئیں تھیں عائشہ بیگم ان سے اپنے بچپن کی باتیں ہی کرتی جا رہی تھیں جب کہ وہ بہنیں اماں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہو رہی تھیں۔ خالہ صرف دو دن رہیں اور تیسرے دن انہوں نے جیسے دھماکہ ہی کر دیا۔

''عائشہ بیگم اور پرویز بھائی میں نے آپ لوگوں سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ آج اپنا دامن میں

آپ لوگوں کے سامنے پھیلا رہی ہوں۔ مجھے آپ کی بیٹی اریج کا رشتہ میرے بڑے بیٹے سمیر کے لیے دے دیں۔" ان کی بات پر وہ دونوں ہکا بکا رہ گئے تھے وہ مزید بولیں۔

"میرا پاکستان آنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ میں سمیر کی شادی کرنا چاہتی تھی آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میرے صرف دو بیٹے ہیں سمیر اور نصر۔"

"لیکن یہ سب اتنی جلدی۔" عائشہ بیگم ہڑبڑا کر بولیں تو شمع مسکرا کر بولیں۔

"ارے سوچنے کے لیے تو غیروں سے ٹائم مانگا جاتا ہے اپنوں سے تھوڑی لیکن ہاں اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہ ہو کہ میں اریج کو خوش نہیں رکھوں گی تو تمہاری مرضی۔" وہ آخر میں اداسی سے بولیں تو عائشہ بیگم تڑپ کر بولیں۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو شمع! ہم تمہیں کیوں انکار کریں گے اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ ہم شادی کر سکیں۔"

"ارے تو میں کون سا تم لوگوں سے جہیز لوں گی کل فون پر نکاح کر لیتے ہیں اور پرسوں اریج میرے ساتھ چلی جائے گی۔ میں نے اس کے کاغذات پہلے ہی تیار کروا لیے تھے۔

"کیا مطلب! سمیر نہیں آئے گا؟"

"ارے بھائی صاحب! وہ آنا تو چاہتا تھا لیکن اس کے ابھی کاغذات نہیں بن رہے، اچھا اب آپ لوگ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو یہ رشتہ قبول ہے؟"

"کیوں نہیں آج سے اریج آپ کی ہوئی میں اس سے ایک بار بس پوچھ لوں۔" عائشہ بیگم خوشی سے کھنکتے لہجے میں بولیں تو وہ سب مسکرا دیے۔

ایک پل کے لیے وہ دنگ رہ گئی پھر تڑپ کر بولی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ امی! اگر میں نے شادی کر لی تو یہ گھر کیسے چلے گا۔ ببلو کی تعلیم کیسے مکمل ہو گی؟"

"یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے بیٹا! تم وہاں امریکہ میں رہ کر نوکری کر لینا اور پیسے تم یہاں بھیجتی رہنا مجھے اور سمیر کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا یا پھر کوئی اور وجہ ہے۔" شمع خالہ آخر میں کچھ کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولیں تو اس نے بے اختیار نظریں جھکا لیں اور نم آواز میں بولی۔

"مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔" اس کے صرف ایک جملے نے پورے گھر کو خوشیوں کی نوید دی تھی۔

اگلے دن اس کا نکاح تھا۔ وہ صبح صبح مسکان آپی کے گھر چلی آئی کہ انہیں اپنے نکاح کا بتا سکے اور یہ شاید اتفاق ہی تھا کہ مسکان آپی اور کیف اسے لان میں ہی نظر آ گئے وہ کیف سے نظر چرا کر مسکان سے ملی اور سر جھکا کر بولی۔

"وہ کل میرا نکاح ہے میں آپ کو بلانے آئی تھی۔ میری خالہ امریکہ سے آئی ہوئی ہیں تو ان کے بڑے بیٹے سے نکاح ہے آپ ضرور آئیے گا۔ میں چلتی ہوں اور ہاں میں کل سے نہیں آؤں گی آپ مجھے بہت یاد آئیں گی۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی تو اچانک اس کی نظر کیف پر پڑی جو دھواں دھواں چہرے سے اسے دیکھ رہا تھا وہ اس سے نظریں چراتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھی۔

تمہیں معلوم ہے جاناں!
کہ تم بھی ایک قاتل ہو
مرے اندر کے ہنستے ہوئے انسان
کو تم نے آج مار ڈالا ہے

"میں تمہیں بے وفا نہیں کہوں گا کیوں کہ تم نے مجھ سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا شاید میں نے خود ہی اپنے ساتھ بے وفائی کی ہے جو تم سے میں نے آج تک اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا لیکن میں آج تم سے صرف اتنا کہوں گا کہ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی ہو۔ تم نہیں تو کوئی نہیں۔ میں زندگی کے ہر موڑ پر صرف تمہارا انتظار کروں گا۔ ویسے خلیل جبران کہتے ہیں اگر تم کسی سے محبت کرتے ہو تو اسے کھلا چھوڑ دو وہ تمہارا ہوا تو ضرور لوٹ آئے گا اور مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم میری ہوئیں تو تم ضرور لوٹ کر آؤ گی۔" وہ تیز تیز قدموں سے گیٹ پار کر گئی جانتی تھی کہ اگر ایک پل اور رکی تو ہار جائے گی۔

"ہائے آپی! آپ کتنی لکی ہیں نا جو امریکہ جا رہی ہیں۔" وہ رات کو سونے کے لیے لیٹی تو ابرش حسرت سے بولی۔

"پتا نہیں سمیر بھیا کیسے دکھتے ہوں گے۔ آپ اتنی دور چلی جائیں گی آپی۔" ابرج نم آنکھوں سے بولی تو ابرش اور اس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے وہ ایک دکھ سے بولی۔

"تم لوگ فکر کیوں کرتے ہو میں ملنے آؤں گی نا اور ابرش کچھ لوگ خوش قسمت ہو کر بھی خوش قسمت نہیں ہوتے خیر اب تم دونوں چپ چاپ سو جاؤ رات بہت ہو گئی ہے۔" وہ بات بدل کر بولی تو وہ دونوں ایک طرف ہو گئیں تو وہ اٹھ کر باہر صحن میں چلی آئی۔ ستون سے ٹیک لگا کر آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھنے لگی۔

کچھ دیر وہ کھڑی خالی خالی نظروں سے چاند کو دیکھتی رہی پھر پلٹی اور اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گئی حالانکہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پتہ نہیں کیوں اسے ایک دم ہی بے حد و حساب رونا آنے لگا اسے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا دل درد سے پھٹ جائے گا۔ احساس زیاں بڑھتا جا رہا تھا۔ روتے روتے اسے کب نیند آ گئی اسے خود پتا نہیں چلا۔

☆......☆

صبح کو وہ حسب معمول اٹھ گئی۔ رات بھر رونے کی وجہ سے اس کے سر میں بے حد درد ہو رہا تھا۔ آنکھیں الگ سرخ ہو رہی تھیں۔ نماز پڑھ کر وہ کچن میں چلی آئی سامنے ابرش اور ابرج کھڑی نم آنکھوں سے ناشتہ بنا رہی تھیں۔

"آپی! آپ کچن میں کیا کر رہی ہیں؟"

"سر میں بہت درد ہے چائے لینے آئی تھی ناشتہ میں بنا دیتی۔" وہ جواب دیتے ہوئے کیتلی اٹھا کر اس میں پانی ڈالنے لگی تبھی ابرش نے اس کے ہاتھوں سے کیتلی لے لی اور خفگی سے بولی۔

"آپی! یہ کیا آج تو آپ کا اس گھر میں آخری دن ہے۔ پلیز آج آرام کریں پتہ نہیں پھر کب آپ کو دیکھنا نصیب ہو۔"

"ایسے کیوں کہہ رہی ہو میں آتی رہوں گی نا، ویسے بھی تم دونوں کو میری شادی کا بڑا شوق تھا نا تاکہ میرے جانے کے بعد تم دونوں کی باری آ سکے۔" اس کی بات پر وہ دونوں شرم سے لال ہو گئیں تو وہ مسکراتی ہوئی کچن سے باہر چلی آئی تبھی اس کی نظر صحن کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھے ببلو پر پڑی تو وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے نرمی سے بولی۔

"کیا ہوا میرے بہادر بھائی کو ایسے کیوں بیٹھا ہے؟"

"آپ نا جاؤ نا۔" اس کی بات پر اس نے بے اختیار اپنے بھائی کو گلے سے لگا لیا اور جیسے خود کو تسلی دی۔

"اداس ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں روز فون بھی کروں گی خط بھی لکھوں گی اور ملنے بھی آتی رہوں گی۔ بس تم نے بہت سارا پڑھنا ہے کبھی ہمت نہیں ہارنی۔"

"جی آپا! میں اتنا سارا پڑھوں گا کہ آپیوں کی شادی کروں گا۔ امی ابو کو حج کرواؤں گا، ہے ناں۔" وہ معصومیت سے بولا تو وہ مسکرا کر رہ گئی۔

پھر بالآخر اس کا نکاح فون پر سمیر سے ہو گیا اس کے نکاح میں محلے کے کچھ عزیز تھے اور دونوں چاچو۔ خالی دل خالی دماغ کے ساتھ اس نے قبول ہے کہا

اور اپنا آپ ان دیکھے انسان کے نام کر دیا۔

☆......☆

اور پھر میں نے اپنا نام مارگریٹ سے ماریہ رکھ لیا۔ میرا یہ نام آنٹی کو بہت پسند تھا۔ مجھے آج بھی وہ رات اچھی طرح یاد ہے۔ میری آنکھ کسی چیخ کی آواز سے کھلی تھی۔ میں نے ایک نظر آنٹی کو دیکھا تھا انہیں کل سے ہلکا سا ٹمپریچر ہو رہا تھا۔ میں نے ہی انہیں نیند کی دوا دے کر سلایا تھا۔ میں انہیں ہی دیکھ رہی تھی کہ کوئی دوبارہ چیخا تھا۔ باہر بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ میں سلیپر پہنتی بڑی سی شال کو اپنے اردگرد لپیٹتی باہر چلی آئی تھی۔ وہ آواز ان کے کمرے سے آرہی تھی۔ میں نے ایک دو بار دروازے پر دستک دی پر وہ نہیں کھلا تو میں کھڑکی سے اندر داخل ہو گئی اور اندر کے منظر نے مجھے پتھر کر دیا۔ مارسن کسی لڑکی سے زبردستی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بالکل نشے میں مدہوش تھے۔ میں نے لڑکی کو ان سے دور کیا تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے صوفے پر جا گرے میں اس انگریز لڑکی کو پورچ میں لے آئی اور واچ مین سے کہہ کر اس لڑکی کو ڈرائیور کے ساتھ اس کے گھر بجھوا دیا۔ میں نے جیسے ہی لاؤنج میں قدم رکھا مارسن نے مجھے جھپٹ لیا اور وہ نام نہاد میرا باپ مجھ سے زبردستی کرنے کی کوشش کرنے لگا، میرا ہی باپ۔ تب میں نے اس کے سر پر گلدان دے مارا تو وہ وہیں پر ٹھنڈا ہو گیا۔ ایک شیطان کا میرے ہی ہاتھوں خاتمہ ہو گیا اور مجھے پولیس یہاں پر لے آئی۔" وہ آخر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی تو اریجل کے ساتھ ساتھ سمعاویہ کی بھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆......☆

سب سے مل کر آخر کار وہ خالہ کے ساتھ امریکہ چلی آئی۔ ایک لمبے سفر کے بعد جیسے ہی اس نے خالہ کے گھر قدم رکھا تو اس کی بے چینی خالی گھر کو دیکھ کر اور بڑھ گئی۔ کچھ دیر سونے کے بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر نوکرانی کے بتانے پر کاٹیج میں چلی آئی، سامنے خالہ کے ساتھ وہ شاید نہیں یقیناً سمیر ہی تھا فرنچ اسٹائل بال گلے میں موٹی سی چین اور ہاتھوں میں بڑے بڑے کڑے پہنے تھا۔ وہ آگے بڑھی اور ایک کرسی دھکیل کر بیٹھ گئی۔ خالہ نے ایک نظر اسے دیکھا تھا پھر کھانے میں مصروف ہو گئی۔ وہ کچھ دیر بیٹھی ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ تب سمیر اٹھتے ہوئے بے تاثر لہجے میں بولا تھا۔

"تم اپنا سامان لے کر باہر آجاؤ۔" وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی خالہ نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ سمیر الگ فلیٹ میں رہتا ہے اور اسے بھی اس کے ساتھ رہنا ہوگا اور پھر وہ سمیر کے فلیٹ میں چلی آئی۔ جہاں ہر طرف نشے کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ گھر بے حد گندا ہو رہا تھا۔ اس نے سب کچھ اپنی قسمت سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ وہ صبح کو پڑھنے جاتی تھی اور شام کو ایک ہوٹل میں ویٹر کی جاب کرتی تھی۔ آخر اس نے گھر بھی چلانے تھے۔ اس کا سمیر سے صرف رات کو ہی سامنا ہوتا تھا رات بھر سمیر باہر رہتا اور دن بھر وہ اور ایک دن وہ ہوٹل جانے کی بجائے گھر چلی آئی۔ فلیٹ کی ڈوپلیکیٹ چابی اس کے پاس پہلے سے موجود تھی۔ وہ گیٹ کھول کر اندر چلی آئی پرس کو ٹیبل پر رکھ کر وہ اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔ اس کا دروازہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔ اندر کے منظر نے اسے ساکت کر دیا۔ سمیر کسی عورت کے ساتھ...... وہ حیران رہ گئی۔ تبھی سمیر کی نظر اس پر پڑی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس نے بے خوف دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ صدمے سے گنگ رہ گئی پھر روتی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھی اور سیدھی خالہ کے گھر چلی آئی۔ جب اس نے خالہ کو سب کچھ بتایا تو انہوں نے

بے پروائی سے کہا۔

"اریج! یہ یہاں کی ایک عام سی بات ہے تمہیں اسے قبول کرنا ہوگا۔ اسی لیے تو میں تمہیں لے کر آئی تھی کہ تم یہ سب کچھ آرام سے برداشت کرو گی۔ آخر کو تم ایک مشرقی بیوی جو ہوئیں۔" اور پھر یہ سمیر کا معمول بن گیا وہ اس کے سامنے اب بے خوفی سے لڑکیوں کو لے کر آنے لگا تھا۔ وہ اندر ہی اندر مرتی جا رہی تھی اور پھر ایک دن اس کی برداشت کی حد ہو گئی۔ اس دن اس نے سمیر کے چہرے پر ایک تھپڑ مارا تھا اور اسے کہا تھا کہ وہ اسے پاکستان بھیجے ورنہ وہ پولیس کو فون کر کے کہہ دے گی کہ اس کا شوہر اسے مارتا ہے اور خلاف توقع سمیر نے خود اس کی پیکنگ کی تھی اور اس کے ویزہ کے ساتھ طلاق بھی دے دی۔ وہ خالہ سے بغیر ملے ایئرپورٹ چلی آئی اور یہ ہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ اس نے اپنا سامان ایک بار بھی چیک نہیں کیا تھا۔ وہ جہاز کی طرف بڑھ رہی تھی کہ پولیس نے اسے یہ کہہ کر پکڑ لیا کہ اس کے سامان سے ڈرگز ملی ہیں۔ اس نے بہت کوشش کی خود کو بے قصور ثابت کرنے کی مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔

"میں خالہ کے پاس گئی۔ ان سے کہا کہ صرف ایک بار وہ پولیس کو سچ بتا دیں لیکن خالہ نے مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔ میں لاکھ روئی گڑگڑائی لیکن ان پر میرے رونے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور مجھے پانچ سال کی سزا ہو گئی۔ تم دونوں نہیں جانتیں کہ یہ پانچ سال میں نے کیسے گزارے ہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اس نے میری عزت کی حفاظت کی۔" اریجل عرف اریج کے چپ ہونے پر سمعاویہ دکھ سے بولی۔

"یہ سب کچھ ہمارے ہی گناہوں کا نتیجہ ہے اریج۔"

"صحیح کہا تم نے، اچھا کل پہلا روزہ ہے تم دونوں رکھو گی؟"

"کیوں نہیں اور تمہیں پتا ہے مجھے 27 روزے کو اس قید سے آزادی ملے گی۔ میں بہت خوش ہوں، ببلو تو اب ایک جوان بن گیا ہوگا اور......" وہ خوشی سے بولی تو سمعاویہ نے کہا۔

"یہ دکھ درد سب کچھ زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں اگر ہم دکھوں کو یاد رکھ کر جینا شروع کر دیں تو شاید ہم جی نہ سکیں۔"

☆......☆

اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے ملک کی ہوا کو اپنے اندر اتارا تھا۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر وہ مڑی اور اپنے اس گھر کو دیکھا جس میں اس نے اپنی زندگی کا وقت گزارا تھا، اس کی کچی دیواروں کی جگہ پینٹ والی بڑی بڑی دیواروں نے لے لی تھی۔ گھر ڈبل اسٹوری ہو چکا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی اور سامنے دس سال کے بدلے 20 سالہ ببلو کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی اور وہ بھی اسے پہچان چکا تھا۔ وہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اماں کو ایک چارپائی پر لیٹے دیکھ کر وہ جی اٹھی ببلو نے جلدی سے فون کر کے ابرش اور ابرج کو بلایا وہ بھی اتنے 8 سال کے بعد دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ تبھی ابرش کی نظر ماریہ پر پڑی جسے ببلو دلچسپ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تو اس نے حیرت سے اسے دیکھا تب اس نے ماریہ اور اپنی کہانی سب کو کہہ سنائی سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اماں ایک بار پھر اسے گلے سے لگا کر رو پڑیں۔

اسے آئے ہوئے آج تیرا دن تھا جب وہ اماں کے کمرے میں چلی آئی وہ سوال کرنے جس پر وہ خود حیران تھی۔

"اماں! آپ نے ایک بار بھی مجھ سے بات

کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"تیرے جانے کے بعد جب تیرے خط آنا بند ہو گئے تب ہم نے تیری خالہ کو فون کیا اور جو کچھ انہوں نے کہا وہ ہمارے لیے موت کی خبر کی طرح تھا۔ اس نے کہا کہ تم بھاگ گئی ہو کسی انگریز کے ساتھ۔ تیرے ابا تو یہ بات سنتے ہی بیمار ہو کر ڈھ گئے گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی تھی۔ جب ببلو کے ساتھ وہ آیا عباس اس نے بتایا کہ ببلو اس کی گاڑی سے ٹکرا کر بے ہوش ہو گیا تھا تو وہ اسے اسپتال لے گیا اور ڈاکٹر کے بتانے پر کہ وہ کمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہوا تھا اسے ہمارے گھر چھوڑنے آیا تھا۔ پھر وہ روز روز آنے لگا۔ اس نے ہی گھر کو ڈبل اسٹوری بنوا دیا اور ابرش اور ابرج کی شادیاں بھی اسی نے ہی کروائیں ساتھ میں ببلو کو نوکری بھی اسی نے ہی دلوائی بہت احسان ہیں ہم پر اس کے اور ہاں اصل بات تو میں تمہیں بتانا ہی بھول گئی کہ میں ببلو اور ماریہ کی شادی کے بارے میں سوچ رہی تھی اگر تم کہو تو......؟"

"ارے امی ماریہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ جیل میں جانے کے بعد تو تمہارا ویزہ ختم ہو گیا ہو گا نا؟"

"ہاں اماں میں نے سمیر سے جا کر کہا کہ اگر اس نے مجھے میرا ویزہ دیا تو میں پولیس میں جا کر کہہ دوں گی کہ تم بھی میرے ساتھ چرس کا کام کرتے ہو۔ میرے اتنا کہتے ہی اس نے مجھے میرا دوبارہ ویزہ بنوا کر دیا ورنہ میرے پاس اتنے پیسے کہاں تھے کہ میں دوبارہ اپنا ویزہ بنواتی۔ اچھا میں ٹیرس پر چاند دیکھنے جا رہی ہوں۔"

وہ بہانہ بنا کر اوپر چھت پر چلی آئی۔ ابرش اور ابرج بازار شاپنگ کرنے گئیں تھیں۔ انہوں نے اسے بھی چلنے کا کہا تھا لیکن وہ انکار کر گئی۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہو گا اس نے ہی تو مجھ سے کہا تھا کہ میں جب بھی اسے یاد کروں گی وہ میرے سامنے ہو گا تو پلیز کیف سب کہتے ہیں عید آئی ہے جب تمہیں دیکھیں گے تو یقین آ جائے گا۔ وہ سوچتے ہوئے مڑی اور ساکت رہ گئی۔ وہ آج بھی ویسا ہی تھا ہنستا مسکراتا اپنی آنکھوں میں شرارت لیے وہ آگے بڑھی اور اس کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کیف اس کے آنسو پونچھتے ہوئے محبت سے بولا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ زندگی کے ہر موڑ پر تم مجھے اپنا منتظر پاؤ گی۔ بہت آنسو بہا لیے تم نے اب اور نہیں۔ سنو کانچ سی لڑکی یہ عید اور تم میری زندگی کا حاصل ہو۔ اپنا یہ ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر مجھے میری زندگی کی خوشیاں دے دو پلیز ورنہ؟"

وہ اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے بولا تو اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا کیف کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ تبھی چاند مبارک کا شور اٹھا اور ابرش، ابرج اور ببلو کے ساتھ ساتھ ماریہ نے چھت پر دھاوا بول دیا۔

"کیا عباس بھائی ابھی تک چاند مبارک نہیں کہا۔" عباس نے اسے حیرت سے دیکھا تو وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بولا۔

"میں کیف عباس آپ سے محبت کرتا ہوں اور چاند مبارک کہتا ہوں۔ قبول ہے؟"

"ہاں۔"

"میں یا پھر چاند مبارک قبول ہے؟" وہ شرارت سے بولا تو وہ ہنستی ہوئی اپنا ہاتھ چھڑا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی کہ یہ عید اس کے لیے خوشیاں لے کر آئی تھی تو اس پر شکرانے کے نفل تو فرض تھے نا!!

......☆......

فریدہ فرید

افسانہ

ناز کی بستی



نازک لانبی انگلیوں سے آٹے کو بھگوتے وہ نیند کو بھگانے کے لیے سر جھٹکنے لگی۔ ہاتھ کا مُکا بنا کر آٹے کو یکجان کرتے ہوئے اس کے وجود کی پرجوش حرکت نیند دور کرنے کے لیے موثر ثابت ہوئی۔ آملیٹ کے لیے پیازوں کو باریک کاٹتے ہوئے وہ بار بار امنڈتے آنکھوں سے آنسو آستینوں سے صاف کرنے لگی تھی۔ کون جانتا تھا یہ آنسو پیاز کی بدولت تھے یا اس کے اندر کوئی اور ہی غم تازہ تھا۔ یکدم چائے کو آتے اُبال نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ وہ سرعت سے چولہے کی آنچ کم کرنے کے لیے لپکی تھی۔ لاکھ کوشش کے باوجود چائے نے اس کے ہاتھ کو جھلسا دیا تھا اور ساتھ ہی اسے ماضی سے واپس حال میں بھی گھسیٹ لیا تھا۔ طناز ابدی کو وقت کی قلت نے مزید خواب و خیال میں کھونے سے باز رکھا۔ وہ حال میں حاضر باش ہو کر سحری کی تیاریاں مکمل کرنے لگی۔

ڈائننگ ٹیبل پر آملیٹ، رات ہی سے تیار کردہ لوکی گوشت کے سالن کو اوون میں گرم کر کے رکھا چائے کو تھرماس میں ... کے اب وہ فردِ خانہ کے اعتبار سے برتن سیٹ کرنے لگی تھی۔

"سحری میں ایک گھنٹہ باقی ہے۔ طناز سب کو نیند سے جگانا شروع کرو۔" انیسہ بیگم کی آواز نے سحری کے آلارم کا سا کام کیا تھا۔ راشدی صاحب تو اس جاتی آواز پر ہی بیدار ہو گئے طناز کو ساس سسر کی طرف سے اطمینان ہوا تو کمرے سے با آواز بلند جمائی لیتی عطیہ بیگم کی آمد پر وہ پرسکون ہوئی تھی گویا 9 افراد میں سے تین کی ذمہ داری تو حل ہو چکی تھی مگر سب سے مشکل مرحلہ باقی خوابِ خرگوش میں گم افراد کو بیدار کرنے کا تھا۔ جن میں سرِ فہرست شوہرِ عالی شان جناب ابدی صاحب کا تھا۔ شادی شدہ زندگی میں سب سے زیادہ مشکل اسے تب پیش آتی تھی جب ابدی کو صبح آفس کے لیے بیدار کرنے کا وقت آتا تھا۔ وہ ساری جمع پونجی بیچ کے سونے کا عادی تھا۔

وہ اکثر تپ کے کہتی تھی کہ کوئی قیمتی چیز پاس رکھ لیا کرو۔ تاکہ اس کی فکر ہی سہی تمہیں نیند سے جگانا تو آسان ہو اور وہ بکمال محبت سے فرماتا۔

"سب سے قیمتی چیز تو میری طناز ہے۔ جب نیند میں تمہاری آواز آتی ہے تو جان لیتا ہوں کہ کہیں نہیں گئی میرے پاس ہی ہو۔ سو مطمئن ہو کر پڑا رہتا ہوں۔"

ابدی کے بارے میں سوچتے وہ دیور وحدی کو بھی ہلا جلا چکی تھی۔ باقی نندوں میں آپی سوہنی اور بیلی کو بیدار کرانے کی آدھی مشقت انیسہ بیگم نے اپنے سر لے لی تھی۔ سعدی تو رات بھر سوتا ہی نہیں تھا۔ رمضان میں وہ دن بھر سونے اور رات بھر جاگنے کی عبادت بخوبی انجام دیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ رات مصلے پر نہیں کمپیوٹر پر گزرتی تھی۔ عطیہ بیگم ابدی کی پھپھو تھیں۔ عمر کے اعتبار سے راشدی صاحب سے بڑی تھیں مگر لاڈ اٹھوانے میں گھر کی سب سے چھوٹی بیلی کو بھی مات دیتی تھیں۔ اب بھی پورے اہلِ خانہ کی توجہ سحری کے لوازمات سے زیادہ عطیہ بیگم کی اداؤں پر مرکوز تھی جو ابدی کی دادی ماں کے گھٹنے پر سر رکھے سینے پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ بظاہر وہ دل کی تکلیف ظاہر کر رہی تھیں مگر طناز بخوبی واقف تھی کہ صبح روزے سے جان بچانے کا یہ آزمودہ طریقہ تھا۔

اس بہانے سے طناز کیسے واقف تھی؟ یہ سب سوچ کر وہ ماضی میں چلی گئی تھی جہاں ایسے حیلے کرتی وہ اکثر پائی گئی تھی۔

☆......☆

"نازو! نہیں آج رہنے دو میرا بچہ کل رکھ لینا ابھی تو نصف رمضان باقی ہے۔" مشہود ملک، طناز کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے پچکارتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس واپس لینے لگے تھے۔ پانی پینے دینے کا مطلب تھا وہ اسے روزہ رکھنے سے باز رکھنا چاہتے تھے۔

"بابا جانی! میں نے تو پہلے ہی کم روزے رکھے ہیں ایک اور چھوڑ دوں اب طبیعت ٹھیک ہے میری صبح تک اور بہتر ہو جائے گی۔"

طناز مشہود صاحب کی گود میں گھسی کسمسانے لگی تھی۔ اسے ایک سے دو چھینک بھی آ جاتیں تو روزہ رکھنے سے منع کر دیا جاتا تھا۔ روزہ فرض ہونے کے بعد کے چھ سالوں میں اس نے گن کر ایک رمضان کے برابر روزے رکھے تھے یہ نہیں تھا کہ گھر والوں کے نزدیک روزہ غیر اہم عبادت تھی مگر وہ روزہ رکھ کر جس کاہلی اور نقاہت کا مظاہرہ کرتی مزاج کا تیکھا پن جس عروج پر ہوتا، سحری میں بیدار ہونے میں اس کی عظیم الشان سستی اور سحری کھانے میں بے پناہ کنجوسی کو دیکھتے ہوئے ماما بابا اس کی روزے سے رخصت کو زیادہ غنیمت سمجھتے تھے۔

"رکھ لینا جب بالکل فریش ہو گی عمر پڑی ہے روزے رکھنے کی کون سی تو بھاگی جا رہی ہے۔" طناز کی دادی اس کے لاڈ اٹھانے کی چاہت کے عظیم مظاہرے کے دوران لفظی بے احتیاطی برتتے ہوئے گویا ہوئیں لاعلمی سے بڑھ کر محرومی کوئی نہیں ہے۔ بے عمل بزرگ کی صحبت زیادہ بہتر ہے بے علم بزرگ سے اگر وہ راہ نہ بھی دکھائے تو کم سے کم راہ سے بھٹکائے گا تو نہیں۔

"صحیح کہا دادو! عمر پڑی ہے اور عمر کتنی ہے؟ کچھ خبر نہیں اگلے رمضان کے آسرے پر یہ رمضان گزار دیں اور اگلا رمضان نصیب ہو کہ نہیں، معلوم نہیں۔"

بہروز ملک کی بولتی آمد کیا ہوئی تھی گویا دل ہی دہلا دیا تھا۔ دادو نے تو صرف گھوری ڈالی تھی۔ عذرا بیگم نے تو دو ہاتھ بھی لگا دیے تھے۔

"سحری کا وقت ہے ذرا سوچ سمجھ کے بولو بلکہ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے منہ بند رکھ۔" عجیب قوم ہیں ہم مذہب، شریعت، فرض، نفل کے بارے میں جو چاہیں کہیں الفاظ میں جتنی چاہے بے احتیاطی کریں مگر موت زندگی کے بارے میں تلخ ذکر پر جھٹ سے دل تھام لیتے ہیں بس دنیاوی بات ہو آخرت کا ذکر نہ ہو۔

اسی بحث میں سحری تمام ہوئی تھی۔ روزہ بند ہوئے اذان ہوئے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ مگر وہ ہنوز بابا جان کی گود میں محوِ استراحت تھی اور وہ جانتی تھی کہ جب تک وہ سر نہیں اٹھائے گی، بابا جان اپنی جگہ سے حرکت نہیں کریں گے، وہ ناز کی کا پیکر تھی مگر اپنے بابا کے لیے وبال بننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے خود کو گہری نیند میں ظاہر کر کے اپنے سر کو تکیے پر ٹکا دیا تھا۔ بابا جان آہستگی سے نماز فجر کی ادائیگی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں بڑے بھیا شہروز ملک کی مشفق بانہوں میں سفر کرتی وہ اپنے بیڈ پر دراز تھی۔ اس سواری کا مزہ لینے کے لیے وہ نیند میں ہونے کا ناٹک اکثر کرتی تھی۔

"ابدی کو جگانے گئی تھیں کیا خود بھی سو گئیں؟"

انیسہ بیگم کو لاڈو ڈرامہ نما کا شاید عطا ہی اس لیے ہوا تھا کہ وہ وقت بے وقت بہانے خیالوں میں گم ہو جانے والی اس کی عادت کا توڑ کر سکیں۔ اب بھی ابدی کو نیند سے جگانے کے مرحلے میں جانے کب ذہن ناز کی بستی میں بھٹک گیا تھا اور وہ ناز و کی نیند کو سوچتے ابدی کے اوپر ہی دراز ہو گئی تھی، بھلا ہو ساس ماں کا آواز نہ دیتیں تو دونوں کا روزہ جاتا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح ابدی کو جگا کے کھانے کی میز تک لائی تو سحری کے آخری لمحات چل رہے تھے۔ جلدی جلدی پراٹھا چائے میں ڈبو کر وہ حلق سے اتارنے لگی۔

"بلی گڑیا! منہ کھول کے کھاؤ بڑے بڑے نوالے لو ایسے چن چن کے کھائے گی تو کہاں پیٹ بھرے گا؟" بلی کی پلیٹ میں دوسرا پراٹھا ڈالے انیسہ بیگم نے پچکارا تھا جس کے منہ کے زاویے اور نروٹھی ادائیں دیکھ کر طناز ابدی بہر حال سے غائب ہو چکی تھی۔

وہ سحری میں پتہ نہیں کس کس پر احسان عظیم کرتے ہوئے بیدار ہوتی تھی۔ انتہائی آخری لمحات میں اس کی ڈائننگ ٹیبل پر آمد ہوتی اسے ہر چیز ٹھنڈا کھانے کی عادت تھی۔ بابا جان نے پہلے سے ہی اس کے لیے پراٹھے کے ٹکڑے بنا کر اور چائے ٹھنڈی کر کے رکھی ہوتی وہ شہروز بھیا کے کندھے پر اونگھتی رہتی اور بابا جان اسی کیسے منہ میں نوالے ڈالے جاتے۔ پانی کا آخری گھونٹ اس کے منہ میں ہوتا اور اذان ہو جاتی۔ نماز پڑھنے کی وہ پابند نہیں تھی اور ہوتی بھی کیسے؟ بڑوں نے یہی سکھایا تھا کہ عمر پڑی ہے عبادت کے لیے سو وہ عمر رواں میں عبادت کرنے کی زحمت (اس کی عقل کے مطابق) اٹھانے کو تیار نہ تھی۔ ناز کے جھولے پر جھولتی وہ زندگی کی اکیس بہاریں ناز کی بستی میں گزار چکی تھی۔ شادی کے بعد پہلے ہی سال جب رمضان کا چاند نظر آتے ہی ساس ماں نے ذمہ داریوں کے لیکچر سنائے تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"طناز! سحری کے لیے سالن ابھی سے بنا لو۔ آملیٹ کے لیے سامان بنا لو تیار فریج میں رکھنا۔ آٹا گوندھ کے رکھ لو، اچھا ہو گا پیڑے بھی بنا لو سحری تک آٹا سنور جائے گا اور ہاں دودھ اور جوس بھی دیکھ لو ہیں کہ نہیں کچھ منگوانا ہے بازار سے تو ابھی سعدی سے کہہ کر منگوا لو۔ سحری میں دکانیں کہاں کھلی ملیں گی سحری میں جلدی اٹھنا سب کو اٹھانے کے لیے بھی تو وقت چاہیے۔ دیکھو طناز تم ایک بھری پری فیملی کی بڑی اور فی الحال اکلوتی بہو ہو۔ دھیان سے سونا اور جاگنا کہیں تمہاری بے احتیاطی سے کسی کا روزہ رہ نہ جائے۔"

اور وہ اس بے احتیاطی کے خوف سے رات بھر سو بھی نہ سکی کہیں ایسا نہ ہو آلارم نہ بجے۔ ایسا نہ ہو آنکھ کھل نہ سکے اور وہ اکلوتی بہو وقت پر اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے سے غافل نہ ہو۔ شادی کے بعد کے پہلے رمضان کی پہلی چاند رات اس نے وسوسوں اور اندیشوں میں گھرے گزاری اور سحری ناز کی بستی کو کھوجتے گزار دی۔

☆......☆

سحری اس نے سوچتے گزاری تھی تو افطار روتے ہوئے بنایا تھا۔ شام افطاری بنانے میں صرف ہوئی تھی تو رات کو سحری کی فکر سونے نہ دیتی تھی۔ کثیر فیملی کی واحد در کر کہلانے کا شرف حاصل کرنے کے بعد گویا وہ ایک مشین بن کر رہ گئی تھی۔ زیادہ افراد کے اعتبار سے ہر چیز کی مقدار بھی زیادہ ہوتی تھی اسی حساب سے وقت بھی زیادہ لگتا تھا اور سب سے بڑی بات اسے کام کرنے کی عادت نہیں تھی۔ سو معمولی کام بھی اسے پہاڑ جتنا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس فیملی کی بہو تھی جہاں کام کاج صرف بہو کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بیٹیوں کے لیے کام کرنے کے لیے عمر پڑی ہے والا فارمولا رائج تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی احتجاج نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ وہ خود ایک ایسی ہی فیملی سے رخصت ہو کر آئی تھی جہاں وہ پریوں کے پنکھ پر سفر کرتی تھی تو پھولوں کی سیج پر پاؤں دھرتی تھی۔ بابا جان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے بہنوں کی سنگت نہ ہونے کی بنا پر انہیں بیٹیوں سے خاص انسیت تھی۔ شادی بعد یکے بعد دیگرے دو بیٹے شہروز ملک، بہروز ملک عطا ہوئے۔ وہ بیٹی کی نعمت کے لیے ترستے تھے۔ بہروز سے دس سال بعد طناز ملک کی آمد نے گویا شگوفے کھلا دیے تھے۔ ناز کی بستی جگمگا اٹھی تھی۔ مشہود ملک اور عذرا بیگم بیٹی کو محض زبانی نہیں دلی طور پر نعمت خداوندی سمجھنے والوں میں سے تھے۔ شہروز ملک اور بہروز ملک کی برادرانہ چاہت تو سمجھ آتی تھی مگر دادی نے بھی روایتی بزرگوں سے ہٹ کر بگاڑ دینے والی محبت نچھاور کی۔

راشدی صاحب، مشہود ملک کے قریبی دوستوں میں سے تھے رشتہ آنا اور قبول کیا جانا قابلِ فہم بات تھی۔ یوں وہ لاڈلی بیٹی سے اکلوتی بہو بن کر ابدی

کے ساتھ چلی آئی تھی جہاں سسرال ایک حقیقت کی مانند سامنے تھا اور ناز کی بستی خواب و خیال ہو گئی تھی۔

☆......☆

"بابا جانی! اس کا کلر دیکھیں یہ مجھ پر سوٹ نہیں کرے گا مجھے نہیں پہننا۔" طناز کے لیے عید کا جوڑا گویا ملک کو درپیش مسائل میں سب سے گھمبیر مسئلہ بن گیا تھا۔ سحری کے وقت وہ جتنی نڈھال ہوتی تھی شاپنگ کے وقت اتنی ہی ایکٹو ہو جاتی تھی۔ آٹھ چکر لگ چکے تھے۔ مختلف بازاروں کے مگر عید کا جوڑا تھا کہ عید کا بکرا، خریدنا محال ہو گیا تھا۔

بہروز نے تو دو چکروں میں ہی ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔ وہ مزید اس کے ساتھ بازاروں میں خوار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ عذرا بیگم کو وہ خود ہی ساتھ نہیں لاتی تھی کیوں کہ وہ بھاؤ تاؤ بہت کرتی تھیں۔ وہ ہتک محسوس کرتی تھی۔ رہ گئے شہروز بھیا تو وہ تو اس کے ہاتھ کی کٹھ پتلی تھے جسے چاہتی چلاتی تھی۔

کئی دنوں کی محنت کے بعد اپنی پسند کا سوٹ خرید کے لانے کے باوجود وہ مشہود ملک کے سامنے منہ بسور رہی تھی۔ وہی آف وائٹ لانگ سوٹ جو بازار میں دل میں اترا جا رہا تھا اب ناک سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔

"میرا بچہ کچھ اور دیکھ لو ابھی تو عید میں دو دن باقی ہیں۔" مشہود ملک نے نثار ہوتے ہوئے اس کے پرس میں مزید اماؤنٹ ٹرانسفر کر دی تھی تا کہ وہ اپنی خواہش سکون سے پوری کر سکے۔ اسی ناز و انداز میں اس کا عید کا جوڑا اسلیکٹ ہوا تھا۔

"طناز! اپنا سوٹ اٹھا لے یہاں انڈوں پر بٹھایا ہوا ہے کیا؟" انیسہ بیگم اور ان کی چیخ پکار سے ناز کی بستی ہل جایا کرتی تھی۔ عید سے دو دن قبل انیسہ بیگم اور عطیہ بیگم چند سوٹ خرید کے لائی تھیں۔ جن میں سے بیلی اور سوہنی آپا اپنا سوٹ پسند کر کے لے جا چکی تھیں اور باقی ماندہ سوٹ اس کے حصے میں آیا تھا جو رات بھر سے میز پر رکھا تھا مگر وہ اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ لائٹ اورنج کلر کبھی بھی اس کے پہناوے کا حصہ نہیں رہا تھا۔

"مجھے نہیں لینا یہ شارپ کلر ایک تو پورے رمضان شاپنگ کے لیے جانے نہیں دیا خود ہی لے آئیں اور وہ بھی ایسا کلر جو مجھے قطعاً پسند نہیں۔"

وہ ابدی کے سامنے منہ بسور کے بولی۔ ابدی گھر کا بڑا بیٹا تھا۔ راشدی صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس پر ذمہ داریاں زیادہ تھیں اگرچہ وہ بھی اچھی پوسٹ پر تھا اور سوہنی آپا بھی جاب کرتی تھیں مگر ان کی سیلری گھر پر کم اور ان کے اپنے اوپر زیادہ صرف ہوتی تھی۔ سعدی تو فی الحال موج مستی میں گم تھا اور بیلی ناز کی بستی کا مزہ لے رہی تھی۔

سسرال کا ماحول سخت گیر نہیں تھا مگر ویسا بھی نہیں تھا جہاں وہ بیاہ کے آئی تھی اور ویسا بھی کیسے سکتا ہے؟ دنیا میں ناز کی بستی تو صرف ماں باپ کی بنائی جنت ہی ہوتی ہے۔ ابدی چاہنے والا شوہر تھا مگر شہروز بھیا جیسے لاڈ اٹھانے سے قاصر تھا۔ وہ ایک بڑی فیملی کا فرد تھا۔ اسے ہر ایک کی خواہشات کا دھیان رکھنا تھا۔ ان کے گھر میں ہمیشہ سے روایت رہی تھی کہ شب برات کی شاپنگ بزرگ خواتین کرتی تھیں۔ لڑکیاں ڈیزائننگ اپنی مرضی کی کر لیا کرتی تھیں۔ طناز کو ان باتوں کا عادی ہونے کے لیے وقت چاہیے تھا۔

"ارے یار! سارے رنگ بنے ہی تمہارے لیے ہیں۔ تمہارے لیے رنگوں کی کیا قید؟ تم رنگوں سے نہیں یہ رنگ تمہارے وجود سے سجتے ہیں۔" ابدی ہمیشہ کی طرح اسے خود میں سمیٹے لفظوں کے امرت کان میں انڈیل رہا تھا۔ ماں کی ناراضی کے خیال سے وہ اسے پیار کے رنگوں میں ڈبو کر من پسند تصویر تخلیق کرنے لگا۔

☆......☆

"بابا جانی! یہ فاؤل ہے آپ نے ساری عیدی اسے دے دی تو ہمارے لیے کیا بچے گا؟" بہروز ملک دہائی دیتے ہوئے بولا تھا ہمیشہ کی طرح مشہود ملک نے عیدی کے طور پر اپنا پورا والٹ طناز کو تھما دیا تھا۔ اگرچہ شہروز اور بہروز، بابا جان کے بزنس میں مکمل حصے دار تھے اور خیر سے خود عیدی دینے والوں میں سے تھے۔ شہروز بھیا کی جیبوں میں تو وہ دن بھر ہاتھ ڈالے رکھتی تھی وہ اس پر جان وارتے تھے اشیاء ان کے نزدیک کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ بہروز البتہ بناوٹی چھیڑ چھاڑ اور لڑائی ہر وار رکھتا تھا اس سے فائٹنگ کرتا یا کوئی بھی انٹرسٹنگ کمپٹیشن اور پھر جان بوجھ کے ہار بھی جاتا، اس کی چیزوں کو بکھیرتا پھر اس کی روتی صورت دیکھ کر خود ہی سمیٹ بھی دیا کرتا اس کی چاہت کا اپنا انداز تھا۔ عذرا بیگم نے تو اس کی من پسند ڈش بنا کر عیدی دے دی تھی تو دادی ماں ہر عید پر اپنے سنبھال کے رکھے طلائی زیورات میں سے کچھ نہ کچھ بطور عیدی اسے دیتی رہتیں اب تک تو وہ دادی کے تقریباً سبھی زیورات کی مالک ہو چکی تھی۔

"عید مبارک میری بچی سدا سلامت رہو غم کی پرچھائیں تک نہ آئیں تجھ پر۔" ابدی کی پھپو عطیہ بیگم جو انداز اسٹر کی دہائی کراس کر چکی تھیں۔ ابدی کی دادو کی نحیف بازوؤں میں نو عمر بچی کی طرح گھسے جا رہی تھیں اور وہ بلائیں لیتی اور چومتی تھکتی نہ تھیں۔ طناز کو ان ضعیف خواتین کی محبت ہمیشہ عجیب اور فنی قسم کی لگتی تھی۔ عطیہ بیگم شادی کے چند سالوں بعد بیوہ ہو گئی تھیں۔ ایک بیٹا تھا جو بیرون ملک تعلیم کی غرض سے گیا تھا اور گویا خود غرض ہو گیا تھا۔ ماں سے واسطہ اب محض ڈالرز کے ڈرافٹ تک ہی محدود تھا۔ عطیہ بیگم بھائی اور ماں کے سہارے جی ہی نہیں رہی تھیں اپنے سرمائے سے ان کی مالی امداد بھی کیا کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ کسی پر بوجھ نہ تھیں بلکہ دادی اور راشدی صاحب کے ساتھ ان کے ناز نخرے تو 17 سالہ بیلی کو بھی مات دیتے تھے۔ طناز کو سسرال میں اگر کوئی بات ہنساتی تھی تو وہ عطیہ بیگم کی ادائیں ہوتی تھیں۔

"سوری ابدی! میں ہنسنا نہیں چاہتی تھی مگر پھپھو ہنسا کے چھوڑتی ہیں۔" طناز کے ہنسی دبانے کے چکر میں ابلتی آوازوں پر ابدی اسے بہانے سے کمرے میں لے آیا تھا اور اب اس کی تنبیہہ پر وہ وضاحت دے رہی تھی۔

"طناز! وہ اپنی ماں کے ساتھ لاڈ کر رہی ہیں ایسے ہی جیسے تم صبح میں اپنی ماں کی گود کی عید یاد کر کے اداس تھیں۔"

عید کے دن کی مصروفیات کے پیش نظر اس نے ناز کی بستی کو کھوجنے اور آنسو بہانے کا کام عید کی صبح سب کے بیدار ہونے سے پہلے ہی انجام دے دیا تھا۔ ابدی کے بقول یہ وہ واحد فریضہ تھا جسے وہ اپنی مرضی سے اور پوری پابندی سے ادا کرتی تھی۔

"ابدی! میری اور ان کی عمر کا فرق دیکھو اب اس ایج میں یہ سب کچھ اکورڈ لگتا ہے۔" طناز ابدی کے کرتے کے بٹن سے کھیلتے ہوئے بولی تھی جس کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ اس کے جذبات کی قدر کرتا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ کیا اس ایج میں آ کر وہ دادو کی بیٹی نہیں رہیں یا دادو سے بڑی ہو گئیں ہیں۔" ابدی نے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر سوال داغا تھا جس کا جواب اس نے بھنویں اچکا کر خاموش لبوں سے دیا تھا۔

"انسان عمر کے جس دور میں بھی ہو طناز اولاد، اولاد ہی رہتی ہے اور ماں باپ کی محبت جوں کی توں ماں کے سوا دنیا میں کوئی ایسی ہستی ہے جو اپنے بچوں کے ضروری یا غیر ضروری ناز اٹھائے۔ دادا ابو کے انتقال پر ابو جی بہت روئے تھے میں نے ازراہ مذاق کہا کہ ابو جی کیا اب بھی دادا نہ جاتے۔" تو ابو جی نے یاسیت سے کہا تھا۔ "بیٹا تمہارے لیے وہ ضعیف العمر

تھے مگر میرے لیے دنیا میں واحد وہ زبان تھی جو اس عمر میں بھی مجھے میرا بچہ کہہ کر مخاطب کرتی تھی کیا کوئی اور ہے جو مجھ سے بوڑھے کو بچہ کہہ کر بلائے۔"

ابدی کے تفصیلی جواب نے جیسے ضبط کے بندھن توڑ دیے تھے وہ ساون بھادوں برستی آنکھوں سے اسے تک رہی تھی۔ اس کا دل تو ویسے بھی ناز کی بستی کے لیے ترستا تھا۔ وہ وہی طناز تھی ماں باپ جانثار بھائی اب بھی وہی تھے۔ وہی آسمان زمین تھے، وہی شب و روز تھے بابا جان اب بھی اس پر عیدی لٹا دیتے تھے۔ ماں کے گھر سے پہلی عیدی کے نام پر کیا کچھ نہ آیا تھا۔ بھائیوں کے سینے سے لگ کر چاہت کی چاشنی بھری عید اب بھی منائی تھی مگر پھر بھی بات پہلے سی نہ رہی تھی۔ ناز کرنے اور اٹھانے والے وہی تھے مگر ناز کے انداز بدل گئے تھے حق تو یہ ہے کہ اب وہ ناز کی بستی کی مہمان تھی مکین نہیں۔

☆......☆

پریشر ککر میں گوشت چڑھائے وہ مسلسل ابکائے جا رہی تھی۔ طبیعت کا بوجھل پن بڑھتا جا رہا تھا جوں جوں وہ تخلیقی مراحل کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ جسمانی طور پر ہلکان اور دماغی طور پر بدحواس ہوتی جا رہی تھی۔ سونی آپا شادی کے بعد پہلی بار میکے آ رہی تھیں ایک کثیر سسرال اس کی اپنی کیا کم تھی کہ سونی آپا بھی اچھے خاصے سسرالیوں کو لیے آ پہنچی تھیں دو دن سے اس کی اوور ٹائم جاب جاری تھی۔ کام کی تو اب عادت ہی ہو چلی تھی مگر ایک ذمہ داری فطرت کی طرف سے بھی لاگو تھی۔ جس کی کٹھنائیاں اپنا ایک مزہ رکھتی ہیں۔ ابدی نے اس کی مدد کے لیے کام والیاں مہیا کی تھیں مگر ہدایات کاری کا شعبہ بھی کم اعصاب شکن نہیں تھا۔

"ماما! میری آنکھیں جل رہی ہیں۔ انہیں میرے سامنے مت کاٹا کریں۔" عذرا بیگم بریانی کے لیے ٹوکری بھر پیاز کاٹتے ہوئے آنسوؤں سے بھیگے چہرے اور انگلیوں کے پوروں پر چھری کے نشان لیے اس کی نازک آنکھوں پر آنچل ڈالے منہ سے پھونک دیے جاتی تھیں۔ اسے پیاز کی بو اور اثر پسند نہیں تھا ماں اس کے کالج سے آنے سے قبل ایسے ناپسندیدہ کام انجام دے لیا کرتی تھیں کبھی کبھی اس کے اندر ماں کی مدد کا خیال بھولے سے آ جاتا تھا مگر اس خیال کو رفع کرنے کے لیے بھی کاروانِ محبت موجود تھا۔ ایک بار چولہے کے قریب جاتے اس کے ہاتھ پر گھی کے چھینٹے پڑے تھے تب سے اسے کچن میں جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ پھل کاٹتے ہوئے چھری انگلی میں لگ گئی تھی، سو اب اسے مکھن لگانے کے لیے بھی چھری استعمال نہیں کرنے دی جاتی تھی۔ اس کی معمولی سی تکلیف پر تڑپ جانے والوں کو ایک لمحے کو بھی خیال نہ آتا تھا کہ مرا جل دنیا میں جنت سے باہر کوئی جنت نہیں۔

اسے سوئی کی نوک جتنی تکلیف سے بھی بچانے والے اس وقت دروازے سے باہر کھڑے اس کی دلخراش آوازیں سن رہے تھے اور اللہ کی بارگاہ میں دعا گو تھے۔ یہ مرحلہ تکلیف دہ ضرور ہے مگر عورت کی فطری تکمیل ہے، کل تک ان کی شفقت کے جھولے میں جھولنے والی کی گود کو آج اللہ نے اپنی رحمت سے بھر دیا تھا۔

طناز کو رب تعالیٰ نے خزینہ عطا کی تھی۔ مشہود ملک اپنے مخصوص انداز میں اس کے ماتھے کو بوسہ دیتے خود سے لگا رہے تھے مگر اس کی نم آنکھیں اپنی راج دلاری پر جمی تھیں جو ابدی کی بانہوں میں ننھی ننھی آنکھیں کھولے اپنے بابا جانی کے چہرے کو تک رہی تھی۔ ابدی کی شہد لگی انگلی کو گلابی لبوں میں چھپائے وہ اپنے بابا جانی کی ساری چاہت و دلار اپنے اندر سموئے جا رہی تھی۔

آج اسے عطیہ بیگم کے بجائے خود پر ہنسی آ رہی تھی۔ ایک طرف بیٹی اپنے حصے کے ناز سمیٹ رہی تھی تو دوسری طرف ماں بھی کبھی باپ بھی ماں بھی بھائیوں کی شفقتوں کو بمعہ سود وصول کر رہی تھی۔

☆......☆

"ابدی! اسے نیچے اتاریں ہر وقت نہ اٹھائے رکھا کریں زمین پر چلنے کی عادت پڑنے دیں اسے۔"

چھ سالہ خزینہ کو ابدی کے کندھے کی سواری پسند تھی۔ زمین پر چلتے وقت یا تو اسے شوز تار چر کرتے یا بار بار ٹھوکر لگتی رہتی۔ 3 سالہ ہادی کی انگلی پکڑ کر چلاتی وہ کئی بار ابدی کو پکار چکی تھی مگر وہ ان سنی کیے آگے بڑھتا رہا تھا۔

بچوں کو عید کی شاپنگ کرانے مارکیٹ تک لانے کا فیصلہ ابدی کا تھا۔ وہ بچوں کو ساتھ لے جانے کے حق میں نہیں تھی۔ جانتی تھی خزینہ کو کوئی کھلونا یا سوٹ پسند آ جانا ایسے ہی تھا جیسے مسجد قاسم والوں کا باقی پاکستان کے ساتھ عید منانا جس طرح پاکستان میں ایک دن عید منائے جانا ناممکن لگتا تھا ایسے ہی خزینہ کو پہلی نظر میں کچھ پسند آ جانا بھی ناممکن سے بھی بڑھ کر کچھ تھا۔

طناز بلاوجہ ڈھیل دینے والی ماؤں میں سے نہیں تھی۔ خزینہ کی پیدائش سے اب تک اس کے رویے میں ایک خاص سختی واضح نظر آتی تھی جو اس کے نزدیک بچیوں کی تربیت کے لیے بہت ضروری تھی۔ جب کہ ابدی کی لاپرواہ نیچر تو اب خواب ہو گئی۔ جسے نیند سے جگانا جوئے شیر تھا اسے خزینہ کی ایک آواز بستر سے اٹھا دیتی تھی۔ آفس کے علاوہ جس ابدی سے کام لینا سوائے تام ویٹ کے کچھ اور نہ ہوتا وہ خزینہ کی ہر خواہش پر ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جاتا تھا۔

"کیوں نیچے اتاروں طناز! زمین غیر ہموار ہے گر جائے گی۔" ابدی اس کے اصرار پر قدرے سخت لہجے میں بولا تھا۔ خزینہ ہنوز اس کی بانہوں میں محو پرواز تھی۔ شاپنگ مکمل ہو چکی تھی۔ وہ واپسی کی راہ پر گامزن تھے۔

"تو گرنے دیں گرے گی تو چلنا سیکھے گی اسے زمین کی ناہمواریوں کو برتنے دیں زندگی کی پگڈنڈی کا مقابلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔" طناز کے اندر اس کا تجربہ بولتا تھا۔ وہ بیٹی کی تربیت ایک خاص پیرائے میں کرنے پر بضد تھی۔ جب کہ ابدی ہر باپ کی طرح اپنی بیٹی کے لیے مخصوص انداز میں سوچتا تھا۔ اس سے آگے سوچنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"طناز! اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو اذیت کون دے سکتا ہے۔ وہ گرے گی تو درد کسے ہو گا؟ بیٹیاں کانچ ہوتی ہیں اور کانچ پر تجربات نہیں کیے جاتے ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔" گھر واپس آ کر خزینہ کو بستر پر نرمی سے لٹاتے ابدی نے پہلی بار اس سے اس طرزِ سوچ پر بحث کی تھی۔ ابدی کو قائل کرنا ایسے ہی دشوار تھا جیسے طناز کے لیے ناز کی بستی کو فراموش کرنا۔

"ابدی! بیٹی کانچ ہوتی ہے مگر اسے پتھروں کے ساتھ زندگی گزارنا ہوتی ہے۔ جب یہ ازل سے طے ہے تو بیٹی کو جدائی کی کڑوی گولی کھلانی ہے اور کٹھنائیوں کی بھٹی کا ایندھن بنانا ہے تو کیوں نہ اسے ہر موسم کا عادی بنایا جائے۔ پیار کی پھوار جب صرف ماں باپ کی دہلیز تک ہی ہے تو بیٹی کو دروازے کے پار تپتی ہوا کے لائق بھی تو بنانا ہے۔ ماں باپ صرف چاہت دے سکتے ہیں نصیب نہیں۔ تو پھر نصیب کے امتحان کے لیے پہلے سے تیاری بھی تو کرانی چاہیے۔"

طناز اپنے تئیں اپنی سوچ کے پرت کھول رہی تھی۔ زندگی کے سمندر سے جو سیپ اس نے چرائے تھے وہی موتی وہ اپنی ممتا کے آنچل میں پرو رہی تھی تاکہ اس کی تربیت روشنی بن کر اس کی اولاد کو زندگی کی اونچی نیچی اندھیری راہوں سے بخوبی گزار سکے۔

"طناز! کیا تم امتحان میں ناکام رہیں تمہاری تو کوئی تیاری نہیں تھی، تمہاری ناز کی بستی تو دہلیز پار طوفانوں سے ناواقف تھی پھر یہ سبق کہاں سے سیکھا تم نے۔" ابدی اس کے پرسوچ وجود کو تھامے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولا تھا۔ محبت ان دونوں کے بیچ

زیرِ بحث نہیں تھی انداز محبت کا اختلاف مناظرہ کررہا تھا۔ طناز جو وظیفہ پڑھ رہی تھی ہمارے معاشرے کے سو میں سے پچاس گھروں میں اسی سوچ کے تحت بیٹیوں کی تربیت کی جاتی ہے۔ ابدی جس بات کا ورد کررہا تھا۔ باقی پچاس گھروں میں بیٹیاں ایسے ہی کانچ کی طرح سنبھالی جاتی ہیں اور ہاتھ سے ہاتھ اٹھائی جاتی تھیں۔ وظیفہ یا ورد کوئی بھی ہو کھیل صرف نصیب کھیلتا ہے۔

"وقت نے سکھایا ابدی کتاب زمانہ نے رٹوایا ہے۔ تربیت حال کو دیکھ کر مستقبل کو سامنے رکھ کر کرو۔"

"طناز! تو کیا ہماری بیٹی کو وقت یہ سب نہیں سکھادے گا؟"

ابدی کے ایک اور سوال نے طناز کو کچھ دیر کے لیے خاموش کردیا تھا۔ ابدی کو بحث و مباحثہ کی عادت نہیں تھی مگر خزینہ نے جہاں اپنے بابا جانی کی بہت سی عادات کو بدلا تھا وہیں وہ اپنے بیان موقف کے لیے باتوں کو طول بھی دینے لگ گیا تھا اگر طناز نے وقت سے سیکھا تھا تو اسی کتاب سے ابدی نے بھی بہت کچھ پایا تھا۔ ناز کی بستی طناز کی ملکیت تھی مگر اس کے خزانوں سے واقفیت ابدی کرارہا تھا۔

"جو تھیوریز کتاب وقت پڑھا دیتی ہے جو پریکٹیکل نصیب کی لیبارٹری میں ہر کوئی کرلیتا ہے اسے سکھانے کے لیے ہم ناز کی بستی کو اصولوں کا اسکول بنادیں جنت سے باہر جنت نہیں ہے جو سوچ کر اپنے بچوں کو کچھ وقت کے لیے جنت کی ہوا سے بھی محروم کردیں۔ کیا چاہتی ہو طناز! اس خوف سے کہ زندگی کی راہگزر کٹھن ہے اپنے بچوں کو کانٹوں پر چلنے کی مشق کرانا شروع کردیں۔ ایک ناز کی بستی جو دنیا کی سب سے حسین حقیقت ہے اسے اپنے بچوں کے لیے ڈراؤنا خواب بنادیں۔" ابدی بھی اپنی لاجک کا بھرپور طریقے سے دفاع کررہا تھا۔ بیٹی کو نعمت سمجھنے والے باپ کو نصیحت کرنا سب سے مشکل امر ہے۔ جو رب کا مشکور ہو اس حوادثِ زمانہ کی پرواہ کب ہوتی ہے۔

"ناز کی بستی صرف ایک خواب ہے ابدی۔" طناز کے اندر تھکان اتر آئی تھی۔ حسین ماضی اور متضاد حال کے ملاپ نے اسے عمر سے زیادہ شعور عطا کردیا تھا۔

"اور تم چاہتی ہو ہماری بچی کے پاس خواب بھی نہ رہیں؟" ابدی کے سوال پر طناز دم بخود اسے دیکھے گئی۔ بات تلخ تھی مگر سچ تھی خواب حقیقت کا استعارہ ہوتے ہیں۔ حقیقت کی زمین پر آبیاری خواب کرتے ہیں۔

"خواب کی شیرینی حقیقت کے جام کو نوش کرنے کے قابل بنادیتی ہے میری جان! ناز کی بستی پر نازوں پلی کا حق ہے۔ مختصر وقت کے لیے ہی جنت میں جینا کتنا خوب صورت خواب ہے۔ ناز کی بستی گود سے گود، نسل سے نسل منتقل ہوتی ہے۔ نصیب اچھا ہو یا برا ناز کی بستی سب کی وراثت ہوتی ہے۔ کل تم ناز کی بستی کی مہمان تھیں تمہاری ہر طرح سے خاطر مدارت کی گئی، آج تم ناز کی بستی کی میزبان ہو اپنے مہمان کو زمان و مکان کے فارمولے نہ سکھاؤ یہ کام وقت کا استاد خود کرے گا۔ تم اسے وہ خوشیاں، راحتیں دو جو تم نے پائیں تمہارے اندر جو ناز کی بستی جیتی تھی جس نے تمہیں ہر حالات میں جینا سکھایا اسے اپنی بچی کے لیے تجربہ گاہ مت بناؤ۔ ماں باپ اپنے بچوں کو نصیب نہیں دے سکتے کم سے کم آسودہ خواب تو دے سکتے ہیں۔ ناز کی بستی اگر خواب ہے تو یہ خواب دیکھنا ہر بیٹی کا حق ہے۔" ابدی سوئی ہوئی خزینہ کے ماتھے کو چوم کر طناز کی طرف متوجہ ہوا جو پھر سے ناز کی بستی کے خیالاتی سفر پر روانہ ہوچکی تھی کیوں کہ زندگی کا سب سے حسین خواب ناز کی بستی ہے۔

☆

اقراء چنا

افسانہ

تیری چاہت کے خزانے

"حیدر علی صاحب آئے بیٹھے ہیں، اپنی اماں سمیت۔" عائشہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اونچی آواز میں اطلاع دی تھی۔

"مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتا، اور پھوکس انداز



میں دیکھتی ہیں مجھے۔ آخر اتنی بار انکار کرنے کے بعد بھی وہ سمجھتیں کیوں نہیں۔" نیلم قد آور آئینے کے سامنے کھڑی چہرے پر مساج کرتے ہوئے بول رہی تھی۔

"بیٹے صاحب بھی ہمراہ چلے آتے ہیں۔ اف!" عائشہ بیڈ پر گرتے ہوئے بولی۔

"کسی کا اتنا مذاق اڑانا اچھی بات نہیں ہوتی، اچھا نہیں بول پاتے تو کسی کے بارے میں برا بھی نہیں بولنا چاہئے۔" مہرباں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ہاتھوں میں فریم لیے بیٹھی تھی۔ اسے بڑی اور چھوٹی بہن کی ایسی نخوت بھری باتوں سے جھرجھری آتی تھی۔

"تم نے دیکھا نہیں مہرباں! پھپھو تین بار میرے رشتے کی بات کر کے گئیں ہیں، میں امی سے مسلسل انکار کر چکی ہوں، حیدر سے شادی کرنے سے تو بہتر ہے کہ میں یہاں پوری زندگی بیٹھی رہوں۔" ٹشو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ متنفر سے بولی۔



"خدانہ کرے باجی!" مہرباں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

نیلم کی ایک سال قبل شادی ہوئی تھی، مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے اس کی طلاق ہوگئی تھی۔ وہ پچھلے کئی مہینوں سے والدین کے گھر پر رہ رہی تھی، وہ شروع سے ہی نخریلی تھی، اس کی ڈیمانڈز ایسی تھیں کہ شاید ہی پوری ہو پاتیں۔ لڑکا خوبصورت ہو، امیر ہو، اور عمر بھی زیادہ نہ ہو۔

والدین اس کی غرور پسند طبیعت سے پریشان تھے۔

مسلسل آنے والے رشتوں میں وہ نقص نکال نکال کر انکار کرتی رہی تھی۔

اس سب کے باوجود بھی پھپھو اسے بہو بنانا چاہتی تھیں، لیکن اس کے انکار کی وجہ سے اس کے پریشان حال والدین بھی فیصلہ نہیں کر پاتے تھے کہ کہیں دوبارہ ان کا فیصلہ ان کے لئے باعث اذیت نہ بن جائے۔

"اتنی بڑی بھی خامی نہیں ہے ان میں، آپ سے صرف تین سال ہی تو بڑے ہیں، اچھی جاب پر فائز ہیں، اپنا گھر ہے، دو ہی افراد ہیں اور پھپھو بھی تو کتنی سلجھی ہوئی ہیں۔" مہرباں نے فریم میں سے دھاگا کاٹتے ہوئے دلیل دی۔

حیدر علی کی سانولی رنگت اور ایک ایکسیڈنٹ میں پاؤں کی چوٹ، جس کی وجہ سے وہ ٹھیک سے نہیں چل پاتے تھے، ہر کوئی ان کی ان خامیوں کو دیکھتا تھا، ان کی خوبیاں کسی کو نظر نہیں آتی تھیں۔

"آپ بڑی حمایت کر رہی ہیں ان کی۔" عائشہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ویسے میں نے سنا ہے کہ راحت ممانی آپ کا رشتہ مانگ رہی ہیں سمیع کے لیے۔" نیلم معنی خیزی سے بولی۔

"کیا؟" مہرباں کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔

"جی ہاں!" عائشہ پرلطف ہوئی۔

"میں وہاں ایک دن نہیں گزار سکتی، جبکہ پوری عمر۔" اس کے حلق میں کانٹے چبھے۔

"بھئی یہ اب تمہارا مسئلہ ہے، ویسے بھی تم بہت اچھی بنتی ہو، اب انکار کر کے دکھاؤ۔" نیلم مذاق اڑانے والے انداز میں بولی۔

ممانی کا گھر، ان کے اصول، ان کا رہن سہن، طور طریقے اسے سات ماہ پہلے والے دن یاد آنے لگے، جب وہ خوشی خوشی حیدر آباد سے کراچی ان کے گھر گئی تھی۔ اسے سوچ کر جھرجھری آئی۔

☆☆☆

"میں زمین پر سلیپرز کے بغیر قدم بھی نہیں رکھ سکتی۔" راحت ممانی بولیں۔ اس نے بغور ان کا گھر دیکھا، بڑا اور خوبصورت گھر تھا، اور اتنا ہی صاف ستھرا [illegible] کا فرش چمک رہا تھا۔

"ممانی! اتنا بڑا گھر ہے، اور اتنے سارے کام آپ خود کر سکتی ہیں، ماسی وغیرہ رکھ لیں۔"

وہ جب سے آئی تھی، ممانی کو کام کرتے ہوئے ہی دیکھ رہی تھی، جبکہ ان کی آمدنی اچھی خاصی تھی، وہ دو ماسیاں تو افورڈ کر ہی سکتی تھیں، اسے ممانی پر [illegible] آرہا تھا جو خود ہی سارے کام نپٹا رہی تھیں۔

"مجھے بیٹا! کسی کا کام پسند نہیں آتا، اور ماسیاں صاف ستھری نہیں ہوتیں، پتا نہیں ہاتھ بھی دھوتی ہوں گی یا نہیں، میں خود ہی کافی ہوں۔"

شاندار ٹی وی لاؤنج میں وہ ممانی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ان کی ایسی بات سن کر اسے سکتہ لگ گیا۔

اچھی خاصی آمدنی میں بھی سکون و آرام میسر نہ ہو تو دولت کس کام کی، اس نے سرد آہ بھر کر سوچا۔

ممانی کی کوئی بیٹی نہ تھی، دو بیٹے تھے وہ بھی اپنی اپنی جاب میں مصروف، وہ بہت خوشی سے کراچی آئی تھی مگر پہلے دن ہی اسے بوریت کا احساس ہو رہا تھا، ممانی اپنے کام میں مصروف رہتیں اور وہ چپ

چاپ بیٹھی رہتی۔

اگلی صبح اس نے ناشتے کے بعد برتن سمیٹ کر کچن میں رکھے۔

ممانی کسی کام سے اپنے کمرے میں گئیں تو اس نے فٹافٹ برتن دھونا شروع کر دیے۔ بدقسمتی سے راحت ممانی نے اسے دیکھ لیا۔

"بیٹا! تم نے برتن کیوں دھوئے؟ مجھے نہیں پسند کسی اور کے ہاتھ کے۔" وہ بنا لحاظ کے بولیں، مہرباں ہکا بکا رہ گئی۔

"ممانی! میں تو آپ کی ہیلپ کر رہی تھی" اس نے بے چاری شکل بنا کر صفائی پیش کی۔

"کوئی بات نہیں، میں عادی ہوں۔ کرلوں گی۔" انہوں نے نرم روی سے کہا۔ اور اس نے دیکھا، ممانی نے ایک گھنٹہ لگایا، چند برتنوں کو دھونے میں اتنا رگڑ رگڑ کر صاف کیا کہ ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی ابھی دکان سے لائے گئے ہیں۔

"کیا کر رہی ہو مہرباں؟" وہ اٹیچی بیڈ پر رکھے، کپڑے نکال رہی تھی وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھ بیٹھیں۔ ایک تو وہ سوال بھی بہت کرتی تھیں۔

"پہننے کے لیے کپڑے نکال رہی ہوں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اٹیچی نیچے سے صاف نہیں ہوگی اور تم نے بیڈ پر رکھ دی۔ اس طرح گندگی ہوتی ہے، انسان بیمار ہو جاتا ہے۔" جملے سخت مگر انداز اور لہجہ بہت نرم تھا۔

"جی..... سوری" اس نے فوراً اٹیچی نیچے رکھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" واش روم کی جانب جاتے بھی دیکھا، پھر بھی پوچھا۔

"واش روم۔" وہ ہونقوں کی طرح بولی۔

"کیوں؟"

"نہانے کے لیے۔" وہ جتانے والے لہجے میں بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے، پانی کا استعمال کم کرنا، کراچی میں ذرا مسئلہ ہے پانی کا۔" انہوں نے جاتے ہوئے تنبیہ کی۔ وہ سرد سانس لے کر رہ گئی۔

ان کے ہاں ایک دن جو گزارنا مشکل تھا۔ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے صفائی دینی پڑتی تھی، ہر سہولت ہوتے ہوئے بھی زندگی بہت مشکل اور بور تھی۔

اس نے اسی دن گھر فون کیا مگر امی نے اسے ڈپٹ دیا، اسے ناچار ایک ہفتہ وہاں رکنا پڑا، مزید ایک ہفتہ میں اس نے راحت ممانی کی اصول پسند زندگی کے اور بھی کئی رنگ دیکھے۔

☆☆☆

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے مہرباں؟" نیلم اس کے سر پر کھڑی چلا رہی تھی اور وہ خود متفکر سی ناخن چبا رہی تھی۔

"جس رشتے کو باجی مسلسل انکار کرتی آئی ہیں آپ نے اسے قبول کرلیا آپی۔" عائشہ ابھی تک بے یقینی کی حالت میں تھی۔

وہ کیا کرتی، امی نے اس کے آگے سرسری سی خواہش ظاہر کی، اس نے فوراً حیدر علی کے حق میں فیصلہ سنا دیا تھا۔ جہاں امی اور ابو اتنے خوش تھے وہیں پھپھو پھولے نہیں سما رہی تھیں، نیلم اور عائشہ اس سے سخت ناراض تھیں۔

"میں نے امی اور ابو کی خوشی دیکھی۔" اس نے کندھے اچکا کر کہا۔

"پوری زندگی تمہیں اس شخص کے ساتھ گزارنا ہے۔" نیلم کو وہ اعلیٰ درجے کی بے وقوف لگ رہی تھی۔ اسے رشتوں کی کمی تو نہیں تھی۔

"میں سب کچھ جانتی ہوں باجی! آپ نے دیکھا نہیں کہ ہمارے والدین ہماری وجہ سے کتنے پریشان رہتے ہیں، اگر ایک بیٹی کا رشتہ ہو جائے گا

توانہیں اچھا لگے گا۔" اس نے بغور نیلم کو دیکھا، اصل میں تو والدین اس کی وجہ سے پریشان تھے۔

"ہم بوجھ نہیں ہیں ہمارے والدین کے لئے۔" نیلم برا مناتے ہوئے بولی۔

"بوجھ نہیں، ذمہ داری ہیں اور میں نے ان کی ایک چوتھائی فکر کم کردی ہے۔" وہ سرد سانس لے کر بولی۔

اس نے بنا سوچے سمجھے ہی فیصلہ کرلیا تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ آگے کی زندگی کیسے گزارے گی، وہ خود سے سات سال بڑے حیدر علی کے ساتھ انڈر اسٹینڈ کر بھی سکے گی یا نہیں۔ اب نیلم باجی کی باتیں اسے بھی سوچنے پر مجبور کررہی تھیں کہ کہیں اس نے تلوار اپنے ہی گلے پر تو نہیں چلادی۔ مگر امی، ابو کے پرسکون چہرے دیکھ کر اسے اطمینان ہورہا تھا۔

"تم نے خزانے اور کوڑے میں سے کوڑے کو اپنایا ہے مہرباں پچھتاؤ گی۔" نیلم سر جھٹک کر بولی۔ اس نے آنکھیں بند کرکے خدا سے بہتری کی دعا مانگی۔

دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں، تیاریوں میں دو ماہ کا عرصہ بھی گزر گیا۔

بہنوں کی ناراضگی، والدین کی خوشی، پھپھو کی محبتوں کی چھاؤں میں ایک نئے ہمسفر کے ساتھ اس نے نئی زندگی میں قدم رکھا تھا۔ وہ بابل کے گھر سے رخصت ہوکر پھپھو کے گھر آگئی تھی۔

☆☆☆

بہت سارے خدشات تھے جو وہ دل میں لے کر رخصت ہوئی تھی، مگر حیدر کی اچھائیاں ہر خدشے پر بھاری تھیں، ہر انسان حیدر کی طرح نہیں ہوتا یہ اسے حیدر کے ساتھ رہ کر احساس ہوا تھا۔ وہ بہت نفیس اور سادہ انسان تھا۔

ایک انسان دوسرے انسان کو تب ہی عملی طور پر جان پاتا ہے جب وہ اس کے ساتھ رہ کر وقت گزارے۔

مہرباں نے جانا تھا کہ وہ ایک بہترین انسان ہے، اس سے بہتر مہرباں کے لئے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس کا انتخاب اس کے لئے بہت فائدہ مند رہا تھا۔

وہ کبھی بھی بدلحاظ نہیں ہوا تھا، وہ مہرباں کی غلطی پر بھی اس پر غصہ نہیں کرتا تھا، ہر چیز میں اسے اہمیت دیتا، اس کا گھر تھا تو چھوٹا مگر بہت خوبصورت تھا۔ ان دونوں افراد نے خوشیوں سے اسے اس قدر روشن کردیا تھا کہ وہ ان کے چہروں سے جھلکتی تھی۔

پھپھو نے بھی اسے ہاتھ کا چھالا بنا رکھا تھا، گھر میں دو ماسیاں تھیں۔ وہ اور پھپھو پورا دن ایک دوسرے کے ساتھ گزارتیں۔ پھپھو کی اپنی ایک بیٹی تھی وہ بھی لاہور میں بیاہ کر گئی تھی۔

مہرباں کی سعادت مندی نے انہیں سرشار کردیا تھا، شادی کے دو ہفتوں بعد حیدر کی ترقی ہوگئی تھی تو اسے کمپنی کی طرف سے کار ملی۔ اس نے آکر چابی پھپھو کے ہاتھ پر رکھ دی مگر پھپھو نے بڑے پیار کے ساتھ وہ چابی مہرباں کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"تمہارے گھر میں قدم پڑے اور یہ اس کے نصیب سے ملی ہے۔" پھپھو نے بہت پیار سے کہا وہ خوشی سے چہک اٹھی۔

"عائشہ بے چاری کی تو زندگی اجیرن ہوکر رہ گئی ہے۔" نیلم باجی افسردگی سے بول رہی تھیں، ہر اتوار کو وہ حیدر کے ساتھ امی کے گھر آتی تھی اس روز بھی وہ سب شام کو صحن میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"کل اس نے ممانی کی غیر موجودگی میں کپڑے دھولئے، ممانی کی طبیعت کو تو تم جانتی ہو، انہوں نے کھڑے ہوکر دوبارہ وہ ہی دھلے کپڑے دھلوائے۔ بے چاری عائشہ رو رہی تھی۔" نیلم افسردگی سے بتا رہی تھی، ہر ہفتے اسے باجی سے ایسی ہی باتیں سننے کو ملتی تھیں۔

مہرباں کی شادی کے ایک ماہ بعد عائشہ کی بھی ممانی کے بیٹے سمیع کے ساتھ شادی ہوگئی تھی۔ عائشہ اور نیلم باجی تو راحت ممانی کی دولت اور سمیع کی خوبصورتی سے بہت متاثر تھیں، مگر مہرباں ان کے گھر کے حالات جانتی تھی، جہاں سانس لینا بھی محال ہو، اور زندگی بس دوسروں کے اشاروں پر گزرے، ایسی بھی کوئی زندگی تھی اس نے سرد سانس لی۔

☆☆☆

عائشہ کو ٹائیفائیڈ ہوگیا تھا۔ ممانی نے اسے میکے بھجوادیا تھا کہ کہیں اس کے جراثیم ان کے گھر میں نہ پھیل جائیں، ممانی اور سمیع کے روکھے رویئے نے عائشہ کو اور بھی نڈھال کردیا تھا۔

وہ بے سدھ پڑی رہتی تھی، اس کی زرد رنگت، کمزور جسم دیکھ کر سب کو تکلیف ہورہی تھی۔

"بڑے گھر اور خوبصورت لڑکے ہی سب کچھ نہیں ہوتے باجی! اب تو آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔" مہرباں نے بستر پر پڑی عائشہ کو دکھ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ممانی تو چلو نفسیاتی ہیں لیکن سمیع کو تو خیال رکھنا چاہئے تھا۔" نیلم باجی نے نگاہیں چرائیں۔

"میں نے پہلے ہی آپ کو ممانی کی عادات کے بارے میں آگاہ کردیا تھا۔ ویسے بھی سمیع میں کوئی دم تو تھا نہیں۔" وہ زچ ہوکر بولی۔

امی ابو کے ہر وقت فکرمند چہروں کو دیکھ کر اسے تکلیف ہورہی تھی۔ مہرباں اور عائشہ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے کچھ وقت سکون کا سانس لیا تھا کہ اب عائشہ کا ایک اور نیا مسئلہ ہوگیا تھا۔

نیلم کے بھی وہ ہی حالات تھے وہ اب بھی ہر آنے والے رشتے پر انکار کرتی تھی۔

"آپ نے مجھے کہا تھا نا کہ میں نے خزانے اور کوڑے میں سے کوڑے کا انتخاب کیا ہے۔ کبھی کبھی دکھنے والی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی بہت اعلیٰ اور بہترین ہوتی ہیں۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تم بہت خوش قسمت ہو جو تمہیں حیدر جیسا ہمسفر ملا۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

"سمیع کیا کہتا ہے؟ کب لے جائے گا اسے؟" اس نے دریافت کیا۔

"ظاہر ہے جب ٹھیک ہوگی تبھی لے جائے گا، کسی کوڑے کی طرح پھینک دیا ہے یہاں۔" نیلم کو ان پر سخت غصہ آیا۔

"آپ سمیع سے بات کیوں نہیں کرتیں۔"

"میں کیوں کروں۔ خود عقل نہیں اسے۔ اور یہ بھی لڑکی ہے کہ ان لوگوں کے رویوں کو دل پہ لے لیا ہے۔" باجی نے بے سدھ پڑی عائشہ کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ میں ہوں جو اس کا اتنا خیال رکھتی ہوں۔ مجھے بہت فکر رہتی ہے اس کی۔" نیلم حقیقتاً عائشہ کے لئے فکرمند تھی۔

مہرباں کو رہ رہ کر ممانی پر غصہ آرہا تھا، دل چاہ رہا تھا کہ انہیں آئینے کا اصل عکس دکھائے، انہیں زندگی کے اصل عکس سے ملوائے۔ وہ کب تک خود اپنی ذات کی خاطر دوسروں کو تکلیف پہنچائیں گی۔

باہر سے چاند نکلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ رمضان کا چاند دکھ گیا تھا۔ کل سے رمضان المبارک شروع ہورہے تھے۔

دن اور بھی سمٹنے اور مصروف ہوجانے والے تھے۔

اس نے گہری سانس لے کر باجی کو دیکھا جو عائشہ کو دوائی دینے کے لئے اٹھا رہی تھیں۔

☆☆☆

رمضان کا بابرکت مہینہ پرسکون گزر رہا تھا، وہ تینوں افراد مل کر سحری کرتے، حیدر آفس چلے جاتے تو وہ ساس بہو پورا دن عبادت میں گزار دیتیں، شام کو تھوڑا آرام کرنے کے بعد مہرباں افطاری کی تیاری شروع کر دیتی تھی۔

وہ امی کے گھر بھی چکر لگاتی رہتی تھی، عائشہ کی حساس طبیعت کی وجہ سے وہ خود بھی فکر مند رہنے لگی تھی۔ اب اسے اتنا بخار تو نہیں تھا بس کمزوری تھی۔

وہ خود بھی اپنی حالت بہتر کرنا نہیں چاہتی تھی، سب اسے سمجھاتے تھے، وہ خاموش رہتی، کوئی کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وہ ہی عائشہ ہے جو ہنس مکھ اور بے فکری ادھر سے ادھر اٹھلاتی پھرتی تھی۔

"کاش اس کے میاں اور ساس بھی تمہارے جیسے ہوتے۔" نیلم شکوہ کناں ہوئی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا باجی۔" وہ جب بھی جاتی نیلم باجی کو تسلیاں دیتی تھی۔

رمضان کا ایک عشرہ گزرا تو اس نے حیدر کے ہمراہ بازار کا رخ کیا۔ چونکہ عید گرمیوں میں ہو گی اس نے لان کے خوبصورت کڑھائی والے سوٹ خریدے تھے۔ اپنے کپڑوں کے ساتھ اس نے پھپھو اور امی کے لئے بھی سوٹ لیے تھے۔

ٹیلر کے پاس ایک لمبی لائن تھی اس نے تمام سوٹ ٹیلر کے حوالے کر دیے۔

"کام ہو گیا؟" وہ واپس گاڑی میں آئی تو حیدر نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

"جی شکر ہے، اگر کچھ دن اور لیٹ ہوتے تو ٹیلر کپڑے لیتا ہی نہیں۔" اس نے ٹشو پیپر سے چہرہ صاف کیا۔ حیدر مسکرا دیا۔

"آپ اتنی تھک گئی ہو تو افطاری باہر سے لے لیتے ہیں۔" حیدر نے مشورہ دیا۔

"نہیں! پھپھو کو باہر کی افطاری نہیں پسند۔ وہ شوگر کی مریضہ ہیں میں آدھی چیزیں بنا کر آئی ہوں باقی کی تیاری بھی ہو جائے گی۔" اس نے اطمینان سے کہا، حیدر نے سر ہلایا۔

☆☆☆

عید کا چاند کیا نظر آیا، ہر جانب ہلچل سی مچ گئی۔ وہ چاند رات کو حیدر کے ہمراہ مارکیٹ گئی، باقی تو اس کی پوری تیاری مکمل تھی، اپنے اور سب کے لئے چوڑیاں خرید کر، ٹیلر سے کپڑے اٹھائے، اور امی کے ہاں چلی آئی۔

"عائشہ ابھی میرے ساتھ چلو مہندی لگوانے۔" اس نے ڈپٹ کر کہا۔

"کیوں آپی؟" وہ بے رخی سے بولی۔

"بھئی خوشیوں کا رنگ ہے یہ، ہاتھ کھلے کھلے خوبصورت لگتے ہیں۔" مہربان نے بہلایا۔

"جب دل ہی خوش نہ ہو تو مصنوعی خوبصورتی کیسی۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی۔" مہرباں نے باقاعدہ ڈانٹا۔ وہ اسے زبردستی پارلر لے گئی تھی۔

حیدر حسب عادت ابو کے ساتھ [illegible] مصروف تھا۔ وہ دونوں دو گھنٹے بعد لوٹیں تو مہرباں کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ عائشہ خاموشی کے ساتھ کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس کی اتری صورت دیکھ کر مہرباں نے سرد سانس خارج کی۔

اس نے فیصلہ کن انداز میں اپنے فون پر سمیع کا نمبر ڈائل کیا۔ سمیع کے ہیلو بولتے ہی وہ شروع ہو گئی۔ اسے لمبے لمبے لیکچر دیے۔ اسے عائشہ کی پل پل تکلیف کا احساس دلایا، اس کے دل میں جو بھی بھڑاس تھی اس نے نکال ڈالی۔

سمیع اس کی سخت باتوں کے جواب میں کچھ بھی نہیں بولا تھا۔

"خوشی میں تو سب ساتھ دیتے ہیں، دکھ اور تکلیف کے وقت پتا چلتا ہے کہ کون اپنا ہے اور کون پرایا، آپ تو پھر بھی اس کے زندگی بھر کے ساتھی ہو۔" اس کے منہ میں جو آ رہا تھا وہ بولے جا رہی تھی۔ سمیع سے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ صحن میں صبح کی ہلکی دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھی، بخار کے بعد اسے دھوپ میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔

محلے کے بچے تیار ہو ہو کر آ رہے تھے، نیلم بچوں کی خوب تعریفیں کر کے ان کا دل خوش کر رہی تھی، وہ آنکھیں موندے ہوئے تھی۔

امی اور نیلم کچن میں مصروف تھیں، ابو گھر سے باہر تھے۔ گھر میں خاموشی ہو گئی تھی۔ اسے مہرباں کا انتظار تھا۔

"عائشہ عید کے کپڑے پہن کر تیار ہو جاؤ، یوں عید کے دن منہ خراب کر کے نہیں بیٹھتے۔" امی نے چوتھی بار اسے کچن سے آواز دی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔

کسی نے اس کے عقب سے دبے پاؤں آتے ہوئے اس کی دونوں آنکھوں پر اپنے نرم و گداز ہاتھ رکھ دیے تھے، وہ اچانک ہونے والی واردات پر چونک گئی۔

"کون ہے؟" وہ نا سمجھتے ہوئے بولی۔

"مہرباں آپی! مذاق بند کرو اب۔" اسے ایسی حرکت کی توقع مہرباں سے ہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹے اور وہ شخص اس کی آنکھوں کے عین سامنے تھا۔

"سمیع! آپ......" وہ حیرت سے بولی۔

"میرے آنے سے تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

وہ ابھی تک حیرت میں مبتلا تھی۔ خوشی کا اظہار کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

"مجھے تو بہت خوشی ہوئی۔" وہ ہنس کر بولی۔

"عید کے دن تم میلے، پرانے کپڑوں میں کیوں بیٹھی ہو بھئی؟"

"دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

"اور اب؟" اس نے استفسار کیا۔

"ابھی تیار ہو کر آتی ہوں، جب تک آپ باقی سب سے مل لیں۔" وہ چہکتے ہوئے بولی۔

عائشہ کی طرح باقی سب بھی پہلے حیرت زدہ تھے اور بعد میں خوش۔ حیدر، مہرباں اور پھپھو بھی دوپہر میں آ گئے تھے۔ مہرباں کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کی باتیں سمیع پر اتنا اثر کر گئیں ہیں۔

"صبح سویرے ہی یہاں کے لئے نکل پڑا ہوں۔" سمیع دھیمی آواز میں بولا۔

"سوری میں کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گئی تھی۔" مہرباں ندامت سے بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ مجھے اتنا برا نہیں لگا۔"

"اور ممانی؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"انہیں میں سمجھا کر آیا ہوں، وہ ناراض نہیں ہیں۔" مہرباں نے تشکر بھری سانس لی، ان دونوں کی گفتگو حیدر بھی سن رہا تھا۔

"آپ تلخ بھی ہوتی ہیں؟" حیدر نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

"جی بالکل۔" وہ ہنس کر بولی۔

عید آئی تھی تو غلط فہمیوں کی دھول بھی صاف ہو گئی تھی۔ ہر چہرے پر طمانیت و خوشی بکھری ہوئی تھی، یہ عید اس گھر کے لئے واقعی میں بہت خاص تھی۔

......☆......

کائنات غزل

افسانہ

پہلا رمضان

"مبارک ہو مانو آپی! چاند نظر آگیا۔" ببلو اس کے کان کے پاس آکر تقریباً چیخا تھا۔ مانو نے کانوں سے ہینڈ فری نکالی اور اسے ایک دھپ رسید کیا، وہ لڑھکتا ہوا دور جا کر بیٹھ گیا۔

"شاہد آفریدی نے چھکا مارا لیکن بال باؤنڈری وال سے ٹکرا کر پلٹ آئی۔ یوں چھکا چوکے میں تبدیل ہوگیا۔" منو نے اندر آتے ہوئے کمنٹری کرنا ضروری سمجھا۔

صالحہ بیگم تخت پر بیٹھی مٹر چھیلتی جا رہی تھیں۔ ساتھ میں ریڈیو سے آتی نعت ہم مدینے میں تنہا نکل جائیں گے...... کے ساتھ آواز ملانے کی کوشش میں ہلکان



ہو رہی تھیں۔ سانس کی بیماری کی وجہ سے ان کی لے ٹوٹ جاتی۔ آخر میں تنگ آکر انہوں نے ریڈیو ہی بند کر دیا۔

"اماں! مبارک ہو چاند نکل آیا۔" ببلو کی اندر دال نہ گلی تو آکر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"ارے ہٹ پیچھے کام کرنے دے مجھے جب دیکھو کیکڑا بنا رہتا ہے جان کو چمٹ جاتا ہے ہٹ پرے۔" وہ پیچھے ہٹ گیا مگر بولنے سے باز نہ آیا۔

"اماں! کل سحری میں کیا بناؤ گی؟" بڑے اشتیاق سے کیے گئے سوال پر ایک دھموکا پڑا۔

"ماں...... تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ قسم سے ماں میں بڑا ہو جاؤں تو میں ہی تمہارے کام آؤں گا۔" وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح اپنے جسم کو جھٹکا دے کر بولا تو صالحہ بیگم نے جوتی ٹٹولی۔ وہ تیر کی طرح دروازہ پار کر گیا۔

"کم بختوں کو کسی حال میں چین نہیں ہے۔ ایک گانوں سے چپکی رہتی ہے۔ دوسرا کرکٹر بنا پھرتا ہے تو تیسرا اپنے آپ کو کسی فلم کا ہیرو سمجھتا ہے۔ آلینے دو باپ کو نہ سب کی اکھٹی دھنائی کروائی......" وہ من ہی من میں بڑبڑا رہی تھیں۔ تمام مٹر چھل گئے تو کچرا سمیٹ کر مٹر کا چھلکا لیے اٹھ گئیں کہ ابھی اشتیاق صاحب آتے ہوں گے تھیلا پکڑ لے کر ان کے آنے سے پہلے قیمہ بھون کے مٹر ڈالنے تھے۔

"رمضان مبارک ہو بھئی بچوں۔" اشتیاق صاحب آج کچھ جلدی گھر آگئے تھے۔

"اماں! نظر نہیں آ رہیں لوگوں کی۔" صالحہ بیگم روز ان کے وقت پر چوٹی کیے آنکھوں میں سرمہ ڈالے تخت پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرتی تھیں۔ آج ان کی جگہ خالی دیکھ کر انہوں نے بچوں سے سوال کیا۔ جو باپ کے احترام میں تمام لغویات چھوڑ کر شرافت کا لبادہ اوڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔

اشتیاق صاحب جتنے نرم خو تھے، صالحہ بیگم اتنی ہی گرم مزاج تھیں۔ وہ بچوں پر بے جا سختی کے قائل نہ تھے لیکن ان کا رعب بہت تھا۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ تگی بندی سرکاری ملازمت کے علاوہ پارٹ ٹائم جاب بھی کرتے تھے۔

"آگئے آپ......" صالحہ بیگم کا کچن سے چہرہ نمودار ہوا۔ وہ ہاتھ پونچھتی تخت پر آبیٹھیں۔ بچے جو اشتیاق صاحب کی لائی ہوئی تھیلیوں میں گھسے ہوئے تھے اماں کو دیکھ کے ہوا ہو گئے۔ منو کا پاؤں جلدی میں چیکو کی تھیلی میں اٹکا۔ تھیلی کے ساتھ وہ بھی زمین پر آگرا، سارے چیکو تخت سے نیچے، صالحہ بیگم ناک پر انگلی رکھے منہ کھولے ہونقوں کی طرح دیکھ رہی تھیں۔

"کمبختوں ذرا جو صبر کر لو، بھوکوں کی طرح پل جاتے ہیں جیسے کبھی کھانے کو نہ ملا۔" وہ یکدم منو پر چڑھ دوڑیں۔

اشتیاق صاحب اٹھ کر چیکو سمیٹنے لگے۔ "ارے کھانے دیا کرو بیگم! انہی کے لیے تو لاتا ہوں۔"

"بس آپ کی انہی باتوں نے بگاڑ دیا ہے انہیں میں نے کھانے سے کبھی منع نہیں کیا لیکن تمیز تہذیب سے تو کھائیں۔ سارا دن میرا اسرا اسی طرح کھاتے ہیں، میں شکایت نہیں کرتی تو اس کا مطلب میں ہی بری ٹھہری۔" وہ روہانسی ہو گئیں۔

"اب دیکھیں چاند نکل آیا ہے نہ کسی کو نماز کی ہوش نہ اللہ اللہ کی ایسی بے لگام اولادیں ہیں۔ وہ ٹی وی کے آگے بیٹھا ہے تو بیٹھا ہی رہا وہ گانے سن رہی ہے تو سنے ہی چلے جا رہی ہے۔ ذرا تو رمضان کا خیال کریں۔" ان کا غصہ بھی بجا تھا۔

"لیکن بیگم! طنز طعنوں سے اولاد سنورتی تھوڑی ہے انہیں آرام سے پیار سے سمجھائیں گے تو سمجھ جائیں گے۔"

"معاف رکھیں میاں مجھے تو، میرے ہاتھ کوئی لگے تو میں کچھ سمجھاؤں نا نامراد اولادوں نے سمجھنا سمجھانا کیا ہے الٹا خون ہی جلاتا ہے۔" وہ غصے میں

ان کے پاس سے بھی اٹھ گئیں۔ اشتیاق صاحب سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ واقعی انہوں نے کبھی بچوں کو ایک جگہ بیٹھ کر نہیں سمجھایا۔ اذان کی آواز پر وہ سر پر ٹوپی جماتے ہوئے اٹھ گئے اور راستے میں واپس گھر آنے کا لائحہ عمل طے کرنے لگے۔

"روزہ کس کس نے رکھنا ہے بھئی صبح؟" وہ تراویح سے فارغ ہو کر گھر آنے کے بعد تخت پر بیٹھنے کے بجائے بچوں کے کمرے میں چلے گئے۔

تینوں نے ہی حامی بھری۔ "اچھا تو تراویح کس کس نے پڑھی؟" اب کے تینوں نے منہ چھپا لیے۔

"فجر کی نماز میں شدید نیند آ رہی ہوتی ہے بابا! اور ظہر میں بھوک سے برا حال ہوتا ہے اس لیے پڑھی نہیں جاتی۔ عصر میں تو کمزوری اتنی ہو جاتی ہے کہ اٹھا ہی نہیں جاتا اور مغرب...... کھانا پیٹ میں پڑتے ہی چکر آنے لگتے ہیں۔ صحیح کہا نا میں نے؟" بہت ہی پیار سے وہ بچوں سے مخاطب تھے۔ اب کے تینوں باپ کا موڈ دیکھتے ہوئے زور و شور سے گردن ہلا رہے تھے۔

"کتنی غلط بات ہے یہ کہ روزہ رکھنے کا شوق تو بہت ہے ہمیں لیکن روزے کو نبھانے کا شوق نہیں ہے۔ ایک بات بتاؤ اگر ایک قمیض کے لیے کپڑا خریدا جائے اور اسے کاٹ کر ایسے ہی چھوڑ دیا جائے نہ اس کی آستینیں لگائی جائیں نہ گلا بنایا جائے تو وہ قمیض کسی کام کی ہے؟" اسی طرح جس روزے میں نماز نہ پڑھی جائے وہ فاقہ ہے روزہ نہیں۔ اللہ پاک نے روزے کا اجر اپنے ذمہ لیا ہے اور اگر اسے ادھورا چھوڑ دیں گے تو روزہ کہاں سے کہلائے گا اور تراویح روزے کی اولین عبادت ہے۔ ہمارے نبی پاک کا ارشاد ہے: "اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے کو فرض کیا اور اس کے قیام یعنی تراویح کو سنت کیا۔" یعنی روزے کے ساتھ تراویح کا واضح حکم ہے اور اس کے علاوہ ایک اور بات بتاؤں حدیث پاک میں آتا ہے۔ "روزہ ڈھال ہے آدمی کے لیے جب تک اس کو پھاڑ نہ ڈالے۔" اس لیے آدمی کو چاہیے کہ زبان سے کوئی فحش بات یا جہالت کی بات نہ کرے۔ تمسخر یا جھگڑا وغیرہ نہ کرے اگر کوئی جھگڑے تو اس سے کہہ دے کہ میرا روزہ ہے۔ اسی طرح کسی لہو لعب وغیرہ میں مشغول نہ ہو جیسا کہ ٹی وی یا گانے وغیرہ۔ جھوٹ اور غیبت سے بچے۔ یعنی روزہ صرف پیٹ کا نہیں ہوتا۔ کان، آنکھ، زبان، دل، دماغ ہر عضو کا روزہ ہوتا ہے۔ آئی سمجھ؟" انہوں نے تینوں سے سوال کیا۔

تینوں شرم کے مارے گردن نہ اٹھا سکے۔ ببلو کی تو باقاعدہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

اور کمرے کے دروازے پر کھڑی صالحہ بیگم کے آنسو بھی دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے کہ ان کی خود کی عصر کی نماز اکثر افطاری بنانے میں نکل جاتی تھی۔ اسی لیے پیارے نبی نے سادگی کا حکم دیا ہے۔ صرف بچے ہی نہیں بگڑے ہوئے بڑے بھی بگڑ چکے ہیں۔

روزے وہ بھی پابندی سے رکھتی تھیں لیکن رمضان کی خاطر کبھی اپنے پسندیدہ ڈرامے کو نہیں چھوڑا۔ یعنی روزے میں چھید......

اکثر پڑوسنوں سے ایک دوسرے کی برائی ایک اور چھید......

نہ جانے کتنے چھید تو ان کو خود اپنے روزے میں نظر آنے لگے۔

اور اللہ کو تو مکمل روزہ چاہیے ہوتا ہے۔

اف......

آج کیسی آنکھیں کھلی تھیں ان کی......

انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی پچھلی باتوں پر توبہ کر لی۔ کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ پکی توبہ تو رب تعالیٰ ضرور قبول کرتے ہیں اور اس مہینے میں رحمت الٰہی خاص برستی ہے۔ جو بھی معافی مانگنا چاہے اسے ضرور معافی ملتی ہے۔

انہیں ایسا لگا یہ ان کا پہلا رمضان ہو گا جس کے روزوں میں شاید چھید نہ ہو۔

......☆......

مکمل ناول

دوسرا حصہ

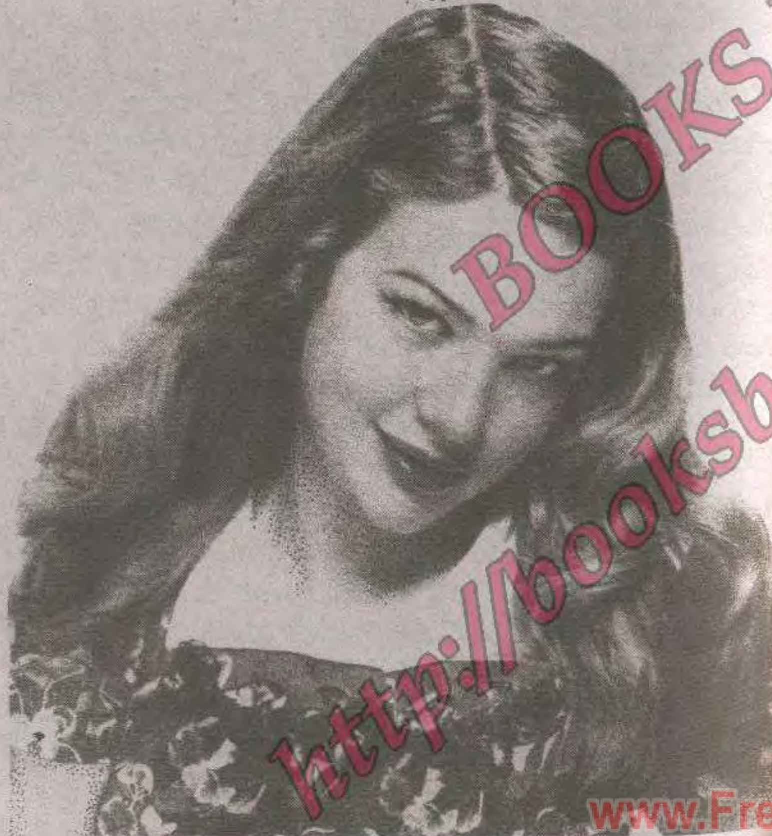
میرا دل میرا مسافر

"اور راستے میں جو بھی میوزیم آئے گا وہ بھی دیکھنے کا ہے۔ کیا میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں۔" علی نے شرارتی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اب وہ دونوں سامنے کافی بار میں جا رہے تھے۔

کیتھی اس کی کلاس فیلو تھی مگر اب بہت اچھی دوست بن گئی تھی۔ اس کی زندگی میں اتنی مشکلات تھیں کہ کبھی کبھی علی کو حیرت ہوتی تھی کہ وہ اتنے خوشگوار موڈ کے ساتھ روزانہ کالج کیسے آجاتی تھی مگر وہ ایسی ہی تھی



ہنستی، مسکراتی اور زندگی سے بھرپور لڑکی۔ صرف علی ہی جانتا تھا کہ اس حسین چہرے کے پیچھے ایک اداس چہرہ چھپا ہوا ہے۔ کیتھی کے والد اور والدہ دونوں کی علیحدگی ہو چکی تھی اور یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی اکثر مغرب معاشروں میں ایسا ہی ہوتا ہے بلکہ جن لوگوں کو ایک ساتھ رہتے ہوئے کئی سال گزر جاتے ہیں ان پر مغربی والے بہت حیرت کا اظہار کرتے ہیں اور بعض پر تو فلمیں تک بنا دی جاتی ہیں اس لیے ایک ساتھ رہنا تو عجیب سی بات ہو سکتی ہے مگر علیحدہ رہنا بالکل ایک نارمل سی بات سمجھی جاتی ہے۔ کیتھی کے والد اور والدہ دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ کیتھی اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ رہتی تھی اور ان کا سلوک کیتھی کے ساتھ روایتی سوتیلی ماؤں جیسا ہی تھا۔ علی سمجھتا تھا کہ لوگوں کی سوچ بدل گئی ہے مگر کیتھی کی سوتیلی ماں کی ظلم کی داستانیں سن کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ حالات ضرور بدلے ہیں مگر لوگوں کی سوچ ویسی کی ویسی ہے۔ اس کی ماں اکثر اس کا ناشتہ گول کر جاتی تھی۔ اس لیے وہ بغیر کچھ کھائے پیئے ہی کالج آتی تھی۔ علی کا اس سے پہلا ٹکراؤ کالج کینٹین میں ہوا تھا۔ جب وہ اپنا پسندیدہ برگر کینٹین میں بیٹھ کر کھا رہا تھا۔ ایک دم اس کی نظر کیتھی پر پڑی جو للچائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ علی پہلے تو اسے نظر انداز کرتا رہا مگر اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی التجا کو وہ زیادہ دیر تک نظر انداز نہ کر سکا اور ایک اور برگر منگوا کر اسے دے دیا۔ وہ



جس طریقے سے وہ برگر کھا رہی تھی اسے دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ خالی پیٹ ہے۔ برگر کھانے کے بعد کیتھی نے علی کا شکریہ ادا کیا اور اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ علی نے اس کی دوستی کی پیشکش کو خوش دلی سے قبول کیا اور یوں ان کے درمیان دوستی کا آغاز ہو گیا۔ علی اتنا تو جانتا تھا کہ کیتھی کافی ذہین ہے اور اب تک کی تمام تعلیم اس نے اسکالر شپ پر حاصل کی ہے۔ مگر اس کی زبانی اس کی ذاتی زندگی کے حالات جان کر اسے بہت دکھ ہوا تھا۔ کیتھی بہت شوخ مزاج کی حامل لڑکی تھی وہ اکثر باتوں ہی باتوں میں علی کے اتنے قریب ہو جاتی تھی کہ علی کو اسے ٹوکنا پڑتا تھا۔ وہ مغربی معاشرے کا فرد ضرور تھا لیکن بحیثیت مسلمان وہ اپنی حدود و قیود سے آگاہ تھا اور ان حدود سے باہر نہ وہ خود نکلتا تھا۔ نہ کسی کو اس کی اجازت دے سکتا تھا۔ وہ اکثر علی کے کاندھے پر سر رکھ کر جی بھر کے آنسو بہایا کرتی تھی۔ علی ایک دوست کی طرح اس کی ڈھارس بندھایا کرتا تھا۔ وہ کسی معصوم بچے کی طرح علی کی آغوش میں پناہ ڈھونڈا کرتی تھی۔ علی نہیں جانتا تھا کہ ایسے ہی کسی لمحے میں سائرہ اسے اور کیتھی کو ایک ساتھ دیکھ لے گی اور پھر وہ ہو جائے گا جو ہونا نہیں چاہیے تھا۔ وہ ان سب باتوں سے بے خبر کیتھی کے ساتھ کافی پینے کے بعد اب ایک میوزیم میں چلا گیا تھا۔ جہاں کیتھی کی شوخ مزاجیاں عروج پر تھیں۔ وہ دونوں میوزیم کے مختلف حصوں میں اب باقاعدہ طور پر تصویریں بنوا رہے تھے۔ دیگر مغربی ملکوں کی طرح آسٹریلیا کے مختلف شہروں میں جگہ جگہ بنے میوزیم ہمیشہ سے لوگوں کے شوق اور دلچسپی کا محور رہے ہیں اور دن کا کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا جب یہاں پر لوگوں کی کثیر تعداد نہ ہو۔ بعض میوزیم تو بہت وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں، اس میوزیم میں اس وقت بھی لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ علی اور کیتھی چونکہ آرٹ کے طالب علم تھے اس لیے وہ دونوں میوزیم کے آرٹ سیکشن میں موجود تھے۔ علی کے دل میں اس لمحے یہ خواہش ابھری تھی کہ کاش اس وقت سائرہ بھی اس کے ساتھ ہوتی مگر وہ کیتھی کے سامنے برملا اپنی خواہش کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اب وہ تھک چکا تھا اور واپس جانا چاہتا تھا مگر کیتھی کا خیال تھا کہ اب کسی سنیما میں اچھی سی فلم دیکھنے کے بعد اس شام کا یادگار اختتام کرنا چاہیے مگر علی نے اس سے معذرت کر لی۔ وہ اب مزید وقت گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ کیتھی بہت خوش لگ رہی تھی۔ علی کے ساتھ گزارے گئے لمحات اس کی زندگی کے یادگار ترین لمحات تھے۔ اس کے دل نے چپکے سے علی کو بہت اونچا مقام بخش دیا تھا۔ وہ اب کسی صورت علی کو خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ علی اس سارے معاملے سے بے خبر محض ہمدردی میں ہر وقت علی کی دلجوئی میں لگا رہتا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی یہ ہمدردی اسے اس کی محبت سے بہت دور لے جا رہی ہے اور غلط فہمی کی یہ دیوار وقت کے ساتھ ساتھ مزید اونچی ہوتی جا رہی ہے۔

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں ایرک!“

سائرہ نے سخت بیزاری کے عالم میں اپنے موبائل پر آنے والے ایرک کے اس پیغام کو دیکھا جسے پڑھ کر اس کا اچھا خاصا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ چار دن بعد اس کی اور ایرک کی باقاعدہ طور پر شادی ہو جانی تھی اور اس قیامت کے آنے سے پہلے وہ ایرک سے ملنا تو کیا اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اس پیغام کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اپنی پینٹنگ مکمل کرنے میں مصروف رہی۔

”تم آج شام چھ بجے سڈنی اوپرا ہاؤس میں مجھ سے ملنے آ رہی ہو۔“

ایک بار پھر ایرک کا پیغام پڑھ کر اسے شدید غصہ آیا۔ اس نے سخت غصے کے عالم میں اپنے موبائل کو گھور کر دیکھا اور اسے آف کر دیا۔ اسے ایرک کے ساتھ ساتھ علی کے رویے نے بھی بہت دکھ پہنچایا تھا۔

اسے ہمیشہ علی کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت نظر آتی تھی مگر کیتھی کے ساتھ اسے اتنا قریب دیکھ کر سائرہ کو اپنے دل کی دھڑکنیں منجمد ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ علی اسے اپنے لیے ایک امید کی کرن نظر آتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ علی ہی ہے جو اسے ایرک جیسے شیطان سے بچا سکتا ہے۔ اس کو اپنی زندگی کے اندھیروں میں روشنی کی ہلکی سی کرن علی کی شکل میں نظر آنی شروع ہوئی تھی مگر علی تو اسے بیچ راستے میں ہی چھوڑ گیا تھا۔ وہ اس کے سارے خوابوں کو آگ لگا گیا تھا۔ وہ اب صرف اس قیامت کے آنے کا انتظار کر رہی تھی جس کے بعد اس نے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا تھا مگر اس کی ماں ابھی زندہ تھی اور اس کے ہوتے ہوئے سائرہ کی ایک غیر مسلم سے شادی نہیں ہو سکتی تھی اس لیے اس کی واحد امید اب اس کی ماں ہی تھی۔

☆......☆

عروہ کے ساتھ شادی موسیٰ کے لیے ایک امتحان ثابت ہوئی تھی۔ شادی کے دوسرے ہی دن اس کے والد نے اپنی عدالت میں اسے طلب کر لیا تھا۔ ملک حیات کو اپنے ایک دوست کے ذریعے موسیٰ اور عروہ کی کورٹ میرج کی ساری تفصیلات معلوم ہو گئی تھیں۔ وہ ملک حیات جنہیں اپنے حسب نسب پر بہت غرور تھا۔ ان کے بیٹے نے ایک معمولی سپروائزر کی گھر سے دھتکاری ہوئی بیٹی کے ساتھ شادی کر کے ان کی ساری زندگی کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ انہیں لگتا تھا کہ وہ لمحوں میں بوڑھے ہو گئے ہیں موسیٰ نے جب مائدہ کا انتخاب کیا تھا۔ تو انہیں اپنے بیٹے کے اس انتخاب سے بہت خوشی ہوئی تھی وہ سمجھتے تھے کہ موسیٰ بھی ان کی طرح شادی کے معاملے میں نام و نسب کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ حالانکہ تب بھی موسیٰ صرف مائدہ کی شخصیت سے ہی متاثر ہوا تھا۔ اس کے خاندان کے بارے میں تو اسے بہت بعد میں پتہ چلا تھا۔ ملک حیات موسیٰ کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے مگر اب عروہ نے ان کے سارے ارمانوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ انہیں موسیٰ سے زیادہ اس لڑکی پر غصہ تھا۔ جس نے ان کے بیٹے پر نہ جانے کون سا جادو کر دیا تھا جو اس سے شادی کر بیٹھا تھا۔ اس نے مائدہ جیسی لڑکی کو چھوڑ کر اس معمولی سی لڑکی کو عمر بھر کا ساتھی بنا لیا تھا جوانی کے اس منہ زور عشق کے گھوڑے کو کیسے قابو کرنا تھا یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے مگر اس سے پہلے انہیں اپنے اس بیٹے سے ملنا تھا، جس نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ موسیٰ بھی اپنے والد کے غصے سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ کوئی انتہائی قدم اٹھائیں گے مگر یہ سب اس کی توقع سے ذرا جلدی ہو گیا تھا۔ وہ اپنے والد کی طرف سے سنائی جانے والی سزا کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا مگر یہ سب اس کی توقع کے مطابق ہی ہوا تھا۔ ملک حیات نے اسے جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اس نے اپنے والد کو بتا دیا تھا کہ وہ جائیداد تو چھوڑ سکتا ہے مگر عروہ کو کسی صورت خود سے الگ نہیں کر سکتا، اس نے سیدھے اور صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ اس نے عروہ کو ہمیشہ کے لیے اپنایا ہے۔ وہ اسے بیچ راستے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ بھی انہی کا بیٹا تھا جو بغیر کسی ڈر اور خوف کے ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ ملک حیات نے موسیٰ کو ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ زندگی بھر اس کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ موسیٰ کی والدہ چیختی چلاتی رہ گئی تھیں مگر موسیٰ ہمیشہ کے لیے اپنا گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ملک حیات ایک زیرک آدمی تھے وہ جان گئے تھے کہ موسیٰ پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنا فضول ہے۔ ان کا بیٹا ضد میں ان سے دو چار ہاتھ آگے ہی ہے۔ اب انہیں عروہ کو موسیٰ کی زندگی سے نکالنا تھا اور اس طریقے سے نکالنا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ انہیں اس لمحے عروہ سے بے انتہا نفرت محسوس ہوئی تھی جس نے ان کا جوان اور اکلوتا بیٹا ان سے

چھین لیا تھا۔ وہ چاہتے تو عروہ کو مروا بھی سکتے تھے مگر ایسا کرتے وقت ان کا اپنا بیٹا بھی ہمیشہ کے لیے ان کے ہاتھ سے نکل سکتا تھا۔ اس لیے انہیں یہ کام نہایت احتیاط سے کرنا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا بیٹا ایک دل پھینک اور تھوڑی سی شکی طبیعت کا مالک ہے انہیں اپنے بیٹے کی اسی کمزوری کو اپنا ہتھیار بنانا تھا۔ انہیں ہر صورت اپنا بیٹا واپس چاہیے تھا اور اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ کسی حد تک بھی جانے کو تیار تھے۔ انہیں بہت مہارت سے اپنے پتے کھیلنے تھے۔ جو بھی تھا ان کا بیٹا ان سے کسی صورت نہیں جیت سکتا تھا۔ اپنا گھر چھوڑنے کے بعد موسیٰ کچھ دن بہت ڈسٹرب رہا تھا۔ وہ اپنی ماں سے فون پر بات تو کر لیتا تھا مگر اسے دکھ ضرور تھا کہ اس کے والد نے کیسے کچھ ہی پل میں اسے بیگانہ بنا ڈالا تھا۔ یوں ظاہر کیا تھا کہ جیسے وہ ان کا کچھ نہ لگتا ہو۔ اس کی پریشانی کے ان دنوں میں عروہ ہر وقت موسیٰ کی دلجوئی میں لگی رہتی تھی۔ عروہ کی پوری کوشش تھی کہ موسیٰ کی ذہنی کیفیت نارمل رہے تاکہ وہ ہر بار کی طرح اس بار بھی امتحانات میں شاندار کامیابی حاصل کر لے۔ موسیٰ کو عروہ کی یہ فکر مندی، ضرورت سے زیادہ اس کا خیال رکھنا سب بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ عروہ کو ایک بہترین زندگی کا تحفہ دینا چاہتا تھا مگر اسے آگے آنے والے حالات بہت مشکل نظر آرہے تھے۔ عروہ کی محسن سے بھی اب بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اسے اپنے بھائیوں کی طرح ہی سمجھتی تھی اور جب محسن اور موسیٰ دونوں پیپر دینے جاتے تھے تو اس کا رواں رواں ان دونوں کی کامیابی کے لیے دعا کرتا تھا۔ پیپرز ختم ہونے کے بعد جب نتیجہ آیا تو موسیٰ اور محسن دونوں نہایت اچھے نمبروں سے کامیاب رہے تھے۔ موسیٰ نے ایک بار پھر اپنی پوزیشن کو برقرار رکھا تھا اور وہ اپنی کامیابی کو صرف اور صرف عروہ کی قسمت قرار دیتا تھا۔ اس کی شادی کی خبر اب اس کے تمام ملنے والوں میں پھیل چکی تھی۔ اس کا ارادہ اپنی شادی کی خوشی میں اپنے دوستوں کی دعوت کا تھا۔ اسے یونیورسٹی میں مستقل بنیادوں پر پڑھانے کی جو پیشکش ہوئی تھی، اس نے وہ مستقل بنیادوں پر قبول کر لی تھی۔ محسن اب ملک سے باہر جانا چاہتا تھا اور اس کی تیاریاں مکمل تھیں۔ وہ اب عروہ اور موسیٰ کا مہمان تھا اور اپنا مکان موسیٰ کو گفٹ کر دیا تھا۔ موسیٰ اسے مکان کی رقم دینا چاہتا تھا مگر محسن ابھی کسی رقم کو لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ان دنوں عروہ کو اپنے جسم میں چند تبدیلیوں کا احساس ہوا۔ ڈاکٹر سے ماں بننے کی تصدیق کے بعد وہ تو جیسے ہواؤں میں اڑتی پھرتی تھی۔ یہ احساس ہی اس کے لیے بہت خوب صورت تھا کہ موسیٰ کی محبت کی نشانی اس کے وجود میں سانسیں لینے لگی ہے۔ موسیٰ اب عروہ کا اور زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔ وہ عروہ کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا مگر اسے پھر بھی لگتا تھا کہ عروہ اس سے خوش نہیں ہے اس کی آنکھوں میں اداسی کے کچھ رنگ ہمیشہ کے لیے ٹھہر گئے تھے اور موسیٰ جانتا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو یاد کرتی ہے جنہوں نے اس کی خبر تک نہیں لی۔ اس کا چند ایک بار ارادہ بنا تھا کہ وہ عروہ کو لے کر اس کے گھر والوں کے پاس جائے مگر اپنی پچھلی بے عزتی وہ ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ اس لیے اس میں ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ دوبارہ سے اس کے گھر والوں کے پاس جائے۔ موسیٰ کا عروہ کے چھوٹے بھائی سے رابطہ رہتا تھا۔ وہ اس سے گھر والوں کی خیریت دریافت کرتا رہتا تھا۔ ایک دن اس کے بھائی نے ہی موسیٰ کو عروہ کے والد کے انتقال کی خبر سنائی۔ موسیٰ کو یہ خبر سن کر بہت افسوس ہوا۔ وہ جیسے بھی تھے اس کے والد تھے اور اب ہمت کر کے اس نے عروہ کو بھی یہ خبر سنائی تھی۔ وہ خود میں اتنی ہمت نہیں کر پا رہا تھا کہ عروہ کو یہ افسوس ناک خبر سنائے۔ اتنے مہینے عروہ کے ساتھ رہتے ہوئے وہ اتنا تو جان گیا تھا کہ عروہ اپنے گھر والوں سے بہت محبت کرتی تھی۔ اپنے والد کے اس قدر برے سلوک کے باوجود وہ ان کا نام ابھی بھی اتنی ہی محبت سے لیتی تھی اور نفرت تو

شاید موسیٰ کو بھی اپنے باپ سے نہیں ہوئی تھی۔ وہ عروہ کو بغیر کچھ بتائے اپنی گاڑی میں بٹھا کر عروہ کے گھر لے آیا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ عروہ گھر کے اندر نہیں جانا چاہتی تھی مگر موسیٰ اسے پکڑ کر گھر کے اندر لے گیا تھا۔ یہ عروہ کا اپنا گھر تھا۔ وہی گھر جہاں کے در و دیوار اس کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ گھر کے ایک ایک کونے سے اس کی تلخ و شیریں یادوں کی بیل لپٹی ہوئی تھی۔ یہ وہی گھر تھا جہاں سے اسے بہت بے عزت کر کے نکالا گیا تھا۔ عزت سے اپنے گھر واپس آنے کے لیے وہ کتنا تڑپتی تھی۔ گھر کے مکین جن سے وہ کوشش کے باوجود بھی کبھی نفرت نہیں کر پائی تھی روزانہ ہی اس کے خوابوں میں دستک دیتے تھے۔ وہ ان لوگوں سے نفرت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو اپنے باپ سے بھی نفرت نہیں کر سکی تھی۔ بہت دنوں بعد اس نے گھر کی دہلیز کو پار کیا تھا۔ اس لمحے اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ اس بار گھر کی فضا بہت سوگوار تھی۔ آنسوؤں، آہوں اور سسکیوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ گھر کے صحن میں ایک چارپائی پڑی تھی۔ جس کے اردگرد اس کی ماں، بہنیں اور بھائی سمیت دیگر رشتے دار بیٹھے رو رہے تھے۔ اس نے موسیٰ کا ہاتھ بہت مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ پھر نہ جانے اس کے اندر اتنا حوصلہ کیسے آگیا اس نے موسیٰ کا ہاتھ چھوڑا اور روتے ہوئے جا کر اپنی ماں کے گلے لگ گئی۔ اس کی بہنیں بھی اس کے ساتھ مل کر رونے لگیں۔ اس کی نظروں کے سامنے کفن میں لپٹا وجود اس کے باپ کا تھا۔ وہی باپ جس نے عروہ پر ظلم کی انتہا کر دی تھی جس کے ساتھ اس کی کوئی خوشگوار یاد وابستہ نہیں تھی۔ مگر باپ کو ایسے بے حس و حرکت پڑا دیکھ کر اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اپنے باپ کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب اس کا باپ اسے نہیں دھتکارے گا۔ موسیٰ ایک طرف بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کے باپ کے مردہ وجود کو قبرستان میں لے جا کر دفنا دیا گیا۔ سراج دین کی زندگی کے سفر کا اختتام ہو گیا تھا۔ عروہ دوبارہ سے اپنے گھر واپس آگئی تھی۔ موسیٰ نے اسے کچھ دنوں تک اس کے گھر والوں کے پاس ہی رہنے دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عروہ غم کی ان گھڑیوں میں اپنے گھر والوں سے دور رہے۔ چند دنوں بعد عروہ واپس تو آگئی تھی مگر اب اس کی پریشانی اور بڑھ گئی تھی۔ اپنی ماں کی زبانی اپنے گھر کے حالات کا سن کر اسے بہت افسوس ہوا تھا۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ عروہ ان لوگوں کی معاشی طور پر کچھ مدد کرے۔ عروہ نے فی الحال اپنی ماں کو کچھ رقم دی تھی تاکہ وہ گھر کی گاڑی کو بہتر طور پر چلا سکے مگر وہ جانتی تھی کہ جس قسم کے اس کے گھر کے حالات تھے ان میں یہ رقم اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر تھی۔ وہ ایک مخصوص حد سے زیادہ اپنے گھر والوں کی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ موسیٰ کے معاشی حالات اس سے پوشیدہ نہیں تھے۔ وہ جو کر رہا تھا اپنی محنت سے کر رہا تھا۔ عروہ کے کہنے پر وہ اس کے گھر والوں کی مدد کر بھی دیتا مگر وہ اس پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ عروہ کی ماں کی خواہش تھی کہ عروہ جلد از جلد اپنی چھوٹی بہن کی نوکری کی موسیٰ سے بات کرے تاکہ اس کے گھر میں مستقل بنیادوں پر کسی کے روزگار کا آغاز ہو۔ عروہ نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ موسیٰ کے بجائے محسن سے اپنی بہن کی نوکری کی بات کرے۔

محسن کے بیرون ملک جانے میں ابھی کچھ دن تھے۔ محسن کے کچھ فیملی ممبرز بہت مشہور کاروباری اداروں کے مالک تھے۔ ویسے تو موسیٰ کے خاندان کا بزنس بھی بہت وسیع تھا مگر عروہ موسیٰ سے یہ بات کر کے اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ محسن سے بات کرنے میں اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا وہ اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ موسیٰ کو اس بات کا پتا چلے۔ اسے جلد از جلد محسن سے بات کر کے اپنا

مسئلہ حل کرنا تھا کیوں کہ اگر وہ بیرون ملک چلا جاتا تو پھر اس کا سارا منصوبہ خاک میں مل جاتا۔ موسیٰ کی غیر موجودگی میں اس نے ایک دوبار محسن سے بات کرنا چاہی مگر ہر بار جملے اس کے حلق میں ہی اٹک جاتے تھے۔

موسیٰ ان دنوں اپنی تصویروں کی نمائش کے سلسلے میں بہت زیادہ مصروف رہتا تھا۔ وہ اس نمائش میں تمام نامی گرامی آرٹسٹوں کو مدعو کرنا چاہتا تھا اور اس کا افتتاح ملک کی معروف سیاسی شخصیت سے کروانا چاہتا تھا۔ اس نے عروہ کی بھی ایک بہت خوب صورت تصویر بنائی تھی اور اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کی زندگی کی بہترین تصویر ہے۔ موسیٰ کی اس قدر شدید محبت کو دیکھ کر عروہ بہت ڈر جایا کرتی تھی وہ اپنے جذبوں کا بہت کھل کر اظہار کرتا تھا۔ اس کی وارفتگی دیکھ کر عروہ کو خود پر رشک آتا تھا۔ محسن اکثر عروہ کو موسیٰ کے افیئرز کے قصے سنایا کرتا تھا اور عروہ کو وہ محسن کی بنائی ہوئی من گھڑت باتیں ہی لگتی تھیں۔ شادی کے بعد موسیٰ نے کسی لڑکی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا اور عروہ خود سے زیادہ موسیٰ پر بھروسہ کرتی تھی۔ اس نے موسیٰ کی آنکھوں میں صرف اور صرف اپنے نام کا عکس دیکھا تھا۔ اس لیے محسن کی ان باتوں کو وہ کبھی اہمیت نہیں دیتی تھی۔

اس روز بھی موسیٰ رات گئے تک گھر نہیں آیا تھا۔ اس نے عروہ کو فون پر بتا دیا تھا کہ اسے دیر ہو جائے گی۔ عروہ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ موسیٰ اکثر ہی رات گئے گھر آتا تھا۔ عروہ کے لیے بہترین موقع تھا کہ وہ محسن سے مکمل بات کر کے اپنی بہن کی نوکری کا بندوبست کرے۔ اسے اپنے گھر کی غربت کا بہت احساس تھا اور اگر گھر والوں نے اس پر بھروسہ کر کے اسے اپنا سمجھ کر اس سے اپنے دل کی بات کی تھی تو اسے بھی اب ان کا مان نہیں توڑنا تھا اور کسی نہ کسی طرح اپنی بہن کی نوکری کا انتظام کرنا تھا۔

عروہ نے کافی کے دو کپ بنائے اور محسن کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ محسن اس وقت اپنے کمپیوٹر پر بیٹھا کچھ کام کر رہا تھا۔ جب عروہ کافی کے دو کپ اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی اور کپ میز پر رکھنے کے بعد اس نے دروازہ بند کر لیا۔ عروہ کو دیکھتے ہی محسن اپنی جگہ سے اٹھا اور وہ کافی کا کپ لے کر دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا مگر اس بار اس نے کمپیوٹر بند کر دیا تھا اور مسکراتی نظروں سے عروہ کی طرف دیکھنے لگا۔ عروہ بھی اپنا کپ لے کر اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

"بھابھی! آپ اس وقت؟ خیریت ہے؟ وہ پرنس رومیو نہیں آیا ابھی تک؟" محسن کافی کے چسکے لیتے ہوئے اس سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔

"جی خیریت ہی ہے محسن بھائی! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔" عروہ نے سر جھکائے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔ یہ سب کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"بھابھی! کیا ہوا سب ٹھیک تو ہے؟" محسن یہ کہتے ہوئے اٹھا۔ اس نے اپنا کافی کا کپ میز پر رکھا اور عروہ کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ محسن کی ہمدردی پا کر عروہ کو کچھ حوصلہ ہوا اور اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ یہ سب کہتے ہوئے اسے بہت شرم محسوس ہو رہی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی پل صراط سے گزر رہی ہو۔ کسی غیر کے آگے اپنے پردے کھولنا کوئی آسان کام تھوڑی ہوتا ہے اور عروہ نے اپنے گھر والوں کے دباؤ میں آ کر محسن کے سامنے ایک ایک کر کے سارے پردے کھول دیے تھے۔ وہ موسیٰ کو یہ سب نہیں کہہ سکی تھی کیونکہ وہ اس کی محبت کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی مگر اپنی نادانی میں وہ خود کو بہت بڑی آزمائش میں ڈال گئی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اس بار جو آزمائش آ رہی ہے وہ پچھلی آزمائش سے کہیں زیادہ طویل اور اذیت ناک ہے۔ عروہ اپنے ساتھ ایک فائل بھی لائی تھی، جس میں اس کی بہن کا سی

وی اور دیگر تفصیلات موجود تھیں۔ محسن نے وہ فائل اس کے ہاتھ سے لے کر ساتھ والی میز پر رکھ دی تھی۔ اس نے عروہ کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے۔ وہ اسے بہلا رہا تھا کہ وہ پریشان ہونا چھوڑ دے۔ اس کی بہن کی نوکری کا انتظام ہو جائے گا۔ اس لمحے وہ اس کے بہت قریب تھا کہ اچانک دھاڑ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور موسیٰ اندر داخل ہوا۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ عروہ نے کبھی فرشتوں کے منہ سے آگ نکلتے نہیں دیکھی تھی۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ فرشتوں کے پاس سے ہمیشہ روشنیاں نکلا کرتی ہیں جیسی موسیٰ کے پاس سے نکلا کرتی تھیں مگر اس رات اس فرشتے کے پورے وجود سے آگ نکل رہی تھی اور اس آگ نے عروہ کا سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"ذلیل کمینی عورت میں وہاں تیری خاطر خوار ہو رہا ہوں اور تو یہاں میری ہی عزت کا تماشا لگا رہی ہے۔"

محض چند لمحوں میں وہ فرشتہ شیطان میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کا چہرہ اور لہجہ دونوں ہی زہر اگل رہے تھے۔ اس روز ابلیس اور اس کے چیلے بہت خوش ہو رہے تھے۔ ایک بار پھر ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ایک بار پھر آدم و حوا کے درمیان نفرت اور غلط فہمی کی دیواریں وسیع ہوتی جا رہی تھیں اور ان کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی۔

"گھٹیا انسان! میری بیوی کے ساتھ یہ سب کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی۔" یہ کہتے ہوئے موسیٰ نے محسن کو گریبان سے پکڑ لیا۔ اسے زوردار دھکا دے کر زمین پر گرا دیا تھا۔ پھر وہ عروہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں لے گیا۔

"میں چاہوں تو ابھی سے تیرے ناپاک وجود کو اس کمرے سے باہر نکال کر دور پھینک دوں مگر نہیں...... تیرے وجود کے اندر جو جان پرورش پا رہی ہے مجھے اس کا گناہ گار نہیں بننا۔ اسی لیے تو اب اسی کمرے میں بند رہے گی۔" موسیٰ کے منہ سے آگ کے شعلے نکلتے ہی جا رہے تھے اور عروہ خود کو بچاتے بچاتے نڈھال ہو چکی تھی۔

"مگر مجھے کیا خبر تمہارے وجود کے اندر جو دوسرا وجود سانسیں لے رہا ہے وہ میرا ہی ہے یا پھر کسی اور کی نشانی تمہارے اندر پرورش پا رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے موسیٰ نے نفرت سے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

"مجھے برا بھلا کہہ لیں مگر اس ننھی جان کو گالی مت دو۔" عروہ یہ کہتے ہوئے موسیٰ کے پیروں میں پڑ گئی۔ موسیٰ اسے دھتکار کر آگے کی طرف بڑھ رہا تھا وہ اب اس کمرے سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔

"موسیٰ! شک کی عینک اتار کر دیکھیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔ عروہ صرف آپ کی ہے موسیٰ، میرے وجود کو ایسے بے سروسامان مت کریں۔" عروہ موسیٰ کی منتیں کرتی ہوئی رو رہی تھی۔

اس کی زندگی ایک بار پھر جل رہی تھی اور اس بار اس کو بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ موسیٰ کچھ دیر کھڑا عروہ کو پاگلوں کی طرح روتے چیختے چلاتے دیکھتا رہا۔ پھر ایک جھٹکے سے اسے کھڑا کیا اور گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر لے آیا۔ اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر عروہ کو وہاں پھینکا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اب وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر خود بھی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ بہت تیز گاڑی چلا رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں اتنی ریش ڈرائیونگ پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے عروہ کے گھر کے سامنے رک گئی۔ موسیٰ نے گاڑی سے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ عروہ نے ایک بے بس سی نگاہ اپنے محبوب کی طرف ڈالی جو اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ

گاڑی سے باہر نکل آئی تھی۔ موسیٰ اس کے باہر نکلتے ہی تیزی سے گاڑی میں بیٹھا اور محض چند لمحوں میں وہ گاڑی اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ عروہ تھکے تھکے قدموں سے اب گھر کے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ وہ دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھا رہی تھی یہ دستک اس کی زندگی کی مشکل ترین دستک تھی۔ اس کو درد ہو رہا تھا۔ چوٹ بھی لگی تھی۔ درد کی شدت سے نہ صرف وہ بلکہ اس کے وجود کے اندر موجود ننھی جان بھی تڑپ اٹھی تھی مگر اس بار ان دونوں کو سہارا دینے کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ سامنے جو کوئی بھی آیا تھا عروہ نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ دہلیز پار کرتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ ابلیس کا وار کامیاب رہا تھا۔ ایک اور آدم نے شک کی آگ میں جل کر حوا کو چھوڑ دیا تھا۔

☆......☆

مجسمہ سازی موسیٰ حیات کے بعد مائدہ کا دوسرا عشق تھا۔ اسے بچپن سے ہی مٹی کے چھوٹے چھوٹے مجسمے بنا کر ایک عجیب سا فخر محسوس ہوتا تھا۔ مٹی کے یہ بے جان بت ہمیشہ سے اس کی خصوصی توجہ کے منتظر رہتے تھے۔ اس نے موسیٰ کا بھی ایک مجسمہ بنایا تھا مگر اتنا زیادہ خیال رکھنے کے باوجود ایک روز وہ بت اس سے ٹوٹ گیا تھا اور دوبارہ سے پھر ویسا بن بھی نہیں سکا تھا۔ اسے ریت کے گھروندے بنانا بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ ساحل کی گیلی ریت سے مٹی کے گھر بنانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس نے ایک بہت خوب صورت ریت کا گھر بنانا چاہا تھا مگر وہ گھر بننے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا تھا۔ صرف وہ ریت کا گھروندا ہی نہیں ٹوٹا تھا اس کے اپنے وجود کے اندر بھی بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

موسیٰ کی یادیں اب بھی اسے بہت تنگ کرتی تھیں مگر اب وہ کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ امتحانات میں اس نے کامیابی تو حاصل کر لی تھی مگر وہ اپنی پوزیشن برقرار نہیں رکھ پائی تھی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ کامیاب ہوگئی ہے۔ ورنہ جیسی حالت اس کی تھی سب کو لگتا تھا کہ وہ اس بار کامیابی حاصل نہیں کر سکے گی۔

ڈگری ملنے کے بعد اب اس نے مجسمہ سازی کے فن میں مزید مہارت ملک سے باہر جا کر حاصل کرنی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے آسٹریلیا کا انتخاب کیا تھا۔ اس کی ایک دوست پہلے سے سڈنی کے ایک آرٹ کالج میں مجسمہ سازی میں مہارت حاصل کر رہی تھی۔ اسی نے مائدہ کو وہاں داخلہ لینے کا مشورہ دیا تھا۔ روپے پیسے کی مائدہ کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ پھر اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر اس کے گھر والے بھی چاہتے تھے کہ وہ ملک سے باہر چلی جائے کیوں کہ وہ اپنے گھر والوں کے سامنے نارمل ہوتے ہوئے بھی نارمل نہیں تھی۔ اپنے رویے سے وہ انہیں اس بات کا احساس دلا ہی دیتی تھی کہ موسیٰ حیات کے اس قدر سنگدلانہ رویے کے باوجود اس کی موسیٰ سے چاہت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ آج بھی پاگلوں کی طرح اس کی واپسی کی منتظر ہے۔ یوں موسیٰ کی یادوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے مائدہ نے ایک اجنبی سرزمین کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ ورنہ مجسمہ سازی کی تعلیم تو صرف ایک بہانہ تھی۔ وہ تو موسیٰ سے دور بھاگنا چاہتی تھی جو کسی جونک کی طرح اس کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔

سڈنی میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد اسے ایک بات کا احساس تو بہت اچھی طرح ہو گیا تھا کہ موسیٰ حیات اس کے دل میں رہتا ہے اور جب تک دل نام کا یہ حصہ اس کے جسم کے اندر موجود ہے وہ کبھی بھی موسیٰ کی یادوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی۔ وہ تو شاید موسیٰ سے نہیں بلکہ خود سے فرار حاصل کر رہی تھی۔ سڈنی کے اس کالج میں مختلف ممالک سے آئے ہوئے طالب علموں کے ساتھ وہ گھل مل سی گئی تھی اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے اپنی ذہانت سے اپنے کالج میں ایک نمایاں مقام بنا لیا تھا۔ اس نے ڈگری لینے کے ساتھ ساتھ آرٹ کے کچھ مزید کورسز بھی کر لیے تھے مگر اپنے اندر کی تنہائی سے وہ اکثر گھبرا جاتی تھی۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد اب اس کے گھر والے واپس بلا رہے تھے مگر مائدہ حسن کو اب موسیٰ حیات کے دیس واپس نہیں جانا تھا۔ موسیٰ کے معاملے میں وہ اس قدر کمزور کیوں ثابت ہوئی تھی یہ وہ نہیں جانتی تھی مگر یہ حقیقت تھی کہ موسیٰ حیات سے عشق نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ سڈنی کی شامیں بہت رنگین ہوتی ہیں اور انہی رنگین شاموں میں کچھ وقت گزار کر وہ خود کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی اور کسی حد تک کامیاب بھی رہتی۔

اس نے سڈنی کی ایک آرٹ گیلری میں ملازمت کر لی تھی مگر بہت جلد اس نے ملازمت کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی کے ماتحت کام نہیں کر سکتی اور یہ مغرب کے لوگ تو کام لینے کے معاملے میں ویسے بھی بہت سخت ہوتے ہیں۔ وہ اب اپنے ہاتھ سے مجسمے اور کچھ تصویریں بنا کر فروخت کیا کرتی تھی اور اس کام میں اسے مزا بھی بہت آ رہا تھا اور آمدنی بھی اچھی خاصی ہو جاتی تھی۔

اسی دوران میں اس کی ملاقات پیٹر سے ہوئی تھی۔ پیٹر جانسن روزانہ ہی اس سے مجسمے خریدا کرتا تھا۔ وہ بہت اچھی گفتگو کرتا تھا اور اسے مائدہ کو ہنسانا بھی بہت اچھی طرح آتا تھا۔ پیٹر کے گھر آنے پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ جاتی تھی۔ اب اسے روزانہ ہی پیٹر کا انتظار رہنے لگا تھا۔ وہ کچھ دن نہ آتا تو مائدہ اس کا بے چینی سے انتظار شروع کر دیتی۔ پھر وہ پیٹر سے روزانہ ملنے لگی۔ ان کی ملاقاتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ پیٹر ہی وہ مرد تھا جس نے مائدہ کے دل میں موجود موسیٰ کے بت کو توڑنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ پیٹر کون ہے؟ وہ کہاں سے آیا ہے؟ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ پیٹر اب اس کی ضرورت بن چکا ہے۔ اب وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پیٹر نے جب اس سے اظہار محبت کیا تو مائدہ کو لگا کہ آسمان کے سارے ستارے ایک دم اس کی جھولی میں آن گرے ہیں۔ مائدہ نے اس کی محبت قبول کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی۔

پیٹر مائدہ کی خاطر مسلمان ہونے پر بھی تیار تھا۔ ایک روز سڈنی کے ایک اسلامک سینٹر میں جا کر اس نے کلمہ پڑھ لیا۔ اس کا اسلامی نام عبداللہ رکھا گیا مگر اس نے مائدہ کو بتا دیا تھا کہ وہ ابھی اپنی اس نئی شناخت کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے اور مائدہ کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ عبداللہ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ سڈنی کے اسی اسلامک سینٹر میں ان دونوں کا نکاح ہوا۔ مائدہ نے جب فون پر اپنے خاندان والوں کو یہ خبر سنائی تو وہ سب لوگ اس پر برس پڑے اس کے گھر والے سڈنی بھی آئے۔ انہوں نے مائدہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ پیٹر اچھا آدمی نہیں ہے مگر مائدہ کسی کی کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھی۔ بہت عرصے بعد اس نے کوئی خوشی محسوس کی تھی اور وہ گھر والوں کے کہنے میں آ کر اس خوشی کو خود سے دور کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے گھر والے ناراض ہو کر چلے گئے مگر مائدہ کو کسی کی کوئی پروا نہیں تھی۔

اب وہ عبداللہ کے نکاح میں تھی۔ فی الحال وہ مائدہ کے اپارٹمنٹ میں ہی اس سے ملنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ کچھ روز بعد جب عشق کی پٹی اتری تو مائدہ کو خیال آیا کہ عبداللہ کو اسے اپنے گھر لے کر جانا

چاہیے۔ وہ عبداللہ کی ذاتی زندگی کے متعلق تو کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ جب بھی اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتی وہ اسے ٹال دیا کرتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اب وہ اپنی نئی شناخت سب کے سامنے ظاہر کردے اور وہ دونوں نارمل میاں بیوی کی حیثیت سے رہیں مگر عبداللہ کبھی ایسا نہیں چاہتا تھا۔

ایک روز رات کے وقت وہ مائدہ کے اپارٹمنٹ آیا تو مائدہ نے دیکھا کہ اس نے پی رکھی ہے۔ اسے اس پل عبداللہ سے سخت کراہیت محسوس ہوئی۔ اس نے پہلی بار اسے یوں نشے کی حالت میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس کو روزانہ ہی عبداللہ کی شخصیت کے بارے میں نئی نئی باتیں پتا چلتی تھیں۔ انہی دنوں وہ امید سے ہوئی جس پر عبداللہ بہت خوش ہوا اور اسے اپنے گھر لے آیا۔ وہ سڈنی کا ایک انتہائی ستا رہائشی علاقہ تھا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ عبداللہ نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ اس دنیا میں اکیلا ہے۔ اس کے ماں باپ کچھ عرصہ پہلے ہی ایک حادثے کے نتیجے میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ مائدہ جیسی لڑکی کے لیے اس علاقے میں رہنا ایک نہایت مشکل فیصلہ تھا مگر عبداللہ کی خاطر اس نے یہ کڑوا گھونٹ بھی پی لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے یہاں سب پیٹر کہتے ہیں اس لیے وہ بھی اسے پیٹر ہی کہے۔ اس گھر میں پیٹر کے ساتھ رہتے ہوئے وہ چند ہی دنوں میں پیٹر کے متعلق بہت کچھ جان گئی تھی اور اسے پہلی بار اپنی پسند پر شرم محسوس ہو رہی تھی مگر وہ تو خود سے انتقام لے رہی تھی اور خود کو اذیت دینے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ وہ پیٹر کو ہمیشہ کے لیے اپنا لے۔ وہ چاہتی تو پیٹر کو چھوڑ کر واپس پاکستان چلی جاتی مگر یہ زندگی اس کا اپنا انتخاب تھی اور وہ واپس جا کر اپنے گھر والوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ دوسروں کو پریشان نہ کرنے کا فلسفہ بھی عجیب ہے۔ ہم خود سے قریب لوگوں کو اپنی تکلیفیں بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتے مگر ہماری پریشانیاں جب حد سے بڑھ جاتی ہیں تو ہم انہی لوگوں کے پاس جا کر اپنا دل ہلکا کرتے ہیں، حالانکہ اس وقت اگر ہم اپنی پریشانی اور دکھ ان سے کہہ دیں تو شاید ہماری پریشانی کافی حد تک کم ہو جائے۔ مائدہ کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ اس نے پیٹر کے ساتھ اس زندگی کا آغاز کر دیا تھا جس میں سوائے دکھ اور پریشانیوں کے کچھ بھی نہیں تھا۔

اس کی زندگی میں بہار کا پہلا جھونکا تب آیا جب سائرہ کا ننھا وجود اس کی زندگی میں آیا۔ سائرہ کو پا کر وہ بہت خوش تھی اسے لگتا تھا کہ اس کی زندگی میں امید کی ننھی کرن آ گئی ہے۔ اس کی بیٹی اس کی ہی طرح خوب صورت اور ذہین تھی۔ بس وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ سائرہ کا نصیب بھی اس جیسا ہی ہو۔ وہ اس کے لیے ایک شہزادے کا خواب دیکھا کرتی تھی۔ جو ایک شان سے آئے گا اور اس کی شہزادی کو ساتھ لے جائے گا۔

پیٹر اس کے اندازوں سے بھی زیادہ برا انسان ثابت ہوا تھا۔ اس نے صرف مائدہ کے کہنے پر وقتی طور پر اسلام قبول کیا تھا ورنہ حقیقت میں وہ ابھی تک عیسائی مذہب کے تحت ہی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ جو کماتا تھا اپنی عیاشی پر اڑا دیتا تھا۔ مائدہ نے تصویریں اور مجسمے بنا کر ہی اپنا گزارہ کیا تھا۔ اس نے ایک جگہ ملازمت بھی کر لی تھی جس پر پیٹر نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

سائرہ ابھی اسکول کی تعلیم ہی حاصل کر رہی تھی کہ ایک روز مائدہ کا بہت خوفناک حادثہ ہو گیا جس کے نتیجے میں وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئی۔ اب اس کی زندگی صرف ایک وہیل چیئر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی بیٹی اس کی معذوری کے بعد جیسے دنوں میں ہی بہت بڑی ہو گئی تھی۔ اس نے ایسے گھر سنبھالا کہ مائدہ کو حیرت ہوتی تھی کہ اس کی بیٹی نے اتنی سمجھداری کہاں سے سیکھ لی تھی۔ اسے سائرہ پر بہت فخر تھا۔ اب اس نے سائرہ کو اس دوزخ سے نکالنا تھا۔ جب سے اس کو پتا چلا تھا کہ پیٹر اس کی پھولوں جیسی بیٹی کو ابرک

شیطان سے بیاہنے چلا ہے۔ اس کی پریشانی بہت بڑھ گئی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے سائرہ کو اس جہنم سے نکالنے کے لیے آخری داؤ آزمانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ سائرہ کو اس جہنم سے نکالنے میں ضرور کامیاب ہو گی۔

☆......☆

ملک حیات بہت بے چینی سے موسیٰ کی واپسی کے منتظر تھے۔ ان کے خیال کے مطابق موسیٰ کو واپس آ جانا چاہیے تھا۔ یہ تو طے تھا کہ موسیٰ کو واپس اسی گھر میں آنا تھا تو وہ اپنی بیگم کو اسے لینے کے لیے بھیج دیتے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنی ماں کی بات کبھی بھی نہیں ٹالتا تھا۔ وہ اس وقت اتنا ٹوٹا اور بکھرا ہوا تھا کہ اس کی ماں ہی اسے سہارا دے سکتی تھی۔ انہیں خبر مل چکی تھی کہ موسیٰ عروہ کو دھکے دے کر اپنے گھر سے اور زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال چکا ہے۔ یہ کام تو ان کے منصوبے کے حساب سے بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا مگر دیر سے ہی سہی بہرحال عروہ نام کا وہ کیڑا ان کی زندگی سے نکل چکا تھا۔ اس لڑکی کو اپنے بیٹے کی زندگی سے نکالنے کے لیے انہوں نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے تھے یہ وہی جانتے تھے۔

موسیٰ کو گھر سے نکالنے کے بعد انہوں نے یہی تو سوچا تھا کہ عروہ کو کیسے اس کی زندگی سے نکالا جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے موسیٰ کے چند دوستوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ تو محسن کو خریدنا چاہتے تھے مگر محسن کی طبیعت سے وہ واقف تھے۔ اس لیے اسے اپنے ساتھ ملانے کا ارادہ انہوں نے ترک کر دیا تھا۔ انہوں نے صرف انہی لڑکوں کی خدمات حاصل کی تھیں جو معاشی طور پر نسبتاً کم خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور کسی نہ کسی معاشی پریشانی کا شکار تھے۔ ان سب لڑکوں کی یہی ذمہ داری تھی کہ وہ موسیٰ کے دل میں بدگمانی اور شک کا بیج بو دیں۔ اپنے منصوبے کے مطابق وہ لڑکے موسیٰ کو یونیورسٹی میں زیادہ دیر روک رکھتے۔ وہ سب مل کر موسیٰ کو عروہ اور محسن سے بدگمان کرنا چاہتے تھے۔ شروع میں انہیں کچھ خاص کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی بلکہ جب ملک حیات کو عروہ اور موسیٰ کے درمیان بڑھتی ہوئی محبت کی خبریں ملتیں تو وہ سوائے پیچ و تاب کھانے کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ انہی دنوں انہیں عروہ کے امید سے ہونے کی خبر ملی جسے سن کر ان کے ارمانوں پر مزید اوس پڑ گئی۔ موسیٰ کی والدہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ وہ ملک حیات پر دباؤ ڈالنے لگی تھیں کہ وہ موسیٰ کو معاف کر دیں مگر ملک حیات کسی صورت بھی موسیٰ کو معاف کرنے پر تیار نہیں تھے۔ بلکہ ان کا شاطر ذہن تو اپنے بیٹے کی زندگی برباد کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ملک حیات کی کوششوں کو تقویت ملنے لگی اور انہیں ان کی پسند کی خبریں ملنے لگیں۔ انہیں لگا کہ اب ان کی منزل قریب ہی ہے۔ انہیں پتا چلا تھا کہ موسیٰ نے بھی اب اپنے دوستوں کی باتوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ اب وہ پوری طرح ان کے دام میں آتا جا رہا تھا۔ مچھلی اپنے جال میں پھنسنے لگی تھی اور یہی سب کچھ ملک حیات چاہتے تھے۔ موسیٰ اب خود جان بوجھ کر گھر سے باہر رہنے لگا تھا۔ ملک حیات کو ان کے کارندے سب خبریں دے رہے تھے۔ سب کچھ ان کی توقع کے مطابق ہو رہا تھا اور پھر وہی ہوا جو وہ چاہتے تھے۔

ملک حیات نے اپنے بیٹے کا گھر برباد کر دیا۔ جب وہ اس لمحے کا تصور کرتے تھے جب ان کے بیٹے نے عروہ کو دھکے مار کر گھر سے نکالا ہو گا۔ ان کے دل کے اندر ڈھیروں سکون اور طمانیت اتر آتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کا وہ پُراعتماد انداز کیسے بھول سکتے تھے جب اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چیلنج کیا

تھا کہ وہ عروہ کو بغیر کسی روپے پیسے جائیداد کے خوش رکھ کر دکھائے گا۔ وہ ان کی انا کو پیروں تلے روند کر چلا گیا تھا۔ اب وہ اپنے بیٹے کی جھکی ہوئی گردن دیکھنے کے خواہش مند تھے۔

یہ انا کا کھیل بھی انسان کو کبھی سکون سے نہیں رہنے دیتا۔ ملک حیات کو بھی ان کی زخمی انا ہر وقت بے چین کیے رکھتی تھی۔ وہ کوئی اتنے برے انسان نہیں تھے مگر نفرت اور انتقام کی آگ میں جل کر انہوں نے اپنے بیٹے کو اذیت پہنچائی۔ ان کا تعلق اس خاندان سے تھا جہاں جانور بھی اعلیٰ نسل کے پالے جاتے تھے۔ پھر وہ اپنے اکلوتے سپوت کا ہاتھ ایک ایسی لڑکی کے ہاتھ میں کیسے تھما دیتے جس کے خاندان کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ جیسے بھی تھے کہ باپ کی حیثیت سے موسیٰ کی حالت کا سن کر انہیں دلی صدمہ ہوا تھا۔ ان کی بیگم موسیٰ سے مل کر آئی تھیں۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی مگر وہ اپنی ماں سے مسلسل رابطے میں تھا۔ ملک حیات اس سے ملنے کے لیے جانا چاہتے تھے مگر ان کی انا آڑے آجاتی تھی۔ وہ موسیٰ کی جھکی ہوئی گردن تو نہیں دیکھ سکے مگر اپنے بیٹے کو انہوں نے جو چوٹ پہنچائی تھی اس کے زخم مندمل ہونے میں جانے کتنے برس لگ جانے تھے۔

☆......☆

ایرک کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کو علی ابھی تک بھول نہیں پایا تھا کہ ایک روز اچانک سے وہ دوبارہ اسے ایک شاپنگ مال میں شاپنگ کرتا نظر آیا۔

"ہیلو!" اس نے علی کو دیکھ کر ہاتھ لہرایا۔

"ہائے۔" جواباً علی کو بھی رسم نبھانا پڑی۔ ورنہ اسے وہ شخص پہلی ہی نظر میں پسند نہیں آیا تھا اور اب جو وہ اپنے اور سائرہ کے تعلق کے حوالے سے نیا انکشاف کرنے جا رہا تھا اس کے بعد تو رہی سہی امید بھی ختم ہوگئی تھی کہ علی کے دل میں ایرک کے لیے معمولی سا پسندیدگی کا جذبہ بھی اپنی جگہ بنا سکے۔

"تم سائرہ کے کلاس فیلو علی ہو نا؟ سنڈے کو سینٹرل چرچ میں میری اور سائرہ کی شادی ہے تم ضرور آنا۔" ایرک نے نہایت گرمجوشی سے اسے مخاطب کیا۔

ایرک کے اس نئے انکشاف کے بعد علی کے لیے بہت مشکل تھا کہ وہ اپنی جگہ پر موجود رہتا۔ اس کے چہرے پر ایک دم نہایت ناگواری کے تاثرات ابھرے تھے جو ایرک سے چھپے نہیں رہ سکے مگر وہ انہیں نظر انداز کر کے علی سے بات کرتا رہا۔

"میں نے سائرہ کے لیے کچھ شاپنگ کی ہے۔" یہ کہتے ہوئے ایرک اب اسے سائرہ کے لیے خریدی گئی کچھ جیولری دکھا رہا تھا۔ علی نے نہایت بیزاری سے ان سب چیزوں کو دیکھا۔ اس کی نظر ایرک کے چہرے پر پڑی جہاں پر خوشی کے رنگ نمایاں تھے۔ علی بے اختیار ایرک کے چہرے پر پھیلتے ان رنگوں کو دیکھتا رہا۔ وہ اب واپس گھر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اپنے دل میں ایرک کے لیے سوائے نفرت کے کوئی دوسرا جذبہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔

سینٹرل چرچ سڈنی کی رونقیں اس روز دیکھنے کے لائق تھیں اور کیوں نہ ہوتیں اس روز پیٹر اور میتھیو کی دوستی باقاعدہ طور پر رشتہ داری میں بدلنے والی تھی۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔ ایرک اپنے چند دوستوں کے ساتھ چرچ میں موجود تھا۔ جب کہ سائرہ اور اس کے ساتھ آنے والے دیگر مہمان ابھی تک نہیں آئے تھے۔ سائرہ نے پیٹر کو بتا دیا تھا کہ اسے تیاری میں تھوڑی دیر لگے گی اور وہ اپنی ماں اور دیگر دوستوں کے ساتھ آئے گی مگر اب وقت کافی گزر چکا تھا اور پیٹر دیکھ رہا تھا کہ دور دور تک کسی کے آنے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔

"پیٹر! کافی دیر ہوگئی ہے۔ وقت نکلا جا رہا ہے۔ تم فون کر کے پتا تو کرو۔" میتھیو نے انتہائی ناگوار انداز میں پیٹر کو مخاطب کیا۔

"میں کوشش تو کر رہا ہوں کہ فون پر رابطہ ہو جائے مگر سگنلز نہیں مل رہے۔ میں گھر جا کر معلوم کرتا ہوں کہ مسئلہ کیا ہے۔" پیٹر نے میتھیو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں تم میرے ساتھ کوئی کھیل تو نہیں کھیل رہے؟" میتھیو کی ناگواری اب غصے میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

"میں واپس آکر تمہارے سارے سوالوں کے جواب دیتا ہوں۔" پیٹر یہ کہتا ہوا اب لوکل بس میں بیٹھنے جا رہا تھا اسے جلد از جلد گھر جا کر اصل صورت حال معلوم کرنی تھی۔ ایرک کی اپنی بے چینی بھی اب بڑھ رہی تھی۔ وہ اس روز خصوصی طور پر تیار ہو کر آیا تھا۔ اس کے تمام دوستوں کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے ایرک سے زیادہ خوب صورت دولہا کم از کم اپنی اب تک کی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ ایرک اپنی تعریفوں پر پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اسے اب اپنی شہزادی کا انتظار تھا جس کی بے رخی کو وہ پچھلے کئی روز سے نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ اب اس لمحے کا منتظر تھا جب فادر جوزف، سائرہ کا ہاتھ ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ میں دے دیں گے مگر اب اسے خطرے کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے۔ وہ اب یہاں سے خالی ہاتھ ہی جائے گا۔ وہ سامنے ہی دیکھ رہا تھا کہ اچانک سے میتھیو چرچ کے اندر داخل ہوا اور مہمانوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"دوستو! ایرک کی دلہن سائرہ کی طبیعت اچانک سے کچھ خراب ہوگئی ہے جس کی وجہ سے آج کی تاریخ میں ان دونوں کی شادی ممکن نہیں ہے۔ نئی تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔" میتھیو کی یہ بات سن کر وہاں پر موجود مہمان اب جانے لگے تھے جب کہ ایرک نہایت تیزی سے میتھیو کی طرف آیا اور میتھیو نے جو کچھ اس کے کان میں کہا اسے سن کر ایرک کو لگا جیسے اسے کوئی زوردار تھپڑ مار کر چلا گیا ہو۔ وہ اب اپنے باپ اور دوستوں کے ساتھ اپنی گاڑی میں واپس اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا مگر سائرہ نے جو دھوکا اس کے ساتھ کیا تھا اس کا سوچ سوچ کر اس کے دل میں ابال اٹھ رہے تھے اور میتھیو یہ سوچ رہا تھا کہ پیٹر کو وہ کیا سزا دے کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو۔ اب یہ تو کسی صورت ممکن نہیں تھا کہ میتھیو کے ہوتے ہوئے پیٹر اب بھی سکون کی نیند سو سکے۔

☆......☆

موسیٰ رات کے اس پہر شہر کے ایک گنجان آباد علاقے میں ہوٹل میں موجود تھا۔ وہ جس کمرے میں اپنی محبت کی بربادی کا سوگ منا رہا تھا وہ کمرہ مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس لمحے موسیٰ روشنی کی ہلکی سی جھلک بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ اندھیرے ہی اب اس کا مقدر تھے، روشنی کو تو خود اس نے اپنی پہنچ سے بہت دور کر دیا تھا۔ وہ اس لمحے بہت ٹوٹا اور بکھرا ہوا تھا اور ایسی حالت میں اس نے بے اختیار اپنی ماں کو پکارا تھا۔ فون پر بات کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ عروہ کو بھلا دینا چاہتا تھا مگر عروہ اتنی ہی شدت سے اسے یاد آرہی تھی۔

"موسیٰ! ایک بات کہوں مجھے آپ سے عشق ہوگیا ہے۔" کوئی اس کے کان میں نہایت محبت سے کہہ رہا تھا۔ موسیٰ بے اختیار اٹھ بیٹھا تھا۔ اسے ان جملوں اور آوازوں سے نفرت محسوس ہو رہی تھی جو عروہ دن رات اس کے کانوں میں انڈیلتی رہتی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں تھیں مگر عروہ بند آنکھوں سے بھی

مہرین کنول

افسانہ

چاند، عید اور جھوٹا مان



اسے دکھائی دے رہی تھی۔

''موسیٰ! آپ اتنی دیر باہر مت رہا کریں۔ میں تو آپ کے بغیر اپاہج ہو جاتی ہوں۔'' عروہ یہ کہتے ہوئے موسیٰ کے بہت قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے موسیٰ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں عروہ سراج، میں تم سے شدید نفرت کرتا ہوں۔'' موسیٰ بہت زور سے چلایا تھا۔

وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ بے آواز رو رہا تھا۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ بہت بہادر تھا مگر زندگی میں کبھی کبھی ایسے لمحات آتے ہیں جب انسان کو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا۔ ایسا ہی ایک لمحہ موسیٰ حیات کی زندگی میں بھی آ گیا تھا۔

وہ رات موسیٰ کی زندگی کی بدترین رات تھی۔ ہر رات کے بعد صبح ضرور ہوتی ہے مگر موسیٰ کو لگتا تھا کہ اب اس کی زندگی میں کبھی صبح نہیں ہوگی۔ اس ایک رات نے ان کی پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اگلی صبح موسیٰ نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا تھا وہ عروہ کی یادوں سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ اس شہر سے کہیں دور چلے جانا چاہتا تھا۔ وہ تو یہ ملک ہی چھوڑنا چاہتا تھا مگر اپنی ماں کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکا۔ موسیٰ کا اپنی ماں سے فون پر رابطہ تھا۔ ان کے تسلی بھرے چند جملے سن کر اس کے اندر پھر سے جینے کی خواہش بیدار ہوئی تھی۔ ورنہ وہ تو اپنی زندگی سے مایوس ہو چلا تھا۔ وہ کچھ عرصہ ایک ماہر نفسیات کے پاس زیر علاج بھی رہا تھا۔ اس کی ماں نے اسے بہت سہارا دیا تھا۔ وہ اس سے ملنے اس چھوٹے سے شہر آئی تھیں۔ جہاں کے ایک کالج میں اس نے فائن آرٹس پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اسے اپنے باپ پر حیرت ہوتی تھی جو اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود اس کا حال تک پوچھنے نہیں آیا۔ اسے اب اپنی ماں کے علاوہ کسی پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ وہ اب ٹھیک تھا مگر اس کے ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویریں اس کے غم کی داستان بیان کرتی نظر آتی تھیں۔ اسے محسن اور عروہ کے ذکر سے بھی اب وحشت ہوتی تھی۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ محسن ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ مگر عروہ کے بارے میں اسے کچھ خبر نہیں تھی اور نہ وہ کوئی خبر رکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تو عروہ کو طلاق دے دیتا مگر یہ واحد کام تھا جو باوجود کوشش کے وہ کر نہیں سکا تھا۔ اب وہ ایک انتہائی سخت مزاج اور خشک انسان تھا۔ اس نے اپنی ذات کے اوپر اجنبیت اور بیگانگی کے کئی خول چڑھا رکھے تھے۔ وہ خوش مزاج موسیٰ کہیں غائب ہو چکا تھا جو جلد لوگوں سے گھل مل جاتا تھا۔ کالج میں کئی لڑکیوں نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی مگر موسیٰ نے کبھی کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ وہ زندگی کو گزارنے کی کوشش میں مصروف تھا مگر زندگی گزرتی ہی نہیں تھی۔

ایک روز اسے اپنی ماں کے مرنے کی خبر ملی۔ اس خبر کے بعد موسیٰ کو لگا کہ جو اس کے اندر تھوڑی بہت جینے کی خواہش جاگی تھی وہ بھی اب ختم ہو گئی ہے۔ اس کی زندگی بھی اس کی ماں کے ساتھ ہی دفن ہو گئی تھی۔ وہ اپنا ٹوٹا اور بکھرا ہوا وجود لے کر ماں کے جنازے کو کندھا دینے آیا تھا۔ ماں کو دفنانے کے بعد وہ واپس جانا چاہتا تھا مگر اس کے باپ نے اسے روک لیا۔ ماں کے جانے کے بعد وہ بہت کمزور پڑ گیا تھا۔ اس لیے اس نے باپ کے آگے مزاحمت نہیں کی اور دوبارہ سے اس شہر میں لوٹ آیا تھا۔ یہ وہی شہر تھا جہاں کی گلیوں میں عروہ کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ باوجود کوشش کے وہ ان یادوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

شاندار ہزار گز کا بنگلہ اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور تھا، جس کے احاطے میں ایک وسیع فارم ہاؤس تھا جو اس بنگلے کے ساتھ ملا ہوا تھا، بنگلے کے برابر میں فارم ہاؤس کے درختوں کے جھنڈ نظر آتے جو قطار در قطار کھڑے تھے جس کے بیچ سڑک کا ایک راستہ بنا ہوا تھا، دوسری طرف کہیں گلاب کے لہلہاتے پھول اگے ہوئے تھے کہیں گھاس کی ہریالی تھی اور کہیں سورج مکھی کے، موتیا کے، چنبیلی کے، رات کی رانی کے اور بہت سے خوشنما پھول فارم ہاؤس کا حسین منظر پیش کرتے۔ اس جگہ کی صبح سہانی اور شام سہانی تھی، زریاب صبح چھ بجے اپنی کار میں بیٹھ کر آفس کے لئے نکلا تھا، ایک گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد ہی اسے خیال آیا تھا۔

"ارے میں اپنی فائل تو وہیں گھر میں بھول آیا ہوں، جو آج کی میٹنگ کے لئے بے حد ضروری ہے۔"

اس سوچ کے آتے ہی اس نے گاڑی ریورس کی اور اپنے بنگلے کی طرف جانے والے راستے پر موڑی ایک گھنٹے کے اندر زریاب نے بنگلے کے گیٹ پر کار روکی اور سرعت سے اندر داخل ہوا۔ جلدی سے اپنے کمرے میں جا کر فائل اٹھالی اور سیدھا باہر آ گیا، بنگلے میں غیر معمولی چہل پہل ضرور محسوس کی تھی مگر دھیان نہیں دیا تھا، مگر جیسے ہی اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ مسحور کن ہنسی کی جلترنگ سنائی دینے لگی۔ آواز کی سمت دیکھا تو ایک حسین منظر اس کا منتظر تھا درختوں کے درمیانی راستے میں وہ ایک ہاتھ سے اپنی ریڈ رنگ کی فراک کا ایک حصہ پکڑے اور دوسرے ہاتھ کی مٹھی بند کیے دوڑتی ہوئی آ رہی تھی، اس کے پیچھے رمیز بھاگ رہا تھا، جو زریاب کا چچازاد بھائی تھا، ہوا کے جھونکوں سے ہلتے ڈولتے درخت اور اس حسین پیکر کے سنہرے بال اف...... وہ کتنی قیامت ڈھا رہی تھی وہ دونوں زریاب کے قریب آئے تو زریاب خفگی سے میرب احسان کو دیکھنے لگا۔ اسے پہچان کر زریاب کی بھنویں تن گئیں۔

"اس طرح لڑکیوں کا نامحرموں کے ساتھ بھاگنا دوڑنا، اچھل کود کرنا اچھی بات نہیں۔" زریاب نے نخوت سے کہا۔

"رمیز میرا کزن ہے اور اب تو میرا ہونے والا دیور بھی ہے۔" میرب دوٹوک لہجے میں بولی۔

"خوش فہمی ہے تمہاری میں منگنی توڑ چکا ہوں۔" وہ سفاکی سے بولا۔

"ہاہاہاہا!" وہ ہنسی۔

"منگنی آپ کی طرف سے ٹوٹی ہے میری طرف سے یہ رشتہ باقی ہے کیونکہ میں خود غرض نہیں ہوں۔" اس نے بتایا۔

"ہوں......" اس نے زہر خند لہجہ اپنایا۔

"تمہاری کلائیاں سونی ہیں اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ تم بھی منگنی توڑ چکی ہو۔" وہ طنز کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کی منگنی کا تحفہ انہوں نے میرے پاس امانت رکھوایا ہے ان کی خواہش ہے، وہ آپ کے ہاتھوں سے ہی پہنیں گی۔" رمیز نے بتایا۔

"مائی فٹ......" زمین پر پڑے پتھر کو ٹھوکر مار کر زریاب کار میں بیٹھ کر آفس کے لئے نکل گیا پیچھے دھول اڑاتی زریاب کی کار کو رمیز اور میرب دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

ارمان زبیری اور آفتاب زبیری اور شہلا زبیری تینوں بہن بھائی وحید زبیری کی اولاد تھے، جنہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بچوں کی شادیاں اپنے ہی خاندان میں کردی تھیں، اور یہ روایات ارمان زبیری، آفتاب زبیری اور شہلا زبیری نے قائم رکھنے کے لئے اپنے بچوں کی بات ان کے بچپن میں ہی پکی کردی تھی۔ ارمان زبیری کا اکلوتا بیٹا زریاب تھا جو ایک بزنس ٹائیکون تھا، گھر بھر کا بڑا تھا اس کی نسبت

میرب سے جو شہلا زبیری کی بیٹی تھی سے طے تھی اور آفتاب زبیری کے دو بچے تھے۔ رمیز اور عمارہ جن میں رمیز کی نسبت میرب کی چھوٹی بہن مائرہ سے طے تھی۔ شہلا زبیری کی دو ہی بیٹیاں تھیں، جنہیں لے کر وہ اپنے شوہر احسان کے ساتھ کینیڈا مقیم ہوگئی تھی۔ زریاب رمیز ہی کو نہیں چاہتا تھا بلکہ عمارہ کو اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح محبت و شفقت دیتا تھا، یہ بچے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے تو احسان اور شہلا کینیڈا سے پاکستان آگئے، آخر کو وطن کی مٹی کی محبت بھی انوکھی سی ہی ہوتی ہے۔ احسان نے یہیں بزنس ٹرانسفر کرلیا، میرب احسان کو دیکھ کر پہلی نظر میں زریاب فدائے دیدار ہوا تھا اور پھر دھوم دھام سے ان کی خوشی خوشی منگنی کی گئی تھی۔

☆☆☆

اکثر و بیشتر زریاب کا اپنی پھوپھی کے گھر جانا ہوتا تہذیب اس کا خاصا تھی، شرافت اس کی پونجی تھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میرب سے ملنے آیا کرتا تھا، میرب اس سے ملنے سے گریز کرتی تھی۔ ایک دن خلاف معمول وقت پر زریاب شہلا کے گھر پہنچا تھا۔ جہاں گیٹ پر داخل ہوتے ہی ایک لڑکی کی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں، شہلا پھپھو بار بار اسے ڈانٹ رہی تھیں۔ مگر وہ لڑکی جو ان کی چھوٹی بیٹی تھی مائرہ بدتمیزی کی حد کراس کر رہی تھی۔ زریاب کو دیکھ کر شہلا شرمندہ ہوگئی تھیں اور مائرہ نخوت سے پیر پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی، میرب نے زریاب کو جو دیکھا وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے گیٹ عبور کر گیا۔

"زریاب، زریاب سنو! تم کہاں جا رہے ہو۔" میرب اسے روکنے کی کوشش میں اس کے پیچھے باہر تک نکل آئی۔

"اچھا ہوا تم لوگوں کی اصلیت کا مجھے پتہ چل گیا، ایسی بدتمیز لڑکیاں ہو تم، پاکستان سے دور کسی غیر ملک میں پلی بڑھی ہو ماں باپ سے اس طرح پیش آتی ہو تو سسرال میں جا کر کیا گل کھلاؤ گی۔" زریاب بارعب لہجے میں بولا۔

"زریاب! اپنے ذہن میں غلط فہمی مت پالو، مائرہ کو امی نے بڑا لاڈ پیار دیا ہے، اس لئے وہ تھوڑی سی غصے میں کبھی کبھار آتی ہے ضدی طبیعت کی جو ٹھہری۔ تمہارا مجھ سے بدگمان ہونا ٹھیک نہیں ہے۔" میرب منمنائی۔

"میں تم سے منگنی توڑتا ہوں، جب چھوٹی بہن ایسی ہے تو بڑی بہن کیسی ہوگی؟"

زریاب اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر میرب کے ہاتھ میں تھما کر چلا گیا۔ وہ دن تھا اور آج کا دن میرب نے اسے معافی کے پیغامات موبائل میں میسج کے ذریعے کیے خطوط کے ذریعے، کارڈ کے ذریعے بھیجے تھے یہ وہ غلطی تھی جو اس نے کی ہی نہیں تھی۔ وہ تو کینیڈا میں پلنے بڑھنے کی سزا اور اپنی بہن کی بدتمیزی کی سزا بھگت رہی تھی۔

☆☆☆

رمضان شروع ہو چکے تھے، میرب ارمان زبیری اور آفتاب زبیری کے گھر رکنے کے لئے آئی تھی، اسے خاص کر اس کی ممانیوں اور رمیز اور عمارہ نے بلایا تھا۔

"ڈیئر کزن! کباب پراٹھے، خگینا، کھجلا، پھینی آپ نے زریاب بھائی کے لئے تیار کیا ہے نا خاص الخاص۔" رمیز نے کچن میں جا کر میرب احسان سے کہا۔

"کیوں نہ کرے آخر کو میری ہونے والی بہو ہے، زریاب اس سے بلاوجہ ہی ناراض ہے، وہ کہتے ہیں نا مردوں کا دل جیتنے کے لئے ان کی من پسند ڈشز ان کے آگے پیش کرو۔ شادی کے بعد میرب کو ہی تو اس کی ذمہ داری سنبھالنی ہے۔" بشریٰ نے میرب کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

☆☆☆

"ڈیئر کزن! شاپنگ کے لئے چلنا ہے تو فوراً تیار ہو جاؤ۔" رمیز مغرب کی نماز ادا کر کے آیا تھا، میرب افطاری کے برتن دھو کر ہٹی تھی۔ اس لئے رمیز

نے ہی آتے ہی کہا تھا۔

''زریاب کو گریز ہے شاپنگ کا صرف موقع ملنا چاہئے۔''

''مگر موصوف کہاں ہیں؟'' میرب نے پوچھا۔

''اور کون جارہا ہے شاپنگ پر؟'' کوریڈور سے نمودار ہوتے ہی رسٹ واچ باندھتے ہوئے زریاب نے پوچھا۔

''بھئی میرب کو بھی جانا ہے مگر یہ کہتی ہیں زریاب بھائی اپنی افطاری کی پلیٹ جس میں آپ اکثر پکوڑے بچا دیتے ہیں۔ جلدی ختم کریں پھر چلیں گی۔'' رمیز نے کہا۔

''مگر مجھ کو پکوڑے کھانا اچھا نہیں لگتا۔''

وہ ہنی کلر پینٹ کوٹ میں خوشبوؤں میں بسا خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا اور سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا۔

''کچھ لوگوں کو اچھی چیزوں کی عادت نہیں ہوتی نا۔'' وہ کنفیوژ ہوگئی تھی مگر سنبھل کر بولی تھی۔

''ارے میرب باجی! آپ یہ ان ڈائریکٹ بات کیوں کررہی ہیں؟ ڈائریکلٹی بات کریں، کیا خوفزدہ ہیں آپ زریاب بھائی سے؟''

عمارہ قدرے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے زریاب کی طرف دیکھ کر گویا ہوئی۔

''بھلا میں کیوں خوفزدہ ہونے لگی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے شانے اچکائے۔

بیگم شائلہ نے عمارہ کو آواز دی تھی وہ سرعت سے وہاں سے چلی گئی۔

وہ زریاب کی تپتی نگاہوں کی حدت اپنے چہرے پر محسوس کررہی تھی، وہ اب خود خوفزدہ ہو رہی تھی، وہ کوشش کے باوجود اس کی موجودگی میں خود کو سنبھال نہ پارہی تھی۔ رمیز کپڑے چینج کرنے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا، میرب بھی جاتے جاتے رک گئی راستے میں زریاب ایستادہ تھا۔ دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھے بے حد سنجیدگی سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا چاہتی ہو تم؟ کیوں میرے پیچھے لگی ہوئی ہو، تم مجھے پانے کا خیال دل سے نکال دو تمہاری جیسی بدتمیز لڑکیوں کے لئے نہ میرے دل میں جگہ ہے اور نہ گھر میں۔''

میرب کی آنکھوں میں نمی اتر آئی، پانی سر سے اونچا ہوگیا تھا اب وہ وہاں سے چلی گئی آتے ہوئے عمارہ اور رمیز ٹھٹکے تھے۔ انہوں نے زریاب کی بات سن لی تھی، تھوڑی ہی دیر میں میرب نے اپنا بیگ لے کر رمیز سے کہا تھا۔

''مجھے میرے گھر چھوڑ دیجئے، اور آپ سب شاپنگ کے لئے چلے جائیے۔''

راستے بھر کار میں رمیز، زریاب اور عمارہ خاموش تھے اور میرب کی آنکھوں سے سیال رواں تھا۔ گھر آتے ہی اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔

☆☆☆

''زریاب بھائی تین دن رہ گئے ہیں چاند رات کو میرب باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں، آپ نے کیا روگ دیا ہے، میری بدتمیزی کی سزا میرب باجی کو نہ دیجئے، میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں، میں اب بھی اونچی آواز میں بات نہیں کرتی ہوں اور نہ ہی سابقہ حرکت کرتی ہوں، میری نادانی میری ممی اور میرب باجی معاف کرچکی ہیں، آپ بھی معاف کردیں۔''

مائرہ کی ہچکیاں بندھ گئیں رمیز نے مائرہ کو صوفے پر بٹھایا زریاب نے اس ننھی سی بچکانہ نادان لڑکی کو دیکھا جو خاصی خجالت سے اسے دیکھ رہی تھی اور معافی مانگ رہی تھی، جو اپنی بہن میرب کی خوشیوں کے لئے اس کے پیروں پر گری تھی۔

زریاب کو شدید حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

''حیران ہوگئے ہیں زریاب بھائی اس کایا پلٹ پر۔ سائرہ میرب کو دیکھ دیکھ کر جو جیتی ہے، اب اس کی حالت دیکھ کر پھوپھو شہلا اور مائرہ دل گرفتہ رہتی ہیں۔''

رمیز نے بتایا زریاب نے خاموشی کا قفل نہ توڑا تو مائرہ نم آنکھوں سے واپس لوٹ گئی۔

☆☆☆

''زریاب بھائی، محبت بار بار دستک نہیں دیتی، آپ تو بہت خوش نصیب ہو، جو میرب آپ کی ہر زیادتی کے بعد بھی آپ سے بددل نہیں ہیں، وہ اب بھی آپ سے محبت کرتی ہیں اور آپ ایک نمبر کے کٹھور ان کی طبیعت پوچھنا تو درکنار بات تک نہیں کررہے ان سے۔''

رمیز نے موقع پاتے ہی زریاب کو سمجھانے کی سعی کی۔

''آج چاند رات ہے آپ کی امانت جو آپ نے منگنی پر میرب کو چوڑیاں پہنائی تھیں، یہ میں ٹیبل پر رکھ رہا ہوں۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

☆☆☆

عیدالفطر کا چاند نظر آگیا تھا۔ شہلا اور مائرہ عید کی تیاریاں کررہی تھیں اور میرب ان خوشیوں اور گہما گہمی سے قطعی بے نیاز تھی، اس کی اداس آنکھیں آسمان کو گھور رہی تھیں وہ کب سے چھت پر لیٹی کتنی اداس اور مضمحل تھی۔

''میرب باجی، میرب باجی۔'' مائرہ چھت پر آئی تھی۔

''ڈونٹ وری پلیز میرب باجی! آپ اداس مت ہوں، کبھی نہ کبھی زریاب بھائی کو اپنی زیادتیوں کا احساس ہو جائے گا۔''

میرب کو اداس دیکھ کر مائرہ کو شدید دکھ کا احساس ہوا تھا۔

''اہم ہم۔'' زریاب نے ہنکارا ابھرا۔

میرب سیدھی ہو کر بیٹھی اور مائرہ چونکی تھی۔

''عید کا چاند مبارک ہو۔''

اپنے ہاتھوں میں دو پیکٹ اٹھائے زریاب کھڑا مبارک باد دے رہا تھا۔

''عید تو کل ہے ابھی ایک گلاس لیموں پانی مل سکتا ہے؟'' مائرہ بے ساختہ کھلکھلا اٹھی۔

''کباب سے ہڈی نکالنے کا اچھا طریقہ ڈھونڈا ہے آپ نے......'' اور وہ جھینپ سا گیا۔

''اگر ساتھ میں پکوڑے بھی مل جائیں تو......''

مائرہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''پھر تو اور بھی اچھی بات ہے۔'' زریاب نے کہا۔

مائرہ لیموں پانی اور پکوڑے بنانے چلی گئی اور چھت پر وہ دونوں رہ گئے۔

''دوسروں کے رویے اور کردار کا عکس کسی کی شخصیت میں ڈھونڈنا اسے برا سمجھنا بنا سوچے سمجھے اور پرکھے کسی کو ہرٹ کرنا خاصا احمقانہ کام ہے۔'' میرب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں شرمندہ ہوں میرب! پلیز معاف کردو؟''

زریاب نے یہ کہتے ہوئے اپنے دونوں کان پکڑ لیے۔

اتنے بلند قامت اینگری ینگ مین کو اس طرح معافی مانگتے دیکھ کر وہ مسکرادی اور آہستگی سے بولی۔

''جائیے معاف کیا۔'' زریاب نے پیکٹ کھول کر سونے کی چوڑیاں اسے پہنانا شروع کیں تو وہ بے ساختہ بولی۔

''یہ تو آپ نے منگنی میں پہنائیں تھیں یہ تو آپ امانت لوٹا رہے ہیں اور میری عید کا تحفہ کہاں ہے۔'' میرب نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

زریاب نے دوسرے پیکٹ کو کھولا۔

''آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میرا عید کا جوڑا لال رنگ کا ہے؟'' زریاب نے لال رنگ کی چوڑیاں اس کے دوسرے ہاتھ میں پہنانا شروع کیں تو وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

''دیکھ لو، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، بس پتہ چل گیا۔'' وہ اسے ساری چوڑیاں پہنا چکا تھا۔

وہ اپنے سفید بازو پر سجی چوڑیوں کو دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''آج مجھے تینوں خوشی ایک ساتھ مل گئیں۔ چاند، عید اور یہ چوڑیاں۔'' زریاب اس کی معصومیت پر آسودگی سے مسکرادیا۔

......☆......

تبسم فیاض

افسانہ

میری عید بن جاؤ



''یار اصغر! جلدی آؤ ایک چیز دکھاؤں۔'' علی نے بڑی بے تابی سے اصغر کو آواز دی۔

جاتے جاتے اصغر کے قدم رکے اور اس نے علی کے کہنے پر مڑ کر دیکھا تو سامنے بلڈنگ کی چھت پر وہی نیلے آنچل میں معصوم سی لڑکی نظر آئی۔

''علی! بری بات یہ شریفوں کا شیوہ نہیں کہ چھت پر آ کر دوسرے گھروں میں تاک جھانک کریں۔'' اصغر نے علی کو ٹوکا۔

اصل میں دونوں چھتوں کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا اور علی کے اس طرح آواز دینے پر وہ لڑکی بری طرح پزل ہو گئی تھی۔ ان دونوں کی گفتگو اس تک باآسانی پہنچ رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی کپڑے سمیٹ نیچے کی طرف بھاگی۔

''یار! اس جوانی میں تم بڑھاپے کا ثبوت دیتے رہو اور شرافت کا نقارا بجاتے رہو۔''

علی نے اصغر کی بات پر ایک لیکچر دیا اور آگے بڑھ گیا۔ علی اور اصغر دونوں MBA کے اسٹوڈنٹ تھے اور یہ دونوں اکثر کمبائن اسٹڈی کرنے 3rd فلور پر بنے کمرے میں آجاتے تھے۔ ساتھ ہی دوسری بلڈنگ کی چھتیں بھی قریب تھیں اور اکثر سامنے والی چھت پر یہ لڑکی چھوٹے موٹے کام سے آتی رہتی تھی۔ سامنے کمرے کی کھڑکی سے اصغر کی نظر اکثر اس پر پڑتی تھی وہ نہایت سیدھی سادھی اور شریف سی لڑکی تھی جو نیچی نگاہ کیے وہ اپنے سارے کام نمٹا کر چلی جاتی لیکن جب علی ساتھ ہوتا تو وہ اکثر اپنی چلبلی طبیعت کی وجہ سے اس پر کمنٹ پاس کرتا رہتا تھا کبھی زور سے اور کبھی اصغر کے کان میں۔

جس پر اصغر اسے گھور کر رہ جاتا اور کبھی تنبیہ کرتا لیکن علی ایک کان سے سنتا اور ایک سے نکال دیتا۔

دن گزرتے گئے اور یہ لوگ انتھک محنت کے بعد MBA سے فارغ ہو گئے لیکن اصغر کو شاید عادت ہو گئی تھی اس لڑکی کو دیکھنے کی چھت پر آتے ہی نگاہ سامنے بلڈنگ کی چھت پر اٹھ جاتی کبھی وہ نظر آتی اور کبھی نہیں۔

☆......☆

اصغر کو ایک شاندار جاب کی آفر ہوئی اور یوں اصغر نے اپنے بہترین کیریئر کا آغاز کیا۔

جاب لگتے ہی صباحت بیگم کو اپنے بیٹے کی شادی کی فکر ستانے لگی۔

آئے دن گھر میں اصغر کی شادی کے خیالی پلاؤ بننے لگے۔ ادھر اصغر شادی کے ذکر سے نہ جانے کیوں بلڈنگ والی لڑکی کو سوچنے لگتا۔

لڑکی دیکھنے کا سلسلہ زور و شور سے جاری تھا۔ صباحت بیگم نے دو چار رشتے والیوں کو پکڑ لیا اور ہر وقت فون پر لڑکی کا تذکرہ رہتا۔

کافی دنوں سے وہ لڑکی نظر نہیں آ رہی تھی، اصغر کو بہت بے چینی تھی لیکن وہ اپنی بے چینی کی وجہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''مجھے کیا ہو گیا میں کیوں اس لڑکی کو سوچ رہا ہوں؟'' تنہائی میں اصغر نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''لیکن وہ تو اکثر اپنے کام سے اوپر آتی تھی ایسی کیا بات ہے جو وہ...... کہیں مجھ سے کوئی ایسی غیر اخلاقی حرکت تو سرزد نہیں ہوئی جس سے وہ پزل ہوئی ہو۔'' اصغر نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔

''کہیں اسے خدانخواستہ کچھ ہو تو نہیں گیا؟'' یہ سوچ کر اصغر نے جھرجھری لی۔ اللہ نہ کرے دل سے اصغر کے ادا ہوا۔

آخرکار صباحت بیگم نے لڑکی ڈھونڈ ہی لی۔ اور رمضان کے شروع ہونے سے پہلے اصغر کی بات پکی کرنے کا پروگرام بنایا اور باقاعدہ منگنی عید پر طے کرنے کے لیے بات آگے بڑھائی۔

''اصغر! دیکھو یہ لڑکی ہے وہ جو میں نے پسند کی ہے۔''

مجھے نہ دکھائیں آپ نے طے کر لیا کہ

اس لڑکی سے ہی کرنی ہے تو بس کافی ہے۔" اصغر کی آواز اور لہجے میں طنز نمایاں تھا۔

"کیا بات ہے اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو ہمیں بتا دو ابھی بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔" صباحت بیگم نے ٹھٹھک کر کہا۔

اب اصغر شرمندہ ہو گیا۔

"نہیں مما! ایسی کوئی بات نہیں بس میں اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا۔" اصغر نے بیان بدلا۔

"ارے تو اس میں کیا بات ہے شادی جب تم کہو گے جب کریں گے ہم تو بس ابھی ایک چھوٹی سی رسم کرنا چاہ رہے ہیں۔" صباحت بیگم خوشی سے کھل کر بولیں۔

"ٹھیک ہے مما! جو آپ بہتر سمجھیں۔" اصغر نے مرے دل سے کہا اور اٹھ کر اوپر آ گیا۔

☆......☆

آج اصغر کا دل بہت دکھا کیوں کہ آج خاموش محبت کا باب بند ہونے جا رہا تھا۔ کچھ بھی تھا اصغر کو اس کی سادگی نے بہت امپریس کیا تھا اور بات او کے ہونے کی وجہ سے اصغر کے سارے جذبات احساسات کسی اور لڑکی کے نام ہونے جا رہے تھے۔ سب میں مٹھائی تقسیم ہو رہی تھی اور ادھر اصغر بناوٹی طور پر بھی مسکرا نہیں پا رہا تھا۔

صباحت بیگم نے بات پکی کر دی تھی اور عید کے مزے کو دوبالا کرنے کے لیے خاص عید والے دن منگنی کا پروگرام بنایا تھا۔

آج اصغر نے تہیہ کیا تھا کہ اگر وہ چھت پر آئی تو اسے ضرور مخاطب کرے گا اور اصغر کی مراد پوری ہو گئی آج وہ چھت پر کچھ غیر ضروری چیزیں ہاتھ میں لیے آئی تھی۔

"ایکسکیوز می!" اصغر نے اسے مخاطب کیا۔

وہ چونک گئی۔ "جی کہیے۔"

اس دفعہ اصغر کافی پزل تھا۔ پہلی دفعہ وہ کسی لڑکی کو اس نظر سے دیکھ کر مخاطب کر رہا تھا۔

"وہ میں...... میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟" اصغر نے شریفانہ کلام کی ابتداء کی۔

"لیکن کیوں؟" اس لڑکی کو اصغر کی شرم سے مزہ آیا بہت کانفیڈنس سے وہ اصغر کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"میری مما! میرے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں انہیں آپ کے گھر بھیجوں، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔" اصغر نے بات پکی ہونے کے باوجود اپنی سی کوشش کر کے دیکھی۔

"سوری میں انگیج ہوں۔"

اس کے اس طرح کہنے پر اصغر کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

"سوری مجھے پتہ نہیں تھا۔" یہ کہہ کر اصغر مڑ گیا۔

"میرا نام اریشہ ہے۔" پیچھے سے آواز آئی۔

اصغر نام سن کر مڑا اور آگے بڑھ گیا۔ اریشہ کو اس کا یہ انداز پسند آیا۔

☆......☆

رمضان آ گئے اصغر کے شب و روز عبادت میں گزر رہے تھے اور اس کی دعاؤں کا محور صرف اور صرف اریشہ تھی۔ وہ اللہ کے کسی معجزے کا منتظر تھا۔ دن بدن دل اریشہ کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ کئی دفعہ تو اصغر نے سوچا کہ مما کو اس رشتے کو ختم کرنے کا کہہ دے۔ پھر ماں کی خوشی کے خیال سے چپ رہ جاتا۔

پورے رمضان اریشہ چھت پر نظر نہ آئی، یہی وجہ تھی کہ اصغر کا دل اسے دیکھنے کو بے چین تھا۔

چاند رات تھی آخر کار اریشہ چھت پر آ ہی گئی۔ خود بخود اصغر کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے۔

"اے خدا اس پیاری لڑکی کو میرے نام کر دے اور اس سال اسے ہی میری عید بنا دے۔" اریشہ، اصغر سے بے خبر سر پر دوپٹہ سجائے دعا میں مصروف تھی۔

"ارے بھئی نماز سے فارغ ہو کر جلدی جلدی کام نمٹانا ورنہ سب مہمان آنے لگیں گے۔"

عید کی صبح ہی اصغر کے کان میں آواز گونجی۔ اب تو اصغر کو پکا یقین ہو گیا کہ اریشہ اس کا نصیب نہیں کیوں کہ اس کا نصیب تو آج کوئی اور بنا بیٹھا ہو گا۔

سناٹے اصغر کی روح میں اتر گئے۔

☆......☆

علی عید ملنے آیا اور اس کی منگنی کی مبارک باد کے ساتھ اسے خوب چھیڑا۔

لیکن اصغر کا دل نہ جانے کیوں خوشی سے کوسوں میل دور تھا۔

منگنی کی رات بھی آ گئی اور اصغر رسم کے لیے اسٹیج موجود اپنی منگیتر کے انتظار کی وجہ سے بس ابھی تنہا ہی تھا۔ کیوں کہ رسم کا سلسلہ اس کے آنے پر ہی شروع ہونا تھا۔

سامنے پیچ کلر کے کامدار فراک میں موجود اریشہ کو آتا دیکھ کر اصغر چونک گیا۔

کیونکہ دائیں بائیں لوگ اریشہ کو دلہن کی طرح پکڑ کر اسٹیج پر لا رہے تھے۔

"دعائیں یوں بھی قبول ہوتی ہیں۔" اصغر نے سوچا۔

قریب آتے ہی نظروں کا ٹکراؤ ہوا اور اریشہ کے چہرے پر مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ ایک شرارتی ابھر گئی۔ ایک لمحے میں اصغر سمجھ گیا کہ اریشہ کو معلوم تھا کہ میں اس کا منگیتر ہوں۔

"اصغر بیٹا! دیکھو یہ وہ لڑکی ہے جو میں نے پسند کی ہے۔" دور کہیں خیال میں مما کی آواز سنائی دی اور اصغر اپنی عقل پر ماتم کر کے بیٹھ گیا۔

مما نے تو پوری کوشش کی تھی۔ تصویر دکھانے کی میں ہی زبردستی سوگ کرتا رہا۔

لیکن اس نے اپنے رب کی خدائی پر بھی بہت شکر کیا کہ اگر اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو کیا ہوتا؟

"ہو سکتا ہے یہ میری دعاؤں کا ہی ثمر ہو۔" اصغر کا دل خوشی سے جھوم گیا۔

بہت دل سے اصغر نے اپنی منگنی کو انجوائے کیا اور اریشہ سے کہا کہ ابھی منگنی کے بعد چھت پر آنا میں انتظار کروں گا۔

آہٹ کی آواز پر اصغر، اریشہ کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا تم جانتی تھیں کہ میں تمہارا منگیتر ہوں؟" اصغر نے سوال کیا۔

"جی جس دن سے رشتہ آیا ہے اسی دن سے جانتی تھی۔" اریشہ نے سچ بتاتے ہوئے نظریں جھکائیں۔

"ہوں...... تو مجھ سے یہ کیوں کہا کہ میں انگیج ہوں۔" اصغر نے اس کی شرمائی آنکھوں میں جھانکا۔

"تو میں انگیج تو تھی آپ سے۔ آپ نے مجھ سے میرے منگیتر کا نام ہی نہیں پوچھا تھا۔" بلا کا کانفیڈنس اصغر کو متاثر کر گیا۔

"پھر میں نے اپنا نام آپ کو بتایا کہ شاید آپ سمجھ جائیں لیکن؟ اس سے زیادہ میں آپ پر ترس نہیں کھا سکتی تھی۔" اریشہ نے شرارت کو سادگی میں چھپاتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں تم پر کوئی ترس نہیں کھاؤں گا۔ اب اتنا سب چھپانے کی تمہاری ایک ہی سزا ہے کہ تم آج ساری رات مجھ سے باتیں کر۔ تے ہوئے گزارو گی کیوں کہ میں آج یہ عید بھرپور منانا چاہتا ہوں اور آج کی عید میری تم ہی ہو۔ بتاؤ میری عید بنو گی؟" یہ کہتے ہوئے اصغر نے اپنا ہاتھ اریشہ کے سامنے پھیلا دیا۔

چند لمحے کے لیے اریشہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر مسکراتی ہوئی جوں ہی آگے بڑھی اصغر نے اس کا آنچل پکڑ لیا اور کہا۔

"مجھے جواب چاہیے۔" جھجکتی شرماتی اریشہ نے اپنا ہاتھ اصغر کے ہاتھ پر رکھ دیا جسے اصغر نے بہت مضبوطی سے تھام لیا کبھی نہ چھوڑنے کے لیے۔

......☆......

عائشہ ذوالفقار

افسانہ

ضرورت

"زونی یار رکو تو، بات تو سنو۔" ارحم پریشانی سے بولتا ہوا اس کے پیچھے باہر آیا تھا۔

"مجھے ڈائیورس چاہیے، بس......" وہ ایک ہاتھ میں زین کی انگلی اور دوسرے میں کپڑوں کا بیگ تھامے دروازے سے باہر نکلتی چلی گئی۔ ارحم دور تک اسے روکنے کے لیے آیا تھا مگر اسے نہیں رکنا تھا۔ ارحم انتہائی پریشانی کے عالم میں واپس آ کر عائشہ پر برس پڑا۔

"کیا کہا ہے تم نے زونی کو؟" وہ بوکھلا گئی۔

"ارحم خدا کی قسم میں نے اسے کچھ بھی نہیں کہا۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے اسے۔" ارحم اسے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔ کیا ہوا تھا زونی کو۔ "شاید تھک گئی تھی وہ۔ سوکن کا ساتھ سہتے سہتے۔ اس کے بچے پالتے پالتے۔ اس کی خدمتیں کرتے کرتے۔

اپنے شوہر کو اس کے ساتھ بانٹتے بانٹتے اور سوکن بھی وہ جو اس کے شوہر کی پہلی محبت تھی۔

☆......☆

وہ عائشہ اور ارحم۔ ارحم کی بڑی بہن حنا کے پاس اکٹھے پڑھتے تھے۔ پانچویں، آٹھویں۔ میٹرک، FSc ایک ساتھ بالکل ایسے ہی بچپن، لڑکپن، جوانی ایک ساتھ۔

ارحم اور عائشہ دونوں ایک جیسے تھے۔ منہ پھٹ، زبان دراز، جھگڑالو، بدتمیز، آتش فشاں کی طرح ابلتے ہوئے۔ طوفان کی طرح تباہیاں مچاتے ہوئے ایک دوسرے سے لڑتے ہر لمحہ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں لگے رہتے جب کہ......

زنیرہ لقمان، صبر و شکر کا نمونہ پانی کی طرح پرسکون چھاؤں جیسی ٹھنڈی، خود بخود ان دونوں سے پیچھے جاتی لیکن اس کے باوجود وہ ان دونوں کے لیے ضروری تھی۔ ان دونوں کا لازمی حصہ تھی۔ ہمیشہ ان دونوں کے درمیان ثالث وہی ہوتی۔ عائشہ کا ساتھ تو ہمیشہ وہی دیتی ارحم کو مان ہمیشہ وہی دیتی۔

اور محبت تو اسی سے ہونی چاہیے ناں جو ہمیشہ ساتھ دے۔ جو ہمیشہ مان رکھے۔ جو ہمیشہ پاس رہے۔ جو ٹھہرے پانی جیسی ہو، جو میٹھے چشمے جیسی ہو، جو ٹھنڈی چھاؤں جیسی ہو۔

لیکن نہیں اگر ایسا ہو جائے تو محبت کو اندھا کون کہے، پاگل کون کہے، دیوانہ کون کہے۔ سو ارحم کو بھی زنیرہ سے نہیں ہوئی جو ہمیشہ ساتھ دیتی تھی بلکہ عائشہ سے ہو گئی جس نے کبھی اس کا ساتھ نہ دیا۔ کیونکہ محبت اندھی ہوتی ہے۔

☆......☆

"زونی یار! گھر چلو پلیز۔" آج ستائیسواں روزہ تھا اور ارحم بھی شاید ستائیسویں دفعہ ہی آیا تھا۔

"نہیں جانا مجھے تم بس مجھے طلاق دے دو۔" اس کا ایک ہی مطالبہ تھا۔

"زونی یار! بیوی ہو تم میری ایسے خوامخواہ کیوں دے دوں طلاق؟" وہ جھلا گیا۔

"کیونکہ میں تمہاری زندگی میں خوامخواہ ہی ہوں ارحم! کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں میری۔ بلکہ مجھ سے زیادہ تمہارے گھر اور تمہاری بیوی کو ایک نوکرانی کی ضرورت ہے وہ رکھ لو، میں نہیں چلوں گی تمہارے ساتھ۔"
اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ ارحم تھک کے واپس چلا گیا۔

☆......☆

ایف ایس سی کے بعد ارحم اور عائشہ دونوں میڈیکل پڑھنے لگے۔ زونی کہیں پیچھے ہی رہ گئی۔ ارحم نے ہاتھ بڑھایا اور عائشہ نے مسکراتے ہوئے تھام لیا۔ ارحم نے راستہ دکھایا اور وہ آنکھیں بند کر کے چل پڑی۔ ارحم نے خواب دکھانے شروع کیے اور وہ نیند میں اترتی چلی گئی۔

بنا کچھ سوچے، بنا کوئی پرواہ کیے۔ اس بات کا خیال کیے بغیر کہ واپس پلٹنا پڑا تو کیا کریں گے اور وہی ہوا عائشہ کو واپس پلٹنا پڑ گیا۔ اس کے والد کو ایک اوسط گھرانے کے ڈاکٹر بیٹے کے مقابلے میں پچاس کنال پر مشتمل بنگلے اور ایک سو ایکڑ کی زمین کا مالک زیادہ بہتر لگا۔

ارحم تو دم بخود رہ گیا۔ ایسا تھوڑی نہ سوچا تھا۔ عائشہ کو یوں آسانی سے چھوڑ دینے کے لیے تو نہیں چاہا تھا ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے کا سوچا تھا۔ بہت رویا وہ عائشہ کے والد کے سامنے بہت گڑگڑایا۔

بہت منتیں کیں۔ خود عائشہ نے رو رو کر آنکھیں سوجھا لیں۔ باپ کے آگے ہاتھ جوڑ لیے مگر قسمت جیت گئی ارحم ہار گیا۔ عائشہ پرائی ہو گئی اور ارحم بری طرح ٹوٹ گیا۔

اجڑ گیا۔ بکھر گیا۔ رل گیا۔

آخر کار پھر اسی نے تھاما جو ہمیشہ سے تھامتی آئی تھی، جو ہمیشہ سے سنبھالتی آئی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ساتھ دیتی آئی تھی۔ زنیرہ لقمان...... ٹھنڈی چھاؤں جیسی۔

☆......☆

"زونی! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو میں معافی مانگتی ہوں۔ معاف کر دو مجھے سوری۔" آج اٹھائیسواں روزہ تھا۔ ارحم، عائشہ کو ساتھ لے کر آیا تھا۔

"نہیں عاشی! پلیز مجھے شرمندہ مت کرو۔ کوئی گلہ نہیں ہے مجھے تم سے۔ بس مجھے اور ارحم کے ساتھ نہیں رہنا۔" وہ بولی۔

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"کیوں کہ کوئی جواز نہیں ہے تم ارحم اور تمہاری بیٹیاں گھر مکمل ہے تمہارا۔ میری جگہ کہیں بھی نہیں ہے۔" وہ شاید درست تھی۔ عائشہ چپ کر گئی۔

"ایک بات یاد رکھنا زونی! تمہارے بغیر میرا گھر کبھی بھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ مر جاؤں گا لیکن تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔" وہ زین کو چومتے ہوئے بولا تھا۔

☆......☆

لیکن ارحم کو وہ ٹھنڈی چھاؤں نہیں چاہیے تھی۔ اس نے جو خواب بھی دیکھا تھا، وہی چاہیے تھی۔

اس کی زندگی میں شاید زونی کی جگہ کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔ بات بھی نہ کرتا تھا۔ آخر زونی نے ہی قدم بڑھائے۔ خود آگے بڑھ کے اسے آغوش میں لیا۔ اس کے زخموں پر مرہم رکھا۔ اس کے ہر آنسو کو اپنی پوروں سے صاف کیا۔ سانسوں کی تپش سے اسے سب کچھ بھلا دیا۔ ارحم شاید بھول بھی گیا زونی کی جانب کھنچنے لگا۔ اس کا عادی ہونے لگا اور جب اسے بھول گیا۔

جب میٹھی نیندوں کا عادی ہو گیا۔ جب ٹھنڈی چھاؤں کا باسی ہونے لگا۔

جب زنیرہ لقمان کا ہونے لگا تو...... تو وہ واپس آ گئی۔ روتی ہوئی۔ بلکتی ہوئی اور ارحم...... ارحم کی تو شاید روح تھی وہ کب برداشت ہوئے تھے اس سے عائشہ کے آنسو۔ کبھی نہیں۔ سو اب بھی نہ ہوئے اور وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ عائشہ نے چوٹ لگائی۔

ارحم کے آنسو نکلے۔

زونی نے دلاسہ دیا۔

عائشہ نے دوبارہ پکارا۔
اور ارحم زونی کے بازو جھٹکتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

☆......☆

"زونی! کل عید ہے یار چلو میرے ساتھ پلیز۔"
آج انتیسواں روزہ تھا۔ ارحم صبح ہی آ دھمکا تھا۔

"ارحم پلیز! مجھے تنگ مت کرو۔" زونی جھلا گئی۔

"زونی! آخر مسئلہ کیا ہے؟" وہ بولا۔

"مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں میری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بیوی کے نام پر عاشی ہے تمہارے پاس۔ تمہاری محبت تمہارا عشق، اولاد کے نام پر دو بیٹیاں ہیں تمہاری، بیوی کی طرح خوب صورت گھر ہے تمہارا، کلینک ہے تمہارا تم دونوں میاں بیوی کا اچھا سیٹ ہے۔ اس سب میں، میں کہاں ہوں ارحم؟ کہیں بھی تو نہیں۔ بس ہو گئی ہے میری تمہارے گھر میں نوکرانیوں کی طرح رہتے رہتے۔" وہ رو پڑی۔

"زونی! تم نوکرانی نہیں ہو۔" وہ اٹھ کے اس کے قریب آیا تھا۔

"تو پھر کیا ہوں؟" وہ بولی۔

"میری پہلی بیوی ہو تم، میرے گھر کا سکون ہو تم، میرے بیٹے کی ماں ہو تم، بالکل ادھورا ہوں میں تمہارے بغیر۔ عائشہ سے زیادہ قدر زیادہ عزت، زیادہ فکر اور زیادہ احترام کرتا ہوں میں تمہارا۔" زونی نے آنسو صاف کیے۔

"اس سے زیادہ پیار تو نہیں کرتے ہو ناں۔" ارحم نے اس کی کلائیاں تھامیں۔

"پیار سب کچھ نہیں ہوتا۔ میں رات کو پھر آؤں گا۔" کہہ کر وہ چلا گیا۔

☆......☆

عائشہ کا شوہر جنونی تھا۔ مار پیٹ کرتا تھا۔ وہ آوارہ پنچھیوں کی طرح تھی۔ نازک، من موجی...... برداشت نہ کر سکی۔ قید خانے سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگی اور جب ناکام ہو گئی تو ارحم کو پکار لیا۔ ارحم والہانہ بھاگتا ہوا اس کی طرف آ گیا۔ عائشہ نے خلع کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اس کے گھر والوں میں سے کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ والد نے بھی نہیں۔ صرف ارحم اس کے ساتھ تھا اور عائشہ جانتی تھی کہ چاہے پوری دنیا اس کا ساتھ چھوڑ دے ارحم نہیں چھوڑے گا اور واقعی ارحم نے نہیں چھوڑا۔ قدم قدم پر اس کے برابر کھڑا رہا۔ زونی کو جیسے بھول بھال گیا اور جس دن زونی اس کے بیٹے کی ماں بنی، اسی دن عائشہ کو طلاق مل گئی۔

اسے اس کے والد کے گھر چھوڑتے ہوئے جب وہ گھر آیا تو گھر خالی...... ایکدم سے یاد آیا تو اسپتال بھاگا۔

زونی آنسوؤں بھری آنکھوں سے رخ موڑ گئی۔

"میرا بیٹا۔" وہ بے تحاشا خوش ہوا تھا اور پھر جیسے ہی عائشہ کی عدت پوری ہوئی ارحم نے اس سے نکاح کر لیا۔ زونی کو بتانے کی بھی زحمت نہ کی۔ وہ ساری رات زین کو گود میں لیے روتی رہی اور صبح نم آنکھوں سے مطالبہ کر دیا۔

"مجھے طلاق چاہیے۔" ارحم نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما۔

"مر تو جاؤں گا لیکن تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔"

عائشہ کے لیے وہ وہی زونی تھی کئی سال پہلے والی۔ وہ اب بھی ارحم سے جھگڑ کے اس کے پاس رونا رونے آ جاتی۔ اس نے کبھی زونی کے سامنے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ ارحم کی من چاہی ہے اور زونی ان چاہی۔ کبھی اسے یہ احساس نہیں دلایا کہ ارحم اس سے محبت کرتا ہے۔ زونی سے نہیں۔ اسے سوکن نہیں سمجھا، بہن بھی نہیں سمجھا۔ بلکہ دوست سمجھا۔ بچپن کی دوست۔ جڑواں بیٹیوں کی پیدائش پر عائشہ کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی تو زونی ہی تھی جس نے اس کی بیٹیوں کو آغوش میں لیا۔ خیال رکھا۔ پیار دیا۔ عائشہ موت کے منہ سے واپس آئی تو زونی ہی تھی جس نے اسے دوبارہ جینے کے قابل بنایا۔ خاموش لبوں اور بے غرض آنکھوں کے ساتھ اس کا خیال۔











رکھا۔ عائشہ اور ارحم نے جب مل کے اسپتال سیٹ کیا تو زونی ہی تھی جس نے پیچھے سے پورا گھر سنبھالا۔ بچے سنبھالے۔ عائشہ کی بیٹیاں اس سے زیادہ زونی سے مانوس تھیں۔ کھانے پینے سے لے کر پہننے اوڑھنے تک ہر کام زونی کے سپرد ہو گیا اور زونی......

وہ غیر مطمئن ہوتی چلی گئی۔ وہ ارحم کی محبت نہیں تھی۔ بس یہ ہی سوچ اس کے ذہن سے نہ نکلتی اس دن اسے ہلکا ہلکا بخار تھا جب عائشہ کلینک سے واپس آئی۔ کچھ بچوں نے تنگ کیا ہوا تھا اور کچھ وہ خود تھکی ہوئی تھی۔ اوپر سے عائشہ نے کچن کے آگے سے گزرتے ہوئے آرڈر لگا دیا۔

"زونی! چائے تو بنا دو۔" زونی کی بس ہو گئی۔

"نوکرانی نہیں ہوں تمہاری۔" اونچی آواز میں کہتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں آئی تھی۔ کپڑے بیگ میں ڈالے۔ زین کی انگلی پکڑی اور باہر آ گئی۔ عائشہ نے فوراً کال کر کے ارحم کو بلایا۔

"زونی یار! رکو تو بات تو سنو۔" اس نے بہت روکا مگر زونی کی شاید بس ہو گئی تھی۔

☆......☆

"زونی! میرا گھر اجڑ گیا ہے یار، سائرہ اور مائرہ ہر وقت روتی رہتی ہیں۔ عائشہ سے نہیں قابو آتیں۔ اتنے بد مزہ کھانے بناتی ہے وہ جس کی حد نہیں۔ بیزار سا ہو گیا ہے سارا گھر۔ سوگوار سا، بوجھل سا، زین کے بغیر میرا اپنا دل نہیں لگتا۔ عائشہ الگ بولائی بولائی پھرتی رہتی ہے اور میں......"

آج چاند رات تھی۔ ارحم اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔

"ادھورا سا ہو گیا ہوں میں۔ تمہارے ہاتھ کی چائے تمہارے ہونے کا احساس، تمہارے ہونٹوں کا لمس، تمہارے بازوؤں کا گھیرا، تمہارے ہاتھ کا بنا کھانا، تمہاری باتیں، تمہاری ہنسی......" ارحم کے لہجے میں نمی گھل گئی۔

"کچھ بھی نہیں بھول پا رہا میں۔ ایسے ادھورا سا ہو کر کیسے جیوں گا میں زونی۔" زونی مسکرائی۔

"تو پھر ضرورت ہی ہوئی ناں میں تمہاری۔"

"ضرورت ہوتی تو کسی اور سے پوری کر لیتا، عادت ہو تم میری، کیسے چھوڑوں۔" وہ بولا۔

"پیار نہیں کرتے ہو ناں مجھ سے؟" وہ روئی تھی۔

"پیار کسے کہتے ہیں زونی، تمہارے لیے میری فکر، میرا احساس، میرا احترام، یہ پیار ہی تو ہے ایسے پیار کا کیا فائدہ جس میں یہ سب نہ ہو۔" زونی بول نہ سکی۔

"وہ عاشی بے وقوف کل سے رو رہی ہے۔ کیوں کہ اسے تمہاری ضرورت ہے۔ میری بیٹیوں کو تمہاری ضرورت ہے، مجھے تمہاری ضرورت ہے زونی...... ضرورتیں پیار سے زیادہ شدید ہوتی ہیں۔" [illegible] اس کے دونوں ہاتھ تھامے تھے۔

"زونی! روایت توڑ بھی دینی چاہیے ناں ضروری تو نہیں کہ انسان ہمیشہ پہلی بیوی کی وفاؤں کا بوجھ سر پر اٹھائے پھرتا رہے اور اپنی محبت مار دے یا پھر محبت کے مل جانے پر پہلی بیوی کی وفاؤں کو بھول جائے۔ محبت اور وفا ایک ساتھ بھی تو چل سکتے ہیں ناں میں تمہاری ضرورت ہوں۔ وہ میری ضرورت ہے اور تم ہماری ضرورت ہو۔ تو کیوں ناں ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری کرتے کرتے زندگی گزار لیں۔ یہ کم از کم ہم تینوں کے اجڑنے سے تو بہتر ہوگا۔" زونی نے آنسو صاف کیے۔

"زونی یار! خدا کا واسطہ ہے واپس آ جا پلیز۔" عائشہ نہ جانے کب وہاں آئی تھی تھکی ہوئی۔ زونی مسکرا دی۔ عید کا چاند نظر آ گیا تھا۔

"چلو۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی تھی۔

کوئی ایسے ہی نہیں کہہ دیتا کہ

"مجھے تمہاری ضرورت ہے"

اسے آپ پر اتنا مان، اتنا بھروسہ ہوتا ہے تو کہتا ہے لیکن اگر آپ آگے سے اس کی ضرورت کو اس کا خود غرض پن سمجھیں تو زندگی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔

☆......☆

قمروش شہک

سلسلہ وار ناول

قسط نمبر 20

تیرے پیار کی خوشبو

''زرمیل! آپ مجھے ثمرن بھابی کے پاس لے کر چلیے وہ میرا فون تک ریسیو نہیں کر رہی ہیں، زرمیل وہ مجھ سے بہت سخت ناراض ہیں۔ مجھے یہ احساس بار بار مارتا ہے کہ وہ اس گھر سے صرف میری وجہ سے گئی



ہیں میں انہیں یہاں منا کے لے آؤں گی۔'' اس نے زرمیل کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

''ثمرن تم سے بالکل بھی ناراض نہیں ہے میری اس سے روز بات ہوتی ہے آج کل اس کی طبیعت ذرا خراب ہے۔''

''آپ کی بات ہوتی ہے تو پھر آپ اپنے فون سے، اچھا میری ثمرن بھابی سے بات کرائیے۔'' اس نے بے صبری سے کہا۔

''ابھی رک جاؤ کچھ دن بعد لے چلوں گا تمہیں۔''

''ٹھیک ہے مگر ابھی تو آپ بات کرائیے بلکہ یوں نہ کریں کہ ہم انہیں یہاں منا کے لے آئیں آج پارٹی ہے۔ ان کی کمی سب کو محسوس ہوگی۔'' اس نے اپنے بہتے آنسو صاف کیے تھے۔

''میری جان صبر کرو، اچھا آج کا یہ فنکشن نکل جائے پھر کل چلتے ہیں او کے۔'' زرمیل نے اس کی جلد



بازی پر اس کو دونوں شانوں سے تھام لیا۔
''آپ سچ کہہ رہے ہیں۔'' وہ منمنائی، جس پر وہ دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔
''ہاں یار! اب دیر مت کرو جلدی سے تیاری پکڑو مہمان آنے والے ہیں۔'' اس نے اس کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا اور خود تیار ہونے کے لیے ڈریسنگ روم میں چلا گیا تھا۔
رات کو لان میں جیسے میلہ لگا ہوا تھا تقریباً سبھی لوگ جمع تھے سوائے ثمرن کے جس کی کمی گھر والوں نے سب نے ہی نوٹ کی تھی مگر ارشد کو شدت سے اس کی کمی کا احساس ہوا تھا۔ اس کی سمجھ نہیں آرہا تھا کس منہ سے وہ اس کا سامنا کرے، بہت غرور سے کہا تھا کہ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے اور کتنی بے دردی سے نکل جانے کو بھی کہا تھا۔ بے حسی، بے اعتنائی کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے تھے اس نے اس وقت وہ یقیناً سخت ناراض تھی اس سے شادی کی دس سالہ زندگی میں اسے نہیں یاد پڑتا کہ اس نے کبھی ثمرن کو منایا بھی ہوگا۔ ہمیشہ سے اسی نے منایا چاہے وہ ہی غلطی پر کیوں نہ ہوا اور آج بھی ہمیشہ کی طرح وہی غلطی پر تھا۔
''تو وہ اس کو نہیں منائے گی مجھے ہی منانا پڑے گا مگر کیسے...... کیسے جائے اس کے پاس۔'' یہاں آکر اس کی انا جوش مارنے لگتی تھی۔ اس کی ضدی طبیعت عود کر آجاتی تھی۔
''کیا سوچ رہے ہو؟'' حسن اسی کے پاس اپنی کولڈ ڈرنک کی بوتل لیے چلا آرہا تھا۔
''آں...... ہاں......'' وہ بری طرح چونک کر حسن کو دیکھنے لگا تھا۔
''نہیں کچھ بھی تو نہیں۔'' اس نے حسن کے ہاتھ سے کولڈ ڈرنک لے لی جو وہ اس کے لیے بھی لایا تھا۔
''ارشد! ثمرن بھابی نظر نہیں آرہی ہیں ابھی تک آئی نہیں ہیں اپنے میکے سے۔''
''ہاں وہ وہیں ہے ابھی۔'' ارشد نے کولڈ ڈرنک کا ایک سپ لیا تھا۔
''مگر آج تو گھر میں فنکشن ہے تو آج انہیں یہاں ہونا چاہیے تھا نا۔'' بہت عام سا اس کا لہجہ تھا۔
''ہوں۔''
صرف ہوں پر ہی اکتفا کیا تھا حسن نے بغور ارشد کا جائزہ لیا تھا اسے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔
''سم تھنگ رونگ۔''
''تمہیں ایسا کیوں لگا؟'' الٹا سوال داغا تھا۔
''یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہے۔'' حسن کی نظریں بلا ارادہ ہی سامنے اٹھی تھیں۔ جہاں وانیہ کھڑی معصوم کی کسی بات پر مسکرا رہی تھی کاسنی نیٹ کی فراک جس پر بہت خوب صورت کام کیا گیا تھا۔ نہایت غضب کی لگ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں میچنگ چوڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ نازک سی جیولری میں وہ نازک سی گڑیا لگ رہی تھی۔ جو سب سے زیادہ کچھ نمایاں ہو تو اس کی صراحی دار گردن، جس پر ایک کالا سا تل اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگاتا تھا۔ وانیہ کی نظر بلا ارادہ ہی اس جانب اٹھی تھی۔ تو حسن کو خود پر نظریں مرکوز پائیں۔ اس کی ہونٹوں کی مسکراہٹ اندر ہی جیسے کہیں دم توڑ گئی تھی ان بلوریں آنکھوں میں بہت چمک تھی اسے وہ دو آنکھیں یاد آگئیں، مگر یہ حسن ہے ارشد بھائی کا فرینڈ اور پھر وہ کیوں اس سے سہم جاتی ہے اس دنیا میں ہزاروں کروڑوں لوگوں کی بلوریں چمکتی آنکھیں ہوں گی ایک آفریدی تو واحد نہیں تھا۔ وہ پھر وہاں رکی نہیں معصوم سے کچھ کہہ کر چلی گئی تھی حسن کی بلوریں آنکھوں نے دور تک اس پری وش کا پیچھا کیا تھا جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

''تم نے بتایا نہیں۔'' ارشد نے خاموشی سے حسن کو دیکھا تھا حسن بہت کچھ سمجھ گیا۔
''لڑائی ہوئی ہے۔''
''ہوں......''
''تم نے منایا نہیں۔'' ارشد نے ایک سرد سانس اپنے اندر اتاری تھی۔
''نہیں۔''
''کیوں؟''
''ڈرتا ہوں اگر نہ مانی تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔''
''یہ تو سراسر غلط بات ہے۔ تمہیں کوشش کرنی چاہیے تھی نا اور میں وثوق سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ثمرن بھابی بھی دل کی بہت اچھی ہیں۔ ان صنف نازک کا دل بہت نرم و ملائم ہوتا ہے ذرا سا پیار دو یہ تم پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیں گی۔''
''جانتا ہوں ایک عرصہ ہم نے ساتھ گزارا ہے اس کی ایک ایک خوبی سے واقف ہوں۔''
''پھر بھی منانے میں عار محسوس کر رہے ہو، وہ کہتے ہیں نا کہ وجودِ زن سے ہے کائنات میں رنگ تو میرے بھائی کیوں اپنی زندگی بے رنگ کرتا ہے جا جا کر لے آ میں نے یہ بھی نوٹ کیا ہے کہ شاید نجمہ آنٹی بھی تجھ سے کچھ خفا خفا سی ہیں۔ اب دیکھ ناں اس محفل میں تقریباً سب نے ہی ثمرن بھابی کا نجمہ آنٹی سے پوچھا ہوگا۔''
''ہوں۔'' ارشد کے سامنے ہی نجمہ بیٹھی تھیں اور ساتھ ایک دو خواتین بھی بیٹھی تھیں جو یقیناً ان سے ثمرن کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے کچھ شرمندہ شرمندہ سی لگی تھیں۔
''تو یار! وہ خود بھی تو آسکتی ہے کوئی بھگائے گا تو نہیں۔'' اپنا ہی لہجہ کچھ پست سا لگا تھا۔
''یہ تو تو اپنے دل سے پوچھ کہ وہ یہاں خود سے آسکتی ہیں یا تجھے لینے جانا چاہیے انہیں۔'' ارشد نے آگے کچھ نہیں کہا کیوں کہ اس کے پاس بولنے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔
''ہیلو عارفین!''
''ہیلو سلجوق! اٹ آ سرپرائز کیسے ہو یار؟'' عارفین کو بہت خوشی ہوئی تھی سلجوق آفریدی کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ خلوص سے اس سے بغلگیر ہوا تھا۔
''واپس کب آیا؟''
''کافی ٹائم ہو گیا ہے مگر کچھ تمہاری بھی مصروفیت تھی اور کچھ میری بھی کہ ہمارا ملنا آج ہوا ہے۔''
دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تھے۔
''زرمیل سے روز ملاقات نہیں مگر فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ ابھی پچھلے ہفتے میری فیملی بھی یہاں آچکی ہے زرمیل کے پیرنٹس سے ملنے۔''
''اچھا مجھے زرمیل نے کچھ نہیں بتایا۔''
''اگر بتا دیتا تو سارا سرپرائز ختم ہو جاتا اور تیرے چہرے پر جو یہ ہنسی اور خوشی ہے وہ دیکھنے کو نہیں ملتی جو کچھ دنوں سے بالکل مفقود ہے۔'' زرمیل نے پیچھے سے کہا تو دونوں نے اسے دیکھا تھا۔
''جی تو اب بتائیے مسٹر عارفین بیگ صاحب کیا پرابلم ہے آپ کے ساتھ۔''

”میرے ساتھ......!نہیں تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔“

”مجھے زرمیل نے سب بتا دیا ہے، اس لیے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ورنہ ہم آرمی والے اندر سے بات نکالنے کا فن جانتے ہیں۔“ سلجوق آفریدی نے مصنوعی دھمکی دے کر اسے گھورا تھا۔ عارفین نے زرمیل کو دیکھا۔

”سوری یار! مگر کیا کرتا تو مجھے تو پتا نہیں رہا تھا سلجوق کی پوسٹنگ یہیں کراچی میں ہوگئی ہے تو میں نے ہی اسے تمہارے بارے میں سب بتا دیا۔“ عارفین نے زرمیل کو کچھ نہیں کہا ویسے بھی اب زرمیل اور سلجوق آفریدی سے چھپانے کا کوئی جواز نہیں بنتا وہ اتنے اچھے دوستوں سے اپنا مسئلہ ڈسکس ضرور کرے گا اور پھر سلجوق آفریدی ایک آرمی مین ہے اس کے پاس یقیناً اس کا حل ہوگا کیوں کہ پانی اب سر سے اوپر سے جاتا نظر آرہا تھا۔

حسن اندر جا رہا تھا اور دانیہ اندر سے باہر آرہی تھی۔ بے دھیانی میں زبردست تصادم ہوا تھا ان دو بازوؤں نے اگر اسے نہ سنبھال لیا ہوتا تو وہ زمین بوس ہو چکی تھی۔ آنکھیں سختی سے میچ لی تھیں۔ ٹکراؤ اتنا زوردار تھا کہ لگ رہا تھا کہ آنکھیں شاید اسپتال میں ہی کھلیں گی مگر کوئی اسے نہایت دھیرے دھیرے پکار رہا تھا۔ دانیہ نے ہلکے ہلکے آنکھیں کھولیں تو خود کو حسن کی مضبوط بانہوں میں قید پایا تھا۔

”آل یو رائٹ؟“ مگر وہ تو جیسے سن ہی نہیں رہی تھی۔

”مس دانیہ! کیا آپ ٹھیک ہیں؟“ حسن نے اسے تھوڑا سا جھنجھوڑا تھا۔ وہ ہوش کی دنیا میں لوٹی تھی اپنی پوزیشن کا خیال آیا تو جی بھر کے شرمندہ ہوئی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر جا کر کھڑی ہوگئی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ سر جھکائے اپنی غلطی پر پشیمان لگ رہی تھی۔

”اٹس او کے بٹ آئی سے یو آل رائٹ۔“ حسن کی گھمبیر آواز پر اس نے نہایت چونک کر اسے دیکھا تھا سب کچھ تو وہی تھا وہی لمبا چوڑا پٹھانوں جیسا قد و قامت، وہی پٹھانوں جیسی سرخ و سفید رنگت، وہی چمکتی بلوریں آنکھیں، ویسی ہی بھاری آواز، ویسے ہی بھورے گھنے بال صرف چہرہ وہ نہیں تھا۔ اس کے اتنے قریب ہونے پر جانے کیوں اس کا دل پہلے سہما اور پھر دھڑکا تھا۔

”اگر آپ نے پوری طرح میرا جائزہ لے لیا ہو تو بتا دیں کہ آپ ٹھیک ہیں۔“

”جی میں ٹھیک ہوں۔“ وہ خفیف سی ہو کر رہ گئی تھی۔

”اوہ شکر ہے خدا کا ورنہ شاید آپ کا جواب سننے کے لیے مجھے پوری رات یہیں کھڑے رہنا پڑتا۔“ وہ ہولے سے مسکرا دیا تھا مگر اس کے برعکس دانیہ کی دل کی حالت یکسر الگ تھی اسے اپنے جسم پر ابھی بھی اس کے لمس کی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ اس سے مزید وہاں رکنا محال ہو رہا تھا۔ اس لیے حسن کی طرف دیکھے بغیر وہ وہاں سے لان میں چلی آئی تھی۔ پیچھے حسن کے گداز عنابی لبوں پر دلکش سی مسکراہٹ کھلی تھی۔ اسے یہ نازک سی لڑکی بہت پسند آئی تھی۔

حسن اندر جا رہا تھا کسی نے اسے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔

”ایکسکیوز می۔“ حسن نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔ کوئی پچیس چھبیس سال کا نوجوان لڑکا کھڑا تھا۔

”جی کہیے۔“

”مجھے ایسا لگتا ہے میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں نا صرف بلکہ بہت قریب سے دیکھا بھی

ہے۔“ حنین آفریدی مزید اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

”اچھا آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے؟“ حسن نے نہایت پرسکون ہو کر پوچھا تھا۔

”یہ تو میں نہیں جانتا مگر مجھے کچھ شک ضرور ہے اگر میرا شک پورا ہوا تو میں آپ سے ضرور کہوں گا۔“ حنین آفریدی نے بغور اس کی بلوریں آنکھیں دیکھی تھیں۔

”ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا۔“ حسن مسکرا دیا تھا۔

”اینڈ آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا کیوں کہ میں بہت تیز ہوں۔“

”اوہ رئیلی۔“ حسن کو اب اس لڑکے سے بات کرنے میں مزہ آنے لگا تھا۔

”آپ جانتے ہیں نا میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔“ حنین آفریدی کے شک کو یقین کی زبان ملتی جا رہی تھی۔

”نہیں میں کچھ نہیں جانتا۔“

”ٹھیک ہے آپ کچھ نہیں جانتے تو میں آپ سے دوبارہ ضرور ملوں گا۔“ حنین آفریدی کی بلوریں آنکھوں میں سب کچھ جان لینے کا عزم تھا۔

”آئی ویٹ۔“ اور پھر حسن وہاں مزید نہیں رکا تھا۔ اندر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف جانے لگا۔

”میں پتا لگا کر ہی رہوں گا کہ آپ وہی ہیں جو میں سمجھ رہا ہوں۔“ حنین آفریدی نے حسن کی چوڑی پشت دیکھی تھی۔

☆......☆

”تو یہ مسئلہ ہے۔“ سلجوق آفریدی نے پرسوچ انداز میں اسے دیکھا تھا۔

”ہوں۔ جو کچھ بھی تھا میں نے سب کچھ تمہیں سچ سچ بتا دیا ہے۔“ عارفین نے ہولے سے کہا۔

”دیکھا کتنا بڑا پہاڑ اپنے دل پہ لیے پھر رہا ہے اور اگر میں آج بھی اسے نہیں پکڑتا تجھ سے نہیں ملواتا یہ کچھ بھی اپنے منہ سے بولنے والا نہیں تھا۔“ زرمیل نے عارفین کو سنجیدگی سے گھورا تھا۔

”اچھا ایک بات بتاؤ عارفین تمہیں پورا یقین ہے وہ مووی اور تصویریں معصوم بھابی کی نہیں ہیں وہ کوئی اور ہے۔“ سلجوق آفریدی نے اپنے تفتیشی سوالات شروع کر دیے تھے۔

”سو فیصد یقین ہے۔“ عارفین نے وثوق سے کہا تھا۔

”معصوم اور اس لڑکی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ٹریک فوٹو گرافی سے شکل تو بدل سکتے ہیں باڈی نہیں جب اسفند درانی نے مجھے تصویریں اور مووی دکھائی تھیں تو میں دیکھتے ہی سمجھ گیا اور پہچان بھی گیا تھا کہ وہ معصوم نہیں ہے۔“

”پھر تم نے اسی وقت اسفند درانی کو کیوں نہیں کہا؟“

”میں جاننا چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کا اصل مقصد ہے کیا؟“

”آل رائٹ تم مجھے وہ سب دو اور یہ بھی بتاؤ کہ تمہارے امپلائے حیدر عباسی نے کیا رپورٹ دی ہے؟“

”اس نے کہا ہے کہ وہ آج کل میں اور انفارمیشن جمع کر کے اکٹھی دے گا۔“

”او کے تم یوں کرو مجھے حیدر عباسی کا نمبر دو اب یہ معاملہ میں اپنے طریقے سے ہینڈل کروں گا۔“

"مگر دھیان رہے سلجوق کہ وہ لوگ کسی قسم کا جانی نقصان نہیں پہنچائیں۔" زرمیل نے حالات کے پیش نظر آگاہی دی تھی۔

"ڈونٹ وری ویسے تو اتنی ہمت نہیں ہے مگر اپنا عارفین ہے نا بلیک بیلٹ وہ کس دن کام آئے گا۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی یہ کام نہایت احتیاط اور خفیہ ہو تو اچھا ہے مجھے اتنا تو اندازہ ہو گیا ہے کہ اسفند درانی اور یاور درانی بہت چالاک اور شاطر انسان ہیں۔ اگر ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو ثبوت مٹانے میں دیر نہیں کریں گے۔" عارفین نے پہلے زرمیل کو پھر سلجوق آفریدی کو دیکھا تھا۔

"بھئی تم نے ٹھیک کہا ہے مگر تم اس کی فکر مت کرو یہ کیس میرے ہاتھ آ گیا ہے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" سلجوق آفریدی نے عارفین کی بات سے پورا پورا اتفاق کیا ہے۔

"اچھا ایک بات اور وہ یہ کہنا چاہتا ہوں اس سارے معاملے سے مقسوم کو دور رکھا جائے تم جو بھی انویسٹی گیشن کرو گے میں چاہتا ہوں یہ سب مقسوم کے علم میں نہ ہو۔" عارفین کی نظر سلجوق آفریدی سے ہوتی ہوئی سیدھی مقسوم پر پڑی تھی۔ جو زرمیل کے ساتھ کچھ پژمردہ سی بیٹھی تھی۔ ان چند دنوں نے مقسوم کو بالکل مرجھا دیا تھا۔

"میری کوشش رہے گی مگر میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ ہو سکتا ہے کچھ ایسی باتیں کچھ ایسے راز جو مقسوم بھابی کو معلوم ہوں اور ہم سے پوشیدہ تو ان کی ہیلپ تو چاہیے ہو گی۔" زرمیل اس کی فیلنگ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس لیے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"بے فکر رہو اس سارے معاملے یا سلسلے میں انویسٹی گیشن کے دوران مقسوم کا کوئی ذکر نہیں ہو گا۔"

"اور تمہیں ایک بات اور بھی بتاؤں اسفند درانی اور یاور درانی گناہ گار ہیں تو انہیں سزا بھی وہاں کا قانون دے گا اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہاں کا قانون کتنا سخت ہے۔ وہ ڈائریکٹ ان کاؤنٹر کرتے ہیں یا زندگی بھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیتے ہیں۔" سلجوق آفریدی نے فوراً عارفین کی پریشانی بھانپ لی تھی۔

"آئی انڈر اسٹینڈ سلجوق! بٹ مجھے مقسوم کی فکر ہے۔" اس نے مقسوم کی طرف سے نگاہیں ہٹائی تھیں۔

"آئی نو ہمیں بھی مقسوم بھابی کی فکر ہے میرے یار۔" سلجوق آفریدی نے عارفین کے کسرتی بازو پر ہولے سے تھپکی دی تھی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عارفین ٹھیک سے مسکرا بھی نہیں سکا۔ پھر ان تینوں کا رخ دوسری باتوں کی سمت مڑ گیا تھا۔

☆......☆

وانیہ نیچے رضا کو دینے جا رہی تھی کہ بیچ کے پورشن میں ارشد اسے مل گیا تھا۔

"وانیہ، رضا کو مجھے دے دو میں ذرا باہر جا رہا ہوں تو اسے لے کر جاؤں گا۔"

"جی ارشد بھائی!" اس نے رضا کو ارشد کی گود میں دے دیا۔ وانیہ کی نظر بڑے صوفے پر پڑی جہاں حسن آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا یا شاید سو رہا تھا۔

ارشد تو رضا کو لے کر فوراً ہی نیچے لے کر چلا گیا تھا مگر وہ جانے کیوں وہاں کھڑی رہی حسن میں جانے کون سی ایسی کشش یا مقناطیسی طاقت تھی جو بہت چاہنے کے باوجود اس کے قدم اٹھ نہیں رہے تھے۔ وہ

بغور اسے دیکھنے لگی تھی اور شاید اس کے دیکھنے کا ہی اثر تھا کہ حسن نے اپنے چہرے سے بازو ہٹا لیا تھا اور اس کو دیکھنے لگا تھا۔ وانیہ ان بلوریں آنکھوں سے بری طرح گھبرا کے رہ گئی تھی۔ وہ اس قدر سرخ ہو رہی تھیں کہ ایک لمحے کے لیے وہ ڈر کے رہ گئی۔ اس نے آفریدی کی آخری دفعہ وہ بلوریں آنکھیں دیکھی تھیں۔ جن میں غصے کی وجہ سے سرخ ڈورے ہلکورے لے رہے تھے اور انہی بلوریں آنکھوں نے اسے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اس کا غرور اعتماد سب مٹی میں ملا دیا تھا۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی تھی۔

"وانیہ سنیے۔" وہ واپس پلٹی تو نہیں تھی مگر رک ضرور گئی تھی اس کے رکنے پر حسن اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"پلیز مجھے ایک کپ گرم چائے بنا کے دے دیں میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے اور شاید بخار بھی ہو رہا ہے۔" اس نے اس قدر مسکینی صورت بنا کر کہا تھا کہ وہ پلٹے بنا رہ نہ سکی اور بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ اس نے وانیہ کے دیکھنے پر مزید معصومیت بھری شکل بنا لی تھی۔ وانیہ نے نجمہ کے بیڈروم کا بند دروازہ دیکھا تھا۔

"نجمہ آنٹی گھر میں نہیں ہیں۔ ورنہ میں آپ کو یہ زحمت ہرگز نہ دیتا۔" اس نے وانیہ کی سوچ بھانپ لی تھی۔ وانیہ کو ترس آ گیا وہ اس کے بخار کا سوچتی ہوئی کچن میں چلی آئی تھی۔

چولہے پر چائے کا پانی چڑھایا تھا اس میں چائے کی پتی چینی اور دودھ ڈال کر وہ وہیں کھڑی ہو گئی تھی۔ تیز آنچ پر لا کر وہ حسن کو چائے دے کر جلد از جلد یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔

"پلیز ایک پراٹھا بھی بنا دیجیے۔" پیچھے سے آتی گھمبیر آواز پر وہ بری طرح دہل کر رہ گئی۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا تو وہ دروازے میں ہی ایستادہ تھا۔

"ایکچولی آج صبح ناشتہ نہیں کیا اب بھوک بھی لگ رہی ہے۔" وہ چہرے پر معصومیت بھری مسکراہٹ لیے اندر ہی آ گیا تھا۔

"او......اوکے...... آپ...... آپ باہر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھیے میں وہیں لے کر آتی ہوں۔" وانیہ، حسن کی موجودگی سے گھبرا رہی تھی۔

حالانکہ اس نے اپنی بلوریں آنکھوں کو بلیک فریم والے گلاسز سے چھپا لیا تھا مگر شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی وہ سرخ بلوریں آنکھیں اسے شک میں ڈال دیتی تھیں۔

"آپ بنائیے میں یہیں بیٹھ جاتا ہوں۔" وہ کچن میں رکھی ٹیبل چیئر کی طرف بڑھا تھا اور آرام سے چیئر کھسکا کے بیٹھ گیا۔

"پلیز۔" التجائیہ انداز تھا۔

وہ کرتی نہ کرتی کے مصداق فریج سے آٹا نکال کر لائی اور جلدی جلدی اپنا کام کرنے لگی جب تک ایک پراٹھا بنا چائے بھی تیار ہو چکی تھی۔ اس نے ٹرے میں پراٹھا اور چائے رکھی ٹرے اٹھا کے ٹیبل پر رکھ دی حسن نے مسکرا کے ٹرے دیکھی۔

"وانیہ جی! آپ نے تو اپنی خوراک مجھے دے دی ہے۔" وانیہ ناسمجھی کے عالم میں حسن کو دیکھنے لگی تھی۔

"مطلب یہ آپ نے ایک پراٹھا بنایا، وہ بھی اتنا چھوٹا پلیز ذرا ایک اور بنا دیجیے مگر ذرا صحت مند سا۔" وہ کہہ کر پراٹھے کا ایک نوالہ توڑ کے کھانے لگا تھا۔ وانیہ ٹھیک ٹھاک جھینپ گئی۔ وہ پیر پٹخ کے پھر سے کاؤنٹر کی

جانب مڑی تھی اور جلدی جلدی ایک اور موٹا سا پراٹھا بنایا۔

"موصوف نے اپنی نوکرانی سمجھ لیا ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔

وانیہ پراٹھا بنا کر جیسے ہی پلٹی تھی پھر سے ڈبل مائنڈڈ ہو گئی حسن چپ چاپ لیفٹ ہینڈ سے پراٹھا کھا رہا تھا۔ آفریدی بھی تو لیفٹ ہینڈ تھا۔

"پلیز دے دیجیے۔"

"جی......!" وہ چونک کر رہ گئی اور پراٹھا اس کی ٹرے میں رکھا اور تیزی سے کچن سے نکلی تھی۔ حسن نے اچنبھے سے اسے جاتا دیکھا اور پھر کندھا اچکا کر کھانے لگا تھا۔

"السلام علیکم!" دوسری چیئر پر اچانک ہی حنین آفریدی آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"وعلیکم السلام تم کب آئے؟"

"بالکل ابھی آپ سنایئے کیسے ہیں۔" حنین آفریدی نے اس کی گلاسز کے پیچھے سے جھانکتی بلوری آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں لو کھاؤ۔" حسن نے ٹرے اس کے آگے بڑھائی۔

"آپ اپنے ہاتھ سے کھلایئے۔" حنین آفریدی کی عجیب فرمائش تھی۔

"اتنے بڑے ہو گئے ہو اپنے ہاتھ سے نہیں کھاتے۔"

"جتنا بھی بڑا ہو جاؤں آپ سے تو پھر بھی چھوٹا ہی رہوں گا ناں۔"

"یار! تم کتنی ذومعنی باتیں کرتے ہو۔"

"آپ اپنے ہاتھ سے کھلائیں گے تو کھاؤں گا ورنہ نہیں۔" حنین آفریدی نے چیئر کی بیک سے ٹیک لگا لی تھی۔ "بہت ضدی ہو ہے نا۔" حسن نے مسکراتے ہوئے پراٹھے کا ایک لقمہ توڑا اور چائے میں ڈبو کر کے حنین آفریدی کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ وہ کھاتا گیا اور حسن اسے کھلاتا گیا۔ چائے سے بھرا مگ آدھا ہو گیا تھا جسے حسن نے ایک دو گھونٹ پی کر حنین آفریدی کو دے دی جسے اس نے فوراً تھام لی تھی۔

"تھینکس۔" حنین آفریدی نے کپ واپس ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ حسن مسکرا دیا اور پیار سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

☆......☆

"آہم......آہم......" سلجوق آفریدی نے کھنکھارا ابھرا تھا۔ حرا جو رضا کو لیے چائے پی رہی تھی اور ساتھ ٹی وی بھی دیکھ رہی تھی۔ کھنکھارنے پر پیچھے گردن گھما کے دیکھا تھا۔

"او سلجوق بھائی آپ، السلام علیکم۔" وہ رضا کو صوفے پر بٹھا کے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ کے کھڑی ہو گئی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" سلجوق آفریدی دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔ "چائے پی جا رہی ہے وہ بھی اکیلے اکیلے۔"

"جی......مگر آپ بیٹھیے میں آپ کے لیے دوسری بنا کے لاتی ہوں۔"

"اب تم جاؤ گی، بناؤ گی پھر مجھے دیر ہو جائے گی۔ ایسا ہے کہ تم جاؤ زرمیل کو بلا کے لے آؤ جب تک میں تمہاری چائے سے ہی لطف اندوز ہو جاتا ہوں۔" سلجوق آفریدی نے بغیر کسی حجت کے اس کا چائے کا

کپ ٹیبل سے اٹھا لیا اور ایک سپ لیا تھا۔

"مگر سلجوق بھائی! یہ میری جھوٹی چائے ہے، میں جلدی سے آپ کے لیے دوسری گرم بنا کے لے آتی ہوں۔"

"اوہ......ہوں رہنے دو جو مزہ یہ جھوٹی چائے پینے میں ہے وہ تمہارے دوبارہ بنانے میں نہیں ہوگا۔" سلجوق آفریدی نے پرشوق نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ذومعنی بات کی تھی۔ حرا کے خاک پلے پڑا تھا۔ وہ ادھر ادھر گردن ہلا کے وہاں سے زرمیل کے بیڈ روم میں آ گئی تھی جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی آفس سے آیا تھا۔ سلجوق آفریدی دلکشی سے مسکرا دیا تھا۔

ابھی کچھ دن پہلے ہی اس کی فیملی باقاعدہ اس کا رشتہ حرا کے لیے لے کر آئی تھی۔ وہ چونکہ اس فیملی کو اور حرا کو تو بچپن سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے بہت پسند تھی نٹ کھٹ سی حرا اس کے دل میں بہت پہلے بسیرا کر چکی تھی مگر یہ بات ابھی تک حرا کے علم میں نہیں تھی۔ یہی کہا گیا تھا وہ اپنی پڑھائی سے فارغ ہو جائے پھر بات آگے بڑھاتے ہیں اس رشتے کے لیے زرمیل کے پیرنٹس نے انکار نہیں کیا تھا۔

"ہاں سلجوق کیسا ہے؟" زرمیل کے آنے سے اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا تھا۔

"فائن تو سنا۔" سلجوق آفریدی نے چائے ختم کر کے خالی کپ ٹیبل پر رکھا تھا۔ زرمیل نے صوفے پر بیٹھتے رضا کو گود میں لیا اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا سلجوق آفریدی کے سامنے۔

"میں بھی ٹھیک ہوں عارفین کا مسئلہ کہاں تک آگے بڑھا۔"

"میں اسی سلسلے میں آیا تھا اب بہت ضروری ہو گیا ہے کہ معصوم بھائی سے کچھ سوالات کر لیے جائیں۔ ادھر حیدر عباسی سے بھی میری بات ہو گئی ہے اسفند درانی اور یاور درانی کی انکوائری کا پورا بائیو ڈیٹا آ چکا ہے۔ وہ دونوں انڈر ورلڈ کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں میرا خیال ہے باقی باتیں عارفین اور معصوم بھائی کے سامنے کر لیں۔"

"ہاں تم ٹھیک بول رہے ہو تو پھر چلو اوپر چلتے ہیں۔" دونوں کھڑے ہو گئے سامنے سیڑھیوں سے ارشد اترتا ہوا آ رہا تھا۔

"ہیلو! کیسے ہو تم سلجوق؟" ارشد نے دونوں سے مصافحہ کیا اور خوش دلی سے سلجوق آفریدی کو دیکھا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں تم سناؤ۔" اسی دوران زرمیل کا فون بجنے لگا تھا۔

"ایکسکیوز می۔" زرمیل نے ارشد کی طرف ایک نظر دیکھ کر فون ریسیو کر لیا تھا۔

"ہاں ثمران بولو۔"

ثمران کے نام پر ارشد نے زرمیل کو دیکھا تھا۔

"اچھا......مگر کیوں؟" وہاں سے ایسا کچھ کہا گیا تھا کہ زرمیل کے چہرے پر پریشانی وفکر کے سائے منڈلانے لگے تھے۔ ارشد نے بغور زرمیل کو دیکھا تھا۔

"اوکے تم فکر مت کرو میں ابھی تھوڑی دیر میں کچھ کام نمٹا کے آتا ہوں اوکے اللہ حافظ۔" زرمیل نے موبائل آف کیا۔

"کیا ہوا زرمیل! سب خیریت تو ہے نا پریشان لگ رہے ہو۔" ارشد کے دل میں مچلتا ہوا سوال لبوں پر آ گیا۔ ثمران کا فون آیا تھا ایسا کیا ہوا تھا جو وہ پریشان ہو گیا تھا۔

''ہاں ثمرن کی خالہ کرائے پر رہتی ہیں مالک مکان نے انہیں آج شام تک گھر سے نکلنے کا کہہ دیا ہے۔''

''اوہ...... پھر......'' اسے ثمرن کی فکر ستانے لگی تھی۔

''میں کچھ کام نمٹالوں پھر ایک گھنٹے میں جاتا ہوں۔''

''نہیں تم رہنے دو میں جا رہا ہوں۔''

زرمیل کی دل کی خواہش یہی تھی کہ وہ ثمرن کے پاس جائے کیوں کہ اس وقت ثمرن کو سب سے زیادہ ارشد کی ہی ضرورت تھی وہ یہی چاہتا تھا کہ ارشد ثمرن کو جا کے منا لے آئے۔ ''یہ تو بہت اچھی بات ہے بیسٹ آف لک، ہاں ایک کام کرنا میرا جو گلشن والا فلیٹ ہے وہاں اس کے خالہ اور خالو کو شفٹ کر دینا۔ اس کی چابی ڑالے سے لیتے جانا۔''

''اوکے۔''

ارشد کے چہرے پر ثمرن کے ذکر سے روشنی سی بکھر گئی تھی وہ مسرور سا ثمرن کو لینے آگے بڑھ گیا تھا۔

''ان کے درمیان سب ٹھیک چل رہا ہے۔'' ان سب کے درمیان سلجوق آفریدی صرف خاموشی سے سن رہا تھا۔ زرمیل نے سلجوق آفریدی سے کچھ نہیں چھپایا تھا وہ اس کا کلوز بیسٹ فرینڈ تھا۔

''انشاء اللہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''انشاء اللہ۔'' سلجوق آفریدی دھیرے سے مسکرا دیا۔ دونوں چلتے ہوئے رابعہ کے پورشن میں آگئے تھے رابعہ ہاتھ میں ہینڈ بیگ لیے کہیں جا رہی تھیں ان کے ساتھ وانیہ بھی تھی۔

''السلام علیکم! لگتا ہے آپ کہیں جا رہی ہیں۔'' دونوں نے ہی سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' رابعہ نے شفقت سے دونوں کو دیکھا تھا۔ ہاں آج رات کا ڈنر سب کا میرے ہاں ہے تو کچھ سامان لینے جا رہی ہوں مارکیٹ سے۔''

''رابعہ پھوپھو آپ بھی نا اتنی محنت کرتی ہیں سب کچھ ریڈی میٹ منگوا لیا کریں۔'' زرمیل کو تو حیرت ہوتی تھی ان پر اتنا ڈھیر سارا کھانا پکاتی تھیں وہ گھر پر۔

''مگر بیٹا جانی جو کھانے کا مزہ گھر میں بنانے کا ہے وہ باہر کے ریڈی میڈ میں کہاں۔''

''اب آپ کی منطق کے آگے ہماری کہاں چلے گی۔'' زرمیل دھیرے سے مسکرا دیا۔

''یورائٹ مائی چائلڈ۔'' رابعہ نے اس کی مسکراہٹ کا ساتھ دیا تھا۔

''تو پھر ایک خوش خبری اور سنیے آج رات کے ڈنر پر ثمرن بھی ہم سب کے ساتھ ہوگی۔''

''ارے پھر تو اس سے اچھی خوش خبری کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ میں ڈنر میں آج ثمرن کی کچھ فیورٹ ڈشز بھی بنا لیتی ہوں۔'' وہ خوشی خوشی وانیہ کے ہمراہ ہی آگے بڑھیں۔

''السلام علیکم زرمیل بھائی۔''

معصوم اسٹور سے کانچ کے برتن نکال کر کچن میں جا رہی تھی۔ سلجوق آفریدی اور زرمیل کو کھڑے دیکھا۔ سلجوق آفریدی کو تو وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اس لیے تھوڑا جھجک سی گئی تھی مگر سلجوق آفریدی کی غائبانہ جان پہچان بہت اچھی طرح ہو گئی تھی۔

''وعلیکم السلام! عارفین کہاں ہے۔''

''جی وہ اپنے کمرے میں ہیں۔'' اس کے ہاتھ میں کانچ کے برتن تھے زرمیل نے وہ برتن دیکھے۔

''اوکے آپ یوں کریں یہ سارے برتن رکھ کے روم میں آئیے آپ سے کچھ کام ہے۔'' زرمیل سنجیدگی سے کہتا سلجوق آفریدی کو لیے عارفین کے روم میں آ گیا تھا۔

وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ ''انہیں مجھ سے کیا کام ہے۔'' رابعہ اور وانیہ مارکیٹ جانے کے لیے نکلی تھیں کہ راہ میں حسن مل گیا تھا۔ ''آپ کہیں جا رہی ہیں؟''

''ہاں ذرا مارکیٹ تک جا رہی تھی کچھ سامان لینا تھا۔'' رابعہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر آپ کو برا نہ لگے تو میں لے کر چلتا ہوں گاڑی میں۔''

وانیہ نے کن اکھیوں سے حسن کو دیکھا جو نہایت موڈی ہو کر رابعہ سے بات کر رہا تھا۔ رابعہ کو ارشد کا دوست بہت پسند آیا تھا۔ شریف فرمانبردار۔

''نہیں برا لگنے کی کوئی بات نہیں ہے اگر آپ کو کچھ کام نہیں ہے تو پلیز گاڑی میں لے چلیں جلدی سے سامان لے کر واپس بھی آ کر ڈنر تیار کرنا ہے۔''

''اوکے میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔'' حسن جلدی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اور ایک منٹ میں وہ گاڑی ان کے پاس لے بھی آیا تھا۔

''مامی ہم کسی رکشہ ٹیکسی میں چلے جاتے۔'' وانیہ نے آہستگی سے رابعہ کو منع کرنا چاہا۔

''بے فکر رہیے وانیہ جی! میں بہت اچھا ڈرائیور ہوں آپ کو تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔'' وانیہ نے اس کے چشمے کے پیچھے سے جھانکتی دو بلوریں آنکھوں میں جھانکا تھا جہاں شوخیاں ہی شوخیاں بھری تھیں۔ وہ سٹپٹا کے رہ گئی۔

وانیہ نے پیچھے کی سیٹ سنبھال لی تھی جب کہ رابعہ بھی وانیہ کے برابر میں ہی بیٹھی تھیں۔ حسن نے بیک مرر اس کے چہرے پر فوکس کر دیا تھا۔

مارکیٹ آ گئی تھی وہ تینوں گاڑی سے نیچے اترے تھے۔

''ایسا ہے وانیہ بیٹا تم یوں کرو کہ یہاں سے مختلف قسم کے بہت سے فروٹس اور جلیبی کے پیکٹ لے لو اس کے علاوہ وہ کلرز سویاں بھی لب شیریں اور ٹرائفل بنانے کے لیے میں جب تک وہاں سے چکن لے آتی ہوں۔''

''رابعہ آنٹی! آپ اتنا پریشان ہوں گی آپ مجھے گھر پر ہی لسٹ دے دیتیں میں لے کر آ جاتا سارا سامان۔'' حسن کو رابعہ کا یوں پریشان ہونا اچھا نہیں لگا تھا۔

''ارے نہیں بیٹا اصل میں عارفین نے مجھے سارا سامان تو پہلے ہی لا کر دے دیا ہے میں نے سب چولہے پر چڑھا بھی دیا ہے بس میٹھا اور بروسٹ کے لیے یہاں آئی ہوں وہ ثمرن کو بھی بہت پسند ہے اور سب کو میرے ہاتھ کا میٹھا بہت پسند ہے۔''

''چلیں ٹھیک ہے آپ گاڑی میں بیٹھیے میں سب لے کر آتا ہوں۔''

''نہیں تم لوگ فروٹس لو چکن میں خود لے کر آتی ہوں وقت بھی کم ہے۔'' وہ آگے بڑھیں اب وانیہ کرتی نہ کرتی کے مصداق حسن کے ساتھ ہو لی تھی۔

''آپ کو شاید میرے ساتھ آنا اچھا نہیں لگا۔'' حسن نے وانیہ کے چہرے پر بیزاری نوٹ کر لی تھی۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے میں آپ کی پریشانی کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔''

"مگر مجھے آپ کو لے کر کبھی بھی پریشانی نہیں ہوگی۔" اس نے ذومعنی سرگوشی کی تھی۔ وانیہ کا دل عجیب انداز میں دھڑکا تھا اور پھر باقی کا سارا وقت وہ خاموش رہی تھی۔

☆......☆

"جی تو مقسوم بھابی آپ سے کچھ سوالات کرنے تھے آپ اگر تعاون کریں گی تو کیس اور آسان ہو جائے گا۔ نا صرف بلکہ بہت جلد یاور درانی اور اسفند درانی اپنے انجام کو بھی پہنچ جائیں گے۔" بیڈروم میں سائیڈ پر رکھے چھوٹے سے صوفے سیٹ میں عارفین اس کے ساتھ مقسوم بیٹھی تھی۔ سامنے والے دونوں سنگل صوفوں پر سلجوق آفریدی اور زرمیل براجمان تھے۔ رضا چونکہ زرمیل کی گود میں سو چکا تھا اس لیے اس نے عارفین کے بیڈ پر ہی لیٹا دیا تھا۔

سلجوق آفریدی نے اسے سب سچ بتا دیا تھا کہ وہ کس طرح عارفین کو پریشان کر رہے تھے اور کچھ کاغذات دکھا کے وہ اس کو یہاں سے لے جانے کی دھمکیاں بھی دے رہے ہیں۔

"جی سلجوق بھائی پوچھیے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا ایک بات بتائیے آپ کو یہ پتا ہے کہ اسفند درانی اور یاور درانی آپ کو یہاں سے کینیڈا کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں۔"

"کچھ تو ڈاؤٹ ہوگا۔"

"میرا خیال ہے وہ پاپا کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔"

"کیسا بدلہ؟" سلجوق آفریدی نے اسے بغور دیکھا اس کے چہرے پر تکلیف کے سائے تھے۔

"یہی کہ میرے گرینڈ پا نے سب کو اپنی زندگی میں ان کا حصہ دے دیا تھا مگر ان کے انتقال کے بعد اسفند چاچو اور یاور نے بزنس میں کچھ ہیرا پھیری کی جو پاپا کے علم میں آ گئی تھی انہوں نے دونوں کو نہ صرف ہی نہیں اپنے مشترکہ بزنس سے بھی بے دخل کر دیا تھا۔ یہ سب ان دونوں سے برداشت نہیں ہوا تو شاید اس لیے وہ مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہیں۔"

"آپ کے گرینڈ پا نے جب پراپرٹی دونوں بھائیوں میں تقسیم کر دی تو کیا وہ پراپرٹی کے پیپرز ہیں آپ کے پاس۔"

"میرے پاس تو نہیں مگر ہو سکتا ہے جینی مم کے پاس ہوں۔"

"یہ جینی مم کون ہیں؟"

"میری گورنس جنہوں نے مجھے بچپن سے پالا ہے ہمیشہ سے وہ میرے ساتھ ہی رہی ہیں۔"

"اب کہاں ہیں وہ کوئی کانٹیکٹ نمبر ہے آپ کے پاس ان کا؟"

"جی مہینے پندرہ دن میں وہ مجھ سے ایک بار بات ضرور کرتی ہیں۔"

عارفین بھی بغور اسے ہی سن رہا تھا یہ سب اس کے علم میں نہیں تھا اور ساتھ حیرت بھی ہو رہی تھی۔

"آپ مجھے وہ سارے اوریجنل پیپرز منگوا کے دے سکتی ہیں؟" سلجوق آفریدی نے صوفے کی بیک سے ٹیک لگائی تھی۔

"جی۔"

"کب تک مل سکتے ہیں؟"

"اسی ہفتے میں مل جائیں گے۔" سلجوق آفریدی ٹو دی پوائنٹ بات کر رہا تھا بنا کسی تمہید باندھے۔

☆......☆

"ثمرن تم...... اوہ مائی گاڈ۔" وہ کھڑی ہوئی مگر چکرا کے پھر سے بیٹھ گئی تھی اور سر پر ہاتھ رکھ لیا تھا ارشد تیزی سے اس کے قریب آیا اور اس کے نزدیک بیٹھا تھا۔

"ثمرن طبیعت ٹھیک ہے نا تمہاری۔" اس کے فربہ جسم سے لگ رہا تھا جیسے وہ پریگنٹ ہو مگر ارشد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے اتنی بڑی خوش خبری پر وہ کیا کرے خوش ہو یا ثمرن کے نہ بتانے پر ناراض ہو۔

"ثمرن۔" ارشد نے اس کا لرزتا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"چھوڑیے مجھے میں بالکل ٹھیک ہوں۔" ثمرن نے غصے سے ارشد کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا مگر ارشد نے گرفت مضبوط کر لی تھی۔ ارشد نے اس کی ناراضی نوٹ کر لی تھی مگر اب تو ہر حال میں اسے ہی منانا تھا۔ کیوں کہ ثمرن اس سے سخت ناراض تھی۔

"میرا خیال ہے یہ گھڑی اور یہ جگہ روٹھنے اور منانے کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ چلو گھر چلو بیڈروم میں تمہاری ساری ناراضی دور کر دوں گا۔" ارشد نے ذومعنی انداز میں ہولے سے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"میں نے کہا نا میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہی ہوں آپ نے جس طرح میری بے عزتی کر کے مجھے گھر سے نکالا تھا میری دس سالہ رفاقت کا جو صلہ مجھے دیا مجھے سب یاد ہے۔" ارشد سمجھ رہا تھا کہ زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا ثمرن کو منانے میں مگر اس کی سوچ غلط ثابت ہوئی ثمرن اتنی آسانی سے نہیں مانے گی۔

"یار دیکھو! میں نے زندگی میں کبھی بھی کسی کو منایا نہیں ہے اور نہ ہی مجھے ایسا کوئی تجربہ ہے۔ تو پلیز تم مان جاؤ نا۔"

"میں نے کہا نا مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔" ثمرن نے ارشد کی مٹھی میں دبا اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا تھا مگر وہ نہیں مانا تھا۔

دروازے پر دھیرے سے دستک ہوئی۔

"ثمرن آپی!" باہر سے لاروش اغولان نے پکارا تھا۔

"ہاں لاروش آ جاؤ اندر۔"

ارشد کی گرفت ڈھیلی پڑی تو ثمرن نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال لیا تھا۔

لاروش اغولان اندر داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں ارشد کے لیے چائے اور ثمرن کے لیے کھانا تھا۔

"لاروش مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"نہیں ثمرن آپی آج آپ نے نہ تو صبح سے کچھ کھایا ہے اور نہ ہی آج دوائی کھائی ہے اور آج نجمہ آنٹی بھی نہیں آئی ہیں ورنہ روز وہی آپ کو کھلاتی ہیں۔" لاروش اغولان کے انکشافات پر ارشد نے ثمرن کو

حیرت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

''ارشد بھائی آپ ہی ثمرن آپی کو سمجھایئے یہ کچھ نہیں کھا رہی ہیں۔'' لاروش اغولان نے ارشد کو چائے کا کپ دیا جو اس نے تھام لیا مگر ہونٹوں سے نہیں لگایا بلکہ کپ یونہی کا یونہی ٹیبل پر رکھی ٹرے پر رکھ دیا تھا۔

''ثمرن ماما تم سے یہاں ملنے آتی ہیں اور انہیں تمہاری کنڈیشن کے بارے میں بھی سب معلوم ہے۔''

''گھر میں آپ کے سوا سب کو میری طبیعت کا معلوم ہے۔'' اس نے کہہ کر رخ ہی پھیر لیا ناراضی سے۔

ارشد کی تپ گئی ارشد نے اس کا رخ اپنے ہاتھ سے اپنی سمت موڑا تھا۔

''یہ سراسر ناانصافی ہے ثمرن میرے ساتھ، زیادتی ہے کیوں کہ اس خبر کے بارے میں سب سے پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا اور مجھے اب پتا چلا ہے سب سے آخر میں اور اگر میں آج نہ آتا تو شاید بے خبر ہی رہتا۔''

''آپ اپنے دل پر ہاتھ رکھیے اور مجھے بتایئے کہ کیا میں آپ کو فون کر کے بتا سکتی تھی۔'' ثمرن شاکی نظروں سے اسے دیکھا تھا تو ارشد اس کی شکایتی نظریں دیکھ کر وہ خفیف سا ہو کر رہ گیا تھا مگر زیادہ دیر وہ خفیف نہ رہ سکا تھا۔

''ٹھیک ہے میں غصے میں تھا اور تمہیں میری عادت بھی معلوم ہے پھر بھی تمہیں مجھ سے یہ سب سے بڑی خوش خبری نہیں چھپانی چاہیے تھی۔'' ارشد ابھی بھی خود کو حق بجانب سمجھ رہے تھے ثمرن کے دماغ پر لگی تھی۔

''ارشد! آپ ابھی بھی خود کو حق پر سمجھ رہے ہیں اور مجھے قصوروار ٹھہرا رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔

''نہیں یار! میرا وہ مطلب نہیں ہے مگر میں نے اس خوش خبری کے لیے دس سال بے صبری سے انتظار کیا ہے۔''

''اچھا اگر آپ کو پتا چل جاتا پھر کیا ہوتا؟'' وہ تنک کر بولی۔

''اپنی جان کو پلکوں پر بٹھاتا۔''

''جھوٹ دلاسے مت دیں میں جان گئی ہوں آپ کے دل میں اور آپ کی نظروں میں میری کوئی حیثیت کوئی وقعت نہیں ہے۔''

''یار اب غلط فہمیوں کے سمندر سے باہر بھی آ جاؤ اگر یقین نہیں آ رہا تو پھر میں تمہیں بیڈروم میں ثبوت بھی دے دوں گا۔'' ارشد نے بے ساختہ اس کے رخسار پر اپنی ہتھیلی کی پشت پھیری تھی ثمرن حیا سے شرما کر رہ گئی۔ آج بہت سال بعد ثمرن کو ارشد پہلے والا ارشد لگا تھا جو ڈالے کی شادی سے پہلے تھا۔

''ارشد! آپ نے مجھے بہت دکھ دیئے ہیں یہ سات ماہ میں نے بہت اذیت میں بہت تکلیف سے اور تڑپ تڑپ کے گزارے ہیں۔ میں اس بار آپ سے سخت ناراض ہوں آپ سے اس بار بالکل بات نہیں کروں گی۔'' آنکھوں سے چند موتی ٹوٹ کر رخسار پر پھسل کر ارشد کی ہتھیلی پر گرتے چلے گئے جو اس کے ہاتھ پر تھے۔

ارشد کا دل خون خون ہو گیا تھا۔ اس نے واقعی میں اپنی زندگی بہت کٹھن کر لی تھی۔ جس میں سب سے بڑا ہاتھ خود اس کا اپنا تھا مگر اب اپنی زندگی کو منانا تھا اور جھکنے میں اسے کوئی شرم نہیں تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے گھٹنوں میں بیٹھ گیا تھا اور دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے تھے۔

(جاری ہے)

رابعہ افضال خان

افسانہ

عید سنگ سجنا کی

رمضان المبارک کا باریک سا چاند نیلے آکاش پر پوری آب وتاب کے ساتھ اپنی ٹھنڈی روشنی پھیلائے موجود تھا۔ اس نے ایک نظر نیلے آکاش پر سفید روئی کے گالوں جیسے بادلوں کے بیچ میں گھرے چاند کو خالی



خالی نظروں سے دیکھا تھا اور ہاتھوں کو دعا کے لیے بلند کیا تھا مگر اس کے لبوں پر کوئی دعا نہ آئی تھی۔ اس نے خاموشی سے اپنے خالی ہاتھوں کو اپنے پہلو میں واپس گرالیا اور پھر سر جھٹکتی ست روی سے سیڑھیاں اتر گئی تھی۔ دھرتی پر پھیلی رات نے اس کی آنکھوں میں پھیلی ویرانی اور تنہائی کو دکھ سے دیکھا اور پھر خاموشی سے اپنا سفر طے کرنے لگی۔

☆......☆

''شائلہ بیٹا! بس کرو رہنے دو یہ سب سحری میں بھی اٹھنا ہوگا۔'' نادیہ بیگم نے کچن میں مصروف شائلہ کو محبت سے ٹوکا تھا۔

''بس امی! تھوڑا سا کام ہے۔ یہ ختم کرلوں تو پھر جاتی ہوں۔'' اس نے سحری کے لیے گندھا ہوا آٹا فریج میں رکھتے دھیمے سے کہا تھا۔

''چھوڑ دو سب ایسے ہی باقی سحری میں ہو جائے گا، کیوں خود کو اتنا تھکاتی ہوں اور نائرہ سے بھی کچھ کام کروالیا کرو بہت کام چور ہوتی جارہی ہے۔'' نادیہ بیگم نے تصور میں چھوٹی بیٹی کو غصے سے گھورا تھا۔

''ابھی وہ چھوٹی ہے امی! ہنستی کھیلتی شرارتیں کرتی اچھی لگتی ہے۔'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ



کہا تھا۔
”لوتھا کی لوتھا ہو گئی ہے کالج میں پڑھتی ہے، تمہیں وہ بچی لگتی ہے۔“ نادیہ بیگم نے کچھ خفگی سے کہا تھا۔
وہ ہلکے سے مسکراتی سلپ صاف کرنے لگی۔ نادیہ بیگم نے پنک دوپٹے کے ہالے میں مقید اس کے خوب صورت و حزن ملال میں گھرے چہرے کو دیکھا اور پھر خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔
”یااللہ! میری اس صابر شاکر بیٹی کی جھولی کو بھی خوشیوں سے بھر دے۔“ ہمیشہ کی طرح ان کے لبوں نے ایک ہی دعا کی تھی۔
☆......☆
”یااللہ! میں تیری بڑی گناہ گار و حقیر سی بندی ہوں، اے میرے پروردگار تو مجھ گناہ گار پر رحم فرما۔ اے میرے مالک تو تو اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے تو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ تیری ذات بڑی رحیم و کریم ہے۔ اے رب کائنات تو مجھے بھی سکون عطا کر دے۔ جس شخص کو مجھ سے دور کر دیا ہے اس کی یادوں کو بھی میرے دل و دماغ سے کھرچ دے، مجھے اس شخص سے جڑی ہر بات بھلا دے۔ یااللہ! مجھے صبر عطا کر دے میرے بے چین دل کو قرار دے دے۔“ وہ تہجد کی نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اپنے رب سے محو مناجات تھی۔ اس کا سفید دوپٹے میں مقید چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔ اس کی آنکھیں بے دریغ آنسو بہا رہی تھیں اور وہ ہر چیز سے غافل اپنے رب کے آگے محو مناجات تھی، سحری بنانے کے ارادے سے اٹھنے والی نائرہ کی آنکھیں بے اختیار نمی سمیٹ لائیں، کچھ سال پہلے وہ کتنی خوش تھی ہنسی اس کے لبوں سے جدا نہ ہوتی تھی۔
☆......☆
”پلیز حسن! دو قدم پر تو مارکیٹ ہے، چلو ناں۔“
وہ صوفے پر دراز حسن کی منتیں کرنے میں لگی پڑی تھی۔
”سوری شائلہ! میں بہت تھکا ہوا ہوں، مارکیٹ میں جا کر خواری کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ حسن نے ذرا کی ذرا پلکیں وا کی تھیں۔ سامنے ہی وہ بلیک کپڑوں میں ملبوس امید بھری نظروں سے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی اس نے واپس پلکیں موند لیں۔
”پلیز حسن! دیکھو آج چاند رات ہے مجھے مہندی بھی لگوانی ہے چوڑیاں خریدنی ہیں۔“ اس نے حسن کا بازو ہلاتے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔
”یہ سب کام پہلے نمٹایا کرو بہرحال آئی ایم سوری۔“ وہ اسی لہجے میں بولا تھا۔
”دفع ہو جاؤ تم۔“ بالآخر اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ تڑخ کر کہتی وہ جونہی مڑنے لگی اس کی نازک کلائی حسن کی گرفت میں آئی تھی۔
”ناراض کیوں ہوتی ہو مائی ڈیئر وائف۔“ اس کے مقابل کھڑے ہوتے حسن نے اس کے ناراض چہرے کو بھرپور نگاہ سے دیکھا تھا۔
”ہاتھ چھوڑو میرا۔“ وہ اپنا ہاتھ چھڑاتی ہوئی بولی تھی۔
”چھوڑنے کے لیے تھوڑی پکڑا ہے جان من۔“ وہ حد درجہ شوخی سے بولا تھا۔
”ڈونٹ کراس یور لمٹ۔“ شائلہ کا چہرہ اک دم ہی گل رنگ ہوا تھا۔
”بڑی ظالم بیوی ہو بندہ رومینٹک ہونے کا سوچتا ہے اور تم سارے رومانس کا بیڑہ غرق کر دیتی ہو۔“ حسن نے خفگی سے اسے دیکھا۔
”اب چلیں۔“ وہ اس کے شکوے کو ان سنی کرتے بولی تھی۔
”مستقبل میں کیا ہو گا میرا۔“ وہ دہائی دینے والے انداز میں کہتا آگے بڑھ گیا تو پیچھے وہ بھی مسکراتی ہوئی چل دی۔

☆......☆
وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ جبھی کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر یک دم اپنی اور کھینچا تھا۔ وہ بدحواس ہوتی بند آنکھوں کے ساتھ چیخنے لگی تھی۔
”چپ، آنکھیں کھولو شائلہ۔“ وہ سختی سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتا آہستہ سے بولا تھا۔
وہ جو اچانک آئی افتاد پر آنکھیں بند کیے مضبوط و بھاری ہاتھ ہٹانے کی کوشش میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی، جانی پہچانی آواز پر اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔
”حسن! یہ کیا بدتمیزی ہے میری جان ہی نکال دی۔“ حسن کے ہاتھ ہٹاتے ہی وہ خفگی سے بولی۔
”صبح سے مجھ سے چھپتی پھر رہی ہو، بات کرنے کا موقع نہیں دے رہی ہو جہاں مجھے دیکھتی ہو غائب ہو جاتی ہو، ترس گیا صبح سے تمہاری صورت دیکھنے کو، یہ تو جیسے بڑی اچھی بات ہے۔“ وہ دونوں بازو دائیں بائیں دیوار پر جمائے وہ بڑے لو دیتے گھمبیر لہجے میں بولا تھا۔
”مم...... میں کیوں چھپنے لگی تم سے۔“ وہ اس کے اس قدر درست اندازے پر سٹپٹاتے ہوئے بولی۔
”یہ تو تم ہی جانو۔“ وہ گہری نگاہ اس پر جمائے ہوئے بولا تھا۔
”مم...... میری عیدی۔“ وہ اس کی آنچ دیتی نگاہوں سے خود کو بچانے کی خاطر بولی تھی۔
”یہ لو۔“ [illegible] لائٹ فیروزی جارجٹ کے کپڑوں میں سجی سنوری شائلہ کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اپنے لب اس کی پیشانی پر رکھ دیے تھے۔ وہ تو گویا اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔ دل تھا کہ پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو تیار تھا۔
”اور میری عیدی۔“ حسن نے سرخ چہرہ جھکائے خاموش کھڑی شائلہ کو دیکھتے بھرپور شرارت سے کہا تھا۔
”مجھے ابو بلا رہے ہیں۔“ وہ سٹپٹاتے لہجے میں کہتی جوں ہی جانے لگی حسن نے اسے شانوں سے تھام کر سامنے کیا تھا۔
”پہلے میری عیدی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا معنی خیزی سے بولا تھا۔
”میں کیا عیدی دوں؟“ وہ گھبراہٹ میں بہت ہی نامعقول سوال کر گئی تھی۔
”گلے مل کر عید مبارک کہہ دو۔“ حسن نے بھرپور سنجیدگی کا مظاہرہ کیا تھا۔
”منہ دھو رکھیں۔“ وہ جھینپ کر کہتی ایک قدم پیچھے ہٹی تھی۔
اس کا ہاتھ تھامتے حسن نے جینز کی پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر میرون رنگ کی چھوٹی سی ڈبیا نکالی تھی اور شائلہ کا ہاتھ تھام کر اس کی گوری مخروطی انگلی میں نازک سی گولڈ کی رنگ پہنائی تھی۔
”کیسی لگ رہی ہے؟“ اس کا ہاتھ تھامے اس نے پوچھا تھا۔
”بہت بہت خوب صورت۔“ شائلہ کے لبوں سے بے ساختہ تعریف نکلی تھی۔
”اوہو تمہارے ہاتھ میں سج کر زیادہ خوب صورت لگ رہی ہے۔“ وہ جذبوں سے چور بڑے گھمبیر لہجے میں بولا تھا۔ وہ جھینپ کر مسکراتی سائیڈ سے نکلتی چلی گئی۔ ان دونوں کے نکاح کو ایک سال ہونے کو آیا تھا، حسن کی دلی خواہش پر اس کا نکاح شائلہ سے ہوا تھا۔ اتنے مضبوط بندھن میں جڑے ہونے کے باوجود ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے حسن نے کبھی کوئی حد پار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور یہی خوبی شائلہ کو اپنے سحر میں جکڑے رکھتی تھی۔
☆......☆
خالد احمد اور حامد احمد دونوں بھائی ایک ہی گھر میں اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ خالد صاحب کا ایک ہی بیٹا تھا حسن احمد جب کہ حامد

صاحب کو خدا نے دو پیاری سی بیٹیوں سے نوازا تھا، دونوں بھائیوں میں بے حد محبت تھی اور ان دونوں کی بیویوں میں بھی بڑا اتفاق تھا، ان کا گھرانہ ایک خوش حال گھرانہ تھا۔

☆......☆

وہ چھت کی آخری سیڑھی پر گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے نہ جانے کن خیالوں میں گم تھی کہ حسن کے آنے کا بھی پتہ نہ چل سکا تھا۔

"اداس ہو۔" حسن نے اس کے برابر بیٹھتے ایک نظر اس کے اداس حزن ملال میں ڈوبے چہرے پر ڈال کر دھیرے سے کہا تھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" لاکھ کوشش کے باوجود بھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے تھے۔

"پلیز شمائلہ! تم اس طرح سے روؤ گی تو میں جا نہیں سکوں گا، بس صرف دو سال کی بات ہے، دیکھنا پلک جھپکتے گزر جائیں گے۔" حسن نے اس کا ہاتھ تھامتے لہجے کو بشاش بناتے کہا تھا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو حسن! دو سال بہت لمبا عرصہ ہے یہاں تو پل بھر کا پتہ نہیں ہوتا، کیسے رہوں گی میں دو سال تک تمہیں دیکھے بغیر۔" وہ جذبات میں بہہ کر وہ بات کہہ گئی تھی جو عام حالات میں وہ شاید زندگی بھر نہ کہتی۔

"اتنے کام کی بات اتنی دیر سے کہہ رہی ہو، اب تو رخصتی کروانے کا بھی ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔" وہ یکدم ہی شوخ ہوا تھا۔

"توبہ ہے حسن! میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔" وہ بری طرح پچھتائی تھی۔

"تم بھی خوش مت ہونے دینا مجھ غریب کو۔" وہ منہ بناتے خفگی سے بولا۔

"حسن! جانا ضروری ہے کیا؟" شمائلہ نے نہ جانے کس آس پر پوچھا تھا۔

"جانا تو پڑے گا شمائلہ! کمپنی والے بھیج رہے ہیں منع تو نہیں کر سکتا۔" حسن نے اس کی پلکوں پر اٹکے آنسو اپنی پوروں سے صاف کیے تھے۔

"مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے؟" اس کے لہجے میں بے پناہ خدشے بول رہے تھے۔

"ادھر میری آنکھوں میں دیکھو شمائلہ! تمہیں اپنا عکس نظر آئے گا، میرے دل پر صرف تمہارا قبضہ ہے، تم میری محبت ہو، میری سانسوں میں بستی ہو، میرے وجود میں لہو بن کر دوڑتی ہو، میری جان ہو تم لیکن تمہیں بھلا کیسے بھلا سکتا ہوں۔" آج پہلی بار اس نے اپنی محبت کا اتنے کھلے الفاظ میں اعتراف کیا تھا۔ شمائلہ کو اپنا آپ یک دم ہی بڑا معتبر لگنے لگا تھا۔

☆......☆

اسے گئے ڈھائی سال ہونے کو آئے تھے۔ دو سال کے وعدے پر جانے والا ڈھائی سال گزرنے پر بھی پلٹ کر نہ آیا تھا۔ شمائلہ کی آنکھیں ہجر کی آگ میں جلتے جھکنے لگی تھیں۔ کئی مہینوں سے تو حسن نے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا تھا۔ اس کے لب حسن کی واپسی کی دعائیں مانگتے اب مایوس ہونے لگے تھے۔ امید کے دیے بجھنے لگے تھے۔

وہ بڑا حبس زدہ سا دن تھا۔ جب سہ پہر فون کی گھنٹی بجی تھی۔ شمائلہ کا دل نہ جانے کیوں کسی انہونی کے خیال سے بڑی تیزی سے دھڑکا تھا۔ اس نے جلدی سے ریسیور کان سے لگایا تھا۔ ادھر سے نہ جانے کیا کہا گیا تھا کہ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور وہ زمین پر بے جان سی بیٹھتی چلی گئی تھی۔ افطاری کی تیاری میں مصروف کچن میں موجود سائرہ بیگم دوڑ کر اس تک پہنچی تھیں۔

"شمائلہ! کیا بات ہے کس کا فون تھا۔" انہوں نے سکتے کے عالم میں بیٹھی شمائلہ کو تقریباً جھنجھوڑ دیا تھا۔

"چ...... چچ...... چچی...... وہ...... ح......"

وحشت سے کہتی وہ اپنی بات مکمل کیے بنا ہی ان کی

بانہوں میں جھول گئی تھی۔

☆......☆

طوفان آ کر تھم چکا تھا مگر اپنے ساتھ شمائلہ کی ہستی تباہ کر گیا تھا۔ تین دن اسپتال میں گزارنے کے بعد وہ گھر آئی تھی مگر شمائلہ کی جگہ وہ تو کوئی اور ہی تھی۔ ویران آنکھیں ساکت لب جیسے وہ کوئی احساس سے عاری پتھر کی مورت ہو۔ فون پر حسن کا دوست تھا۔ جس نے شمائلہ کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا تھا۔ سڈنی میں حسن کا بہت بری طرح ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ کیسی روح فرسا خبر تھی جس نے اس کی ہستی کو تہس نہس کر دیا تھا اس کی ساری خوشیاں چھین لی تھیں۔

☆......☆

کتنی ہی عیدیں آئیں اور گزر گئیں مگر حسن کے چلے جانے سے شمائلہ کا تو ہر خوشی ہر تہوار سے ناتا ٹوٹ گیا تھا۔ وہ جو مہندی چوڑیوں کی دیوانی تھی۔ کئی سالوں سے اس کی ہتھیلیاں خالی اور کلائیاں سونی تھیں۔ اس نے تو گویا ہر چیز سے ناتا توڑ لیا تھا۔ اسی دوران اس کے کتنے ہی اچھے اچھے پرپوزل آئے مگر وہ ہر بار انکار کر دیتی، ماں باپ اس کے آنسوؤں کے سامنے بے بس ہو جاتے، حسن اس کے لیے آج بھی سب کچھ تھا وہ کیسے حسن سے بے وفائی کر سکتی تھی۔ آخر کو وہ اس کا محبوب شوہر تھا۔ اس کے دل کی سلطنت کا تنہا حکمران اس کی پہلی محبت وہ تو اس سے بے وفائی کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

☆......☆

رمضان المبارک کا آخری عشرہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ دن رات عبادت میں مصروف رہا کرتی، جوں جوں عید قریب آ رہی تھی اس کے دل کی ویرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ نادیہ بیگم نے اس دفعہ اس کے ہر جواز و انکار کو خاطر میں لائے بغیر حسن کے دوست رضا صدیقی کے پرپوزل کو اوکے کر دیا اور دکھ تو یہ تھا کہ گھر میں تمام لوگ نادیہ بیگم کے ہمنوا تھے۔ عید کے روز اس کی منگنی رضا صدیقی کے ساتھ ہونا قرار پائی تھی۔ اس کا دل راضی نہ تھا وہ حسن کا مقام بھلا کسی اور کو کیسے دے سکتی تھی مگر نادیہ بیگم کے آنسوؤں نے التجاؤں نے اس کے لب سی دیے تھے۔

☆......☆

"یااللہ! تو میری مشکل آسان کر دے تو تو میرے حال سے اچھی طرح واقف ہے۔ اے میرے مالک اگر تو نے مجھ سے میرے حسن کو دور کیا ہے تو اس کے احساس کو بھی مجھ سے دور کر دے، اے پاک پروردگار تیرے ہر کام میں مصلحت پوشیدہ ہے تو بہتر جانتا ہے کہ تیرے بندوں کے لیے کیا بہتر ہے۔ میرے ماں باپ نے جو فیصلہ کیا ہے اس میں مجھے ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا کرنا، مجھے میرے دل کو صبر دینا کہ بے شک تو بڑا رحیم و کریم ہے۔" وہ عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے رب سے دعا مانگ رہی تھی۔ آج چاند نظر آنے کے آثار بڑے نمایاں تھے اور کل عید متوقع تھی۔

☆......☆

"آپی! عید کا چاند مبارک ہو۔" وہ جوں ہی نماز ادا کر کے کمرے سے باہر نکلی چہکتی ہوئی نائرہ نے اسے گول گول گھما ڈالا۔ قریبی مسجد سے چاند نظر آنے کا اعلان ہو رہا تھا۔

امی اور چچی کچن میں صبح کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ نائرہ، ابو کے ساتھ مارکیٹ چلی گئی تھی۔ شمائلہ کے بھی بہت پیچھے پڑی تھی کتنی دیر منتیں کرتی رہی تھی مگر اس نے جانے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ اس سے خفا ہوتی اکیلی ہی ابو کے ساتھ مارکیٹ چلی گئی۔ اس کا دل یک دم ہی ہر چیز سے اچاٹ ہوا تھا۔ وہ بے دم قدموں چھت پر چلی آئی۔ ہر طرف

چاندرات کی مخصوص گہما گہمی تھی۔ اس نے آسمان پر چمکتے ہلالِ عید کو دیکھا اور پھر اپنی خالی ہتھیلیوں کو دیکھتے اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا نمکین پانی بھر آیا تھا۔

"کاش کہ تم بھی یوں ہی اچانک سے لوٹ کر آسکتے حسن۔" بے اختیار اس کے لبوں سے سسکاری نکل گئی تھی۔

"لوٹ آیا ہوں صرف تمہارے لیے۔" اس آواز کو تو وہ لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ وہ تیزی سے پلٹی تھی مگر پلٹتے ہی کسی کے مضبوط چٹان جیسے سینے سے بری طرح ٹکرائی تھی کہ اگر سامنے والا اسے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں نہ لیتا تو یقیناً وہ گر چکی ہوتی۔

"استقبال کا یہ طریقہ رومنٹک ہے آئی لائک اٹ۔" اسے شانوں سے تھام کر اپنے مقابل کھڑا کرتے وہ یقیناً حسن تھا۔ وہ اس قدر شاکڈ ہوئی تھی کہ بے یقینی کے عالم میں اپنے سامنے مکمل بلیک سوٹ میں خوبرو حسن کو بنا پلکیں جھپکے دیکھے گئی تھی۔ بے اختیار ہی اس کا ہاتھ اس کے چہرے کی طرف بڑھا تھا جسے حسن نے تھام لیا تھا۔

"یہ سپنا نہیں حقیقت ہے شمائلہ۔" اس نے دو قدم آگے بڑھ کر اس کے شانوں کو تھاما تھا وہ بے یقینی کے سمندر سے نکلتے اس کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"بس کرو شامی! کیا سیلاب لانے کا ارادہ ہے۔" اس نے اپنے سینے سے لگی بے دریغ آنسو بہاتی شمائلہ کا سر سہلاتے دھیمے سے کہا تھا۔ وہ پھر بھی اس کے سینے سے لگی یوں ہی روتی رہی۔

"اگر میں کوئی بے ایمانی کر جاؤں تو پھر شکایت مت کرنا۔" اس کی گھمبیر سرگوشی پر وہ فوراً ہی جھینپ کر اس سے الگ ہوئی تھی، حسن کو بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔

"کیسی ہو شامی؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے اس کے حزن ملال سے لپٹے حسین چہرے کو نظروں کی گرفت میں لیتے پوچھا تھا۔

"کیسی ہو سکتی ہوں حسن! میری زندگی چھین کر پوچھتے ہو کیسی ہوں سات سال حسن سات سال، میں نے زندگی کو گھٹ گھٹ کر جیا ہے، سات سال گزرنے کے بعد بھی میرا دل یہ ماننے کو تیار نہ ہو سکا کہ تم مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ہو اور آج سات سال بعد تم مجسم میرے سامنے کھڑے ہو، مجھ نہیں آتا یہ میری خوش نصیبی ہے یا بدنصیبی، ایسا گھٹیا مذاق کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میری محبت کا امتحان لینا چاہتے تھے تو کسی اور طرح سے لے لیتے۔" وہ ہچکیوں سے روتے اس کے سینے پر مکے مارتے بولی تھی۔

حسن نے چند لمحے اسے تڑپتے دیکھا تھا اور پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو چنا تھا۔

"شامی میں نے بھی یہ سات سال اپنے ملک سے دور اپنوں کے بغیر کیسے گزارے ہیں، سڈنی میں میرا بہت بری طرح ایکسیڈنٹ ہوا تھا سر میں شدید چوٹیں آئی تھیں اور میں کوما میں چلا گیا۔ یہ میرے رب کی مہربانی ہے کہ میں پورے چھ سال اور دو مہینے بعد ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ ڈاکٹرز اس معجزے پر حیران رہ گئے تھے۔ ہوش میں آیا تو ذہن کی سلیٹ بالکل کوری لگ رہی تھی۔ دل تو کر رہا تھا ایک لمحے کی دیر کیے بغیر تم تک پہنچ جاؤں مگر پھر سوچا جہاں اتنا صبر کیا ہے وہاں کچھ جدائی کے کٹھن لمحے اور سہی۔ عید پر جا کر سرپرائز دوں گا آج تمہارے سامنے موجود ہوں۔" وہ کھل کر مسکرا رہا تھا۔

"مگر وہ فون، جس میں تمہارے وہ......" اپنی بات ادھوری چھوڑ گئی تھی۔

"وہ سب رضا صدیقی کا کیا دھرا تھا۔ میں کوما میں گیا تھا مگر اس نے یہاں فون پر میرے مرنے کی جھوٹی خبر پھیلا دی۔" حسن نے گہری سانس لی۔

"مگر وہ تو آپ کے بہت اچھے دوست تھے۔ وہ ایسا کیوں کریں گے۔" وہ حد درجہ حیران تھی۔

"وہ تمہیں پسند کرنے لگا تھا۔ تم سے شادی کا خواہش مند تھا جبھی اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔"

"کیا......!" اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔ حسن نے کندھے اچکا دیے۔

"آپ جانتے ہیں آج کل ان کا پرپوزل میرے لیے آیا ہوا ہے۔ سات سال میں چوتھی بار انہوں نے اپنا پرپوزل بھیجا ہے اور اس دفعہ تو گھر والے بھی تیار تھے۔ کل میری منگنی کرنے والے تھے۔" وہ صدمے سے گنگ ہوتی بولتی چلی گئی۔

"جانتا ہوں۔" حسن نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اس قدر گھٹیا کوئی کیسے ہو سکتا ہے۔" شمائلہ نے تاسف سے سر ہلاتے کہا تھا۔ "اس کی خود غرضی نے سات سال تک اسے کیا برزخ میں جھونک دیا تھا اور اگر رضا صدیقی سے اس کی منگنی ہو جاتی......" اسے سوچ کر ہی جھرجھری آگئی تھی۔

"بیتی باتوں کو بھول جاؤ شمائلہ خدا کی طرف سے آزمائش تھی جو کہ اب ختم ہو گئی ہے۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ مارکیٹ جا کر ڈھیر ساری شاپنگ کریں گے۔"

"سچ!" وہ آج کتنے عرصے بعد ایسے خوشی سے چہکی تھی۔

"ہوں، مگر ایک شرط ہے۔" وہ اس کے خوشی سے دمکتے خوب صورت چہرے کو نگاہوں میں لیتے بولا تھا۔

"جلدی بولو کیسی شرط۔" وہ بنا سوچے سمجھے کہہ گئی تھی۔

"موقع بھی ہے، دستور بھی آج تو گلے مل کر عید کی ایڈوانس مبارک باد دے دو۔" وہ شرارت سے اس کے مزید قریب آتے بولا تھا۔

"منہ دھو رکھیں۔" وہ جھینپ کر کہتی ہوئی ایک قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"کوئی بات نہیں، ابو سے بات کر کے تمہیں جلد ہی رخصت کرا کے اپنے بیڈروم میں لاؤں گا اور گن گن کر سارے بدلے لوں گا۔" وہ اسے دھمکاتے ہوئے بولا تھا۔

"آپ مجھ سے بدلے لینے کے لیے رخصتی کروائیں گے۔" وہ یکدم ہی خفا ہوئی تھی۔

"نہیں، ڈھیر ساری محبت کرنے کے لیے۔ بہت سزا کاٹ لی دوری کی اب انشاء اللہ زندگی کے سفر میں ساتھ ساتھ رہیں گے۔" وہ جذب سے بولا تھا۔

"انشاء اللہ۔" اس نے بھی دل کی گہرائیوں سے کہا تھا۔

"شامی ایک بات کہوں۔" وہ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے بولا تھا۔

"ہاں کہو۔" وہ اسے دیکھنے لگی تھی۔

"آج کے بعد اپنے ہاتھوں کو کبھی خالی مت رکھنا، مجھے تمہارے ہاتھوں میں بجی ڈھیر ساری چوڑیاں بہت پسند ہیں۔" وہ بڑے پرحدت لہجے میں بولا تھا۔ وہ یکدم ہی نگاہ جھکا گئی۔

"آئی لو یو شامی۔" اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھتے حسن نے بڑے گھمبیر لہجے میں کہا تھا۔ وہ سرخ ہوتا چہرہ یک دم ہی جھکا گئی تھی اور دل میں اللہ کی شکر گزار تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے صبر پر اسے بہت بڑے اجر سے نوازا تھا حسن کی صورت میں اسے نئی زندگی عطا کی تھی۔ بے شک وہ خالق کائنات اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ یہ عید اس کے لیے ڈھیروں خوشیاں اپنے سنگ لائی تھی۔ وہ تہہ دل سے اپنے رب کے حضور اس کی مہربانیوں پر شکر گزار تھی۔

......☆......

سعدیہ اقبال

افسانہ

عید سنگ خوشیاں

رمضان مبارک شروع ہوئے ہی تھے کہ نور کو فکر لگ گئی مارکیٹ جانے کی۔

"امی کب عید کے کپڑے لیں گے؟ میری کالج فرینڈز کب کی شاپنگ کر بھی چکی ہیں اور مجھے اپنی چیزیں دکھا دکھا کر جلاتی رہتی ہیں۔" نور نے منہ بنایا۔

اس کی جلدی بازی اور ہر وقت سر کھانے کی وجہ



سے آج ذکیہ، نور کو بازار لے ہی آئیں۔ اپنی پسند کے تین سوٹ، جوتے جیولری لینے کے بعد نور اب ایک اور انتہائی مہنگے فراک کی ضد کر رہی تھی۔ جس پر ذکیہ کو تاؤ آگیا اور وہ غصے سے تیز تیز چلنے لگیں ان کے قدم بازار سے باہر جا رہے تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ نور کو وہ فراک دلا نہیں سکتی تھیں۔ وہ بچپن سے نور کی فضول فرمائشوں کے خلاف تھیں ذکیہ اسے سمجھاتی تھیں کہ جب انسان کی ضرورت اتنی آسانی سے پوری ہو رہی ہے تو ہمیں کفایت شعاری سے کام لینا چاہیے کیوں کہ ہر بار بیٹیوں کا نصیب سونے کے قلم سے نہیں لکھا جاتا مگر وہ نور ہی کیا جو سمجھ جائے جتنی چیزیں اسے حاصل ہو جاتیں مگر وہ ناشکری تھی ہر بار خدا کی نافرمانی ناشکری کرتی رہتی جب کہ ذکیہ ہول جاتیں اور اللہ سے معافیاں مانگتی تھیں۔

"ایسی زندگی سے تو اچھا ہے انسان فٹ پاتھ پر رہ لے۔ میری فرینڈز لاکھ درجے اچھی ہیں مجھ سے، ایک ایک چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔" نور کی اس غلط بات پر ذکیہ نے مڑ کر گھورا تھا اسے اور دل میں اس کی بدزبانی پر استغفار بھی کیا۔

☆......☆

سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر رک کر وہ رکشہ کا انتظار کرنے لگیں۔ نور کا موڈ ہنوز بگڑا ہوا تھا تبھی اس کی نظر اپنے سے تھوڑا دور سڑک کے کنارے بیٹھے وجود پر پڑیں اور وہ حیران رہ گئی۔

گلابی دھوپ میں جھلسی رنگت، میلی لمبی چوٹیا میں بندھے بال، سیاہ بے بس آنکھیں اور گندے لباس میں وہ لڑکی سڑک پر گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اتنی قدرتی خوب صورتی کے بعد وہ معذور تھی اور سڑک پر بیٹھی مانگ رہی تھی۔ کیا نہیں تھا اس کی آنکھوں میں۔ مجبوری، لاچاری، غربت کی مار؟ کیا وہ واقعی اس قابل تھی کہ اسے سڑک پر پھینک دیا جاتا۔

مگر اللہ نے اس کی زندگی ایسی ہی لکھی تھی اور اسے جینا تھا آتے جاتے لوگوں کی نظریں اس پر اٹھتی تھیں کچھ میں ترس تھا اور کچھ میں ناپاکی مگر وہ مجبور تھی کوئی اس کی ڈھال نہیں بننا چاہتا تھا۔

اور ایک وہ تھی جس کو عزت کی چار دیواری، ماں باپ کا پیار ملا تھا اس کی طرف اٹھنے والی ہر نگاہ کو روکنے کے لیے اس کے اپنے موجود تھے اور پھر بھی وہ ناخوش تھی؟ "ایسی زندگی سے اچھا انسان فٹ پاتھ پر رہ لے" کچھ دیر پہلے کہے جانے والے الفاظ یاد آتے ہی نور کو جھرجھری آگئی۔

لمحے لگے تھے اسے آگہی میں اللہ نے اس کی آنکھیں کھول دیں تبھی وہ چلتی ہوئی اس معذور لڑکی تک جا رکی اور وہ سوٹ جو اس نے عید کے لیے خریدے تھے اس لڑکی کی جھولی میں وہ شاپر رکھ آئی۔

ذکیہ ابھی تک حیران کھڑی تھیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں امی! آج مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں تو بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے خدا نے دنیا کی ہر نعمت عطا کی وہ سب کچھ دیا جس کی میں حقدار نہیں تھی شاید، مگر خیر دیر سے ہی سہی مجھے احساس ہو گیا ہے اور میں چاہتی ہوں وہ لڑکی بھی اس بار میری طرح عید منائے تبھی میں اپنے کپڑے اسے دے آئی۔" اس کی باتیں سن کر ذکیہ کی آنکھیں بھر آئیں کہ اس ماہ رمضان میں ان کی بیٹی راہ راست پر آگئی تھی اور وہ جلدی سے مارکیٹ کی طرف پلٹ گئیں۔

"ارے امی! کہاں جا رہی ہیں؟" نور پیچھے لپکی۔

"وہی فراک لینے تمہارے لیے آج تم نے میرا دل خوش کر دیا۔ میری طرف سے تمہارے لیے وہ گفٹ ہوگا۔" یہ بات سنتے ہی نور کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ آگئی یہ اس کی پہلی سکون طمانیت بھری عید ہوگی۔

☆......☆

صالحہ محمود

افسانہ

چھپ گیا چاند دھندلکے میں



ابر بھرے آسمانوں میں بھی ایک کسک سی تڑپ رہی تھی۔ شاید ابھی رعد فرشتے کو اتنا شدید غصہ نہ آیا تھا کہ وہ بجلی کی کڑکڑاہٹ کے ساتھ ایک غضب ناک آواز پیدا کرے۔ پھر بھی کئی دن کی سسکتی ہوئی بارش کی سسکیاں فضا میں ابھی تک باقی تھیں۔ ابر ٹوٹ کر برس جائے عید سے پہلے لوگ دعا کر رہے تھے۔ سیاہ رات کے آنچل میں نہ چاند نہ ستارے فضا اس کی ہی طرح بالکل خاموش تھی۔ مریم آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے نکل کر باہر آئی۔ بڑی دھوم دھام سے ساس اور نندیں عید کی تیاریوں میں لگی تھیں۔ کسی کی مہندی نہیں آئی تھی کسی کی میچنگ چوڑیاں، دیورانی اپنے کپڑے ہنس ہنس کر دیکھ رہی تھی۔ جٹھانی بڑی دبی دبی ہنسی سے نند کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ مریم کی تو اس بار عید گئی۔ مریم کو یہ لگا سب یہی سوچ رہے ہیں وہ بہت کانشس ہو کر سب کی چیزوں کی تعریف کرنے لگی۔ یوں جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور وہ بہت خوش اور مطمئن ہے۔

"بھابی! آج چاند ہو گیا تو کل عید ہو گی۔" اس کی نند شائستہ نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

"شکر ہے اللہ کا ہم نے تو اتنی دعا کی عید گزر جائے دادی جان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔" دیورانی بولیں۔ جٹھانی نے بڑے مطمئن انداز میں بہت غور کر دیکھا تھا مریم اس بار عید کی خوشیوں سے محروم رہ گئی۔

"لائیں اماں! میں یہ کاٹ دوں۔" مریم بڑی انکساری سے ساس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

"نہیں تمہاری پہلی عید ہے تم رہنے دو۔ ویسے تو ہمارے ہاں پہلی عید پر جاتے ہیں۔" اسے معلوم تھا کہ اماں کا اشارہ تھا کہ وہ اپنے گھر جائے وہ کسمسا کر اٹھ کر آ تو گئی تھی۔ مگر اسے محسوس ہو رہا تھا سب لوگ اس سے ہمدردی کر رہے ہیں اس کی بے بسی پر ہنس رہے ہیں۔ وہ واش روم میں جا کر بہت روئی تھی۔ سارے آنسو پونچھ کر منہ واش کر کے وہ یوں چلی آئی جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ تھوڑی دیر میں شور ہوا۔ پٹاخے پھوٹ رہے تھے۔ سائرن کی آوازیں آ رہی تھیں کہ چاند ہو گیا۔ دیر سے ہی سہی لیکن چاند کی شہادت کی گواہی مل گئی تھی۔ وہ سلام کرنے کے لیے ساس کے پاس گئی تو اماں بڑے ہمدردانہ لہجے میں بولیں۔

"جنید! تم اسے لے جاؤ ناں اس کی ماں سے ملوانے کے لیے۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں چلو بھئی چلو دیر مت کرو۔" چلتے چلتے یہ بھی بولے۔

"زیادہ دیر مت بیٹھنا نو بجے سے پہلے پہلے مجھے گھر آنا ہے۔ رش بڑھ جائے گا۔" وہ بیگ اٹھائے ہوئے جب اماں کے گھر اتری دو چار رشتے دار جن کی گاڑیاں تو کھڑی تھیں مگر کتنا گہرا سناٹا تھا۔ دل میں اس کے ہول سے اٹھ رہے تھے۔ گھر تھا اماں بہنیں بھابی سب تھیں لیکن وہ خود کہیں اور تھی۔ اس کے دل میں قیامت کا شور برپا تھا۔ بظاہر سب چپ چپ تھے۔ ماحول میں اداسی رچی بسی تھی۔ نہ شور نہ ہنگامہ نہ وہ شرارتیں نہ وہ مہندی کی خوشبو نہ کھنکتی ہوئی چوڑیاں اور نہ اس کی کھنکتی ہوئی آواز تھی۔ شاید اماں کچھ دیر پہلے روئیں تھیں۔ اس لیے وہ اپنی ساڑھی کے پلو سے چہرہ بار بار پونچھ رہی تھیں اور مریم بھی بڑی پرسکون سی آرام سے باتیں کر رہی تھی۔ اماں کی طرف اس نے نظر بھر کر دیکھا تو اماں کی نظریں پوچھ رہی تھیں۔ "تم تو ایسے آئی ہو جیسے اسے جانتی نہ تھیں۔ تم اتنی جلدی اسے بھول گئیں وہ تو تمہاری سگی بہن تھی۔" تبھی چھوٹی بھابی کھلکھلاتی ہوئیں دوسرے کمرے سے نکل آئیں تھیں وہ بیگ اٹھائے باہر نکل رہی تھیں۔

"ارے مریم بیٹھو تم تو جا رہی ہو اتنی جلدی۔ بس میں بھی جانے والی ہوں۔ امی کی طرف بھائی میاں مجھے لینے آ رہے ہیں۔ میں تو صبح آؤں گی۔ رات مہندی والی گھر میں بلوائی ہے امی نے۔ ہاں تم تو اس بار عید نہیں مناؤ گی۔" بھابی نے بڑی بے دردی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چلو ٹھیک ہے کل تو آؤ گی تم لوگ پھر ملاقات ہو گی۔ اچھا اللہ حافظ۔" وہ ہارن کی آواز پر اس سے پہلے ہی نکل گئیں۔

عید کی خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ وہ سسرال پلٹ کر آئی تو سب تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ کوئی مہندی کوئی گھر کی صفائی میں لگا ہوا تھا۔ جلدی جلدی سب کام نمٹا رہے تھے۔ وہ بیزاری سے اپنے روم میں چلی آئی کچھ بھی تو نہ تھا۔ نہ رنگ نہ مہندی نہ گجروں کی خوشبو سرسراتے ہوئے آنچل میں نہ کوئی جگنو [illegible] پر پاؤں بے سدھ دھرے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کام کروں۔ پچھلے برس تو میں نے بہت کام کیے تھے اس برس تو کرنے کے لیے کوئی کام ہی نہیں ہے۔ وہ سوچ رہی تھی تو ساس نے آ کر پوچھ ہی لیا۔

"دیکھو دلہن! سوگ تو تین دن کا ہوتا ہے۔ یہ بھرا پھرا گھر ہے۔ سوگ تو اماں کے گھر ہوتا ہے۔ تم بھی جا کر اپنے لیے نئے کپڑے اور چوڑیاں وغیرہ لے آؤ۔"

"بہت بھیڑ ہوگی بازار میں۔" دیورانی اپنی مہندی دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسی لیکن وہ بھی جلدی سے پلٹ کر اپنا بیگ لینے اندر آ گئی اس کی باڈی لینگویج سے لگ رہا تھا کہ وہ دیورانی کے ہنسنے پر تلملا اٹھی ہے۔ رات بیت رہی تھی۔ وہ اداس اداس سی مہندی کو مٹھی دبائے سوچ رہی تھی۔ وہ کالج کے زمانے میں بھی ایسی ہی مہندی تو لگایا کرتی تھی۔ سرخ مہندی میں اسے سفید مچھلی اچھی لگتی تھی۔

☆......☆

صبح سسرال میں بڑی گہما گہمی تھی۔ ہر شخص بنا سنورا تھا مہمانوں کی آمد آمد تھی۔ بڑی نند بھی آ گئی تھیں انہوں نے بہت ہی غور سے مریم کو دیکھا۔

"بھابی آپ نے کپڑے ابھی بنوائے ہیں؟"

"نہیں، بنوائے نہیں ہیں کل رات بوتیک سے لے کر آئی ہوں اور یہ دیکھو میری مہندی کا رنگ کتنا گہرا آیا ہے اور چوڑیاں تو بالکل میرے ڈریس سے میچ کر رہی ہیں اور یہ پرس اور سینڈل کل ہی میں نے رات میں خریدی ہیں۔ سب کچھ میرا کتنا اچھا ہے ناں اور دیکھو یہ کتنی Expensive میں نے رنگ بھی خریدی ہے۔"

"میں یہ سمجھی یہ آرٹیفشل ہے۔" توحیدہ آپا بولیں۔

"ارے نہیں یہ رنگ اور گھڑی عید کا خاص تحفہ ہے۔"

"بھائی جان نے دلوایا ہے؟" بڑی نند بولیں۔

"ظاہر ہے، جس چیز پر میں ہاتھ رکھ دوں کبھی وہ ناں کہتے ہی نہیں ہیں۔" مریم بہت زور سے ہنسی تھی۔

"لیکن بھابی! یہ آپ کی بہن کی تو پہلی عید ہے۔" توحیدہ آپا نے بہت غور سے مریم کو دیکھا تو وہ جھٹ بول پڑی۔

"سوگ تو تین دن کا ہوتا ہے عید بار بار تھوڑی آئے گی میرا ابھی دل چاہ رہا ہے کہ میں بھی تم لوگوں [illegible] عید مناؤں۔" مریم بات بے بات ہنسے جا رہی تھی۔

"[illegible] ہے۔" دیورانی آنکھوں، آنکھوں میں نند سے کہہ [illegible]

"دیکھیں بھابی! ہمارے ہاں تو پہلی عید کو تو سوگ مناتے ہیں۔" توحیدہ آپا بولیں۔

"نہیں ہمارے ہاں تو کوئی ایسا سوگ نہیں منایا جاتا۔"

"اور تمہاری اماں۔" ساس بولیں۔ [illegible] میں ہمدردی کے بجائے حیرانگی جھلک رہی تھی [illegible] یقین نہیں آ رہا تھا کہ مریم اتنی خوش نظر آئے گی سب یہی امید کر رہے تھے۔ اس پر رحم کھا رہے تھے کہ بے چاری مریم روتی بسورتی ہوئی بیٹھی ہوگی۔ حتیٰ کہ نماز پڑھ کر آنے کے بعد جنید نے بھی کھل کر اس کی ڈریسنگ کی تعریف کی تھی کہ وہ آج بہت اچھی لگ رہی ہے۔ وہ تھی کہ ضد اور غصے میں ہنسے جا رہی تھی۔ آنے جانے والے پرسا کرنے والے بھی بھابی جان کہہ کر ٹھٹک گئے وہ اور دنوں سے زیادہ بنی سنوری نظر آ رہی تھی۔

"آج بہت تم خوش نظر آ رہی ہو اتنے دنوں کے بعد، چلو تمہاری اماں سے تمہیں ملوا کر لے آتے ہیں۔" جنید بولے۔

اماں کے گھر کے لیے جب وہ نکلی تو بڑی سی چادر لپیٹ کر اس نے بیگ میں رکھی۔ کب اور کیسے جنید کو بھی نہ پتا چلا اس نے ساری چوڑیاں اتار کر بیگ میں ڈال لی تھیں۔ حتیٰ کہ نئی چپلیں وہیں اس نے گاڑی میں رکھ کر بیگ سے پرانی چپلیں نکال کر پہن لیں۔ ساری جیولری بھی بیگ میں اتار کر رکھ لی۔ جنید سے بہانہ کر کے وہ بیک سیٹ پر بیٹھی تھی کہ آج ہادی بہت تنگ کر رہا ہے۔ اترتے وقت اس نے چادر اوڑھ لی اور بیگ اٹھائے وہ اماں کے گھر آئی تھی۔ وہی سوگواری کا عالم تھا نہ کسی نے چوڑیاں، کپڑے بدلے تھے اور نہ بھینی بھینی سویوں کی خوشبو تھی۔ البتہ رشتے دار کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر اماں کے گھر آئے تھے۔ اماں اداس سی ڈگ کی ساڑھی کے پلو سے چہرہ پونچھ رہی [illegible]

سب کے چہروں پر آنسو نہیں بس ایک اداسی تھی۔ اس کے دونوں بھائی سادہ سے لباس میں گھوم رہے تھے۔ [illegible] ہر شخص اداس اور چپ چپ سا اماں کے سامنے تھا لیکن مریم اماں کے سامنے ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی۔ ہاں بس اتنا فرق تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ کی مٹھی کو بند رکھا تھا تا کہ کوئی نہ دیکھ لے کہ اس نے بھی مہندی لگائی ہے۔ اماں اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ بہن کی موت کے بعد سے وہ کبھی اماں کے سامنے نہیں روئی۔ اماں ہمیشہ پوچھتیں۔

"[illegible] یاد نہیں آتی اس کی۔" اماں اسے غور سے دیکھتیں۔ دل کے سارے بھید چھپا کر وہ ہنس دیتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اماں اپنا یہ دکھ بھول جائیں۔ اس بار بھی وہ بہت حد تک کامیاب رہی تھی۔ اماں کے گھر سے نکلتے ہوئے آخر چھوٹی بھابی سے مڈ بھیڑ ہو ہی گئی۔ [illegible] ابھی وہ آئی تھیں ہنس کر بڑی محبت سے گلے ملیں اور بولیں۔

"کیسی رہی تمہاری عید، ہماری تو بڑی شاندار عید رہی خوب رات ہم نے مہندیاں لگوائیں، رات بچوں کے ساتھ ہم آئس کریم کھانے گئے۔ ساحل سمندر کی سیر کی۔ صبح ہم لوگ لوٹے۔ چوڑیاں تم نے دیکھیں۔ میری مہندی دیکھو کتنی اچھی لگ رہی ہے ناں۔" وہ جلدی جلدی بولے جا رہی تھیں تا کہ مریم کی کوئی بات نہ سن سکیں۔ ہوتا بھی یہی ہے جب انسان اندر سے ٹوٹا ہوا ہوتا ہے تو سامنے والے کو وہ مطمئن نہیں دیکھ سکتا تب وہ جلدی جلدی اپنی بات بتانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ حسد اور جیلسی کا ایک چھپا ہوا انداز ہے سو اس وقت بھی اس کی بھابی کو معلوم تھا کہ وہ مریم سے مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس لیے وہ جلدی جلدی بتا کر خاموش ہوئیں تو مریم ہاتھ کی مٹھی چھپا کر بولی۔ "اچھا بھابی! میں چلتی ہوں۔"

مغرب کا پہر تھا آسمان پر ابھی تک کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کالے بادلوں سے باریک سنہرا چاند نکل آیا تھا۔

"کیا ہوا، کیا کوئی بات ہوگئی تم اتنی خوش خوش آئی تھیں اداس کیوں ہوگئیں۔" جنید بولے۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار گری اور سیاہ بادل پھر گھر آئے تھے۔ بارش کی نمی تھی اس کے چہرے پر یا آنسوؤں کی یلغار، ہلکی ہلکی بارش کی بوچھاڑ نے اس کا پردہ پھر رکھ لیا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ نکال کر شیشے سے باہر کر لیا تو تیز بارش کی بوچھاڑ اندر تک آ گئی۔ اس نے باہر غور سے دیکھا۔ سیاہ بادلوں نے سنہرے چاند کو ڈھانپ لیا تھا ایک روشن چہرہ آہستہ آہستہ بادلوں کی سیاہی میں تحلیل ہوتا چلا گیا۔ گاڑی بڑی تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ سڑکوں پر پانی کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ سیاہ بادلوں میں چاند چہرے کو ڈھونڈتی ہوئی آنکھیں بے بسی سے مسکراتے ہوئے ہونٹ کہہ رہے تھے۔

"دکھ مجھے اس بات کا نہیں کہ تم مر گئیں دکھ مجھے اس بات کا ہے کہ میں کیوں زندہ ہوں۔"

دل میں اک کسک سی ہے معلوم تو ہو
چھوڑ کر مجھ کو کس حال میں ہوگا وہ

☆......☆

ماریہ عمران

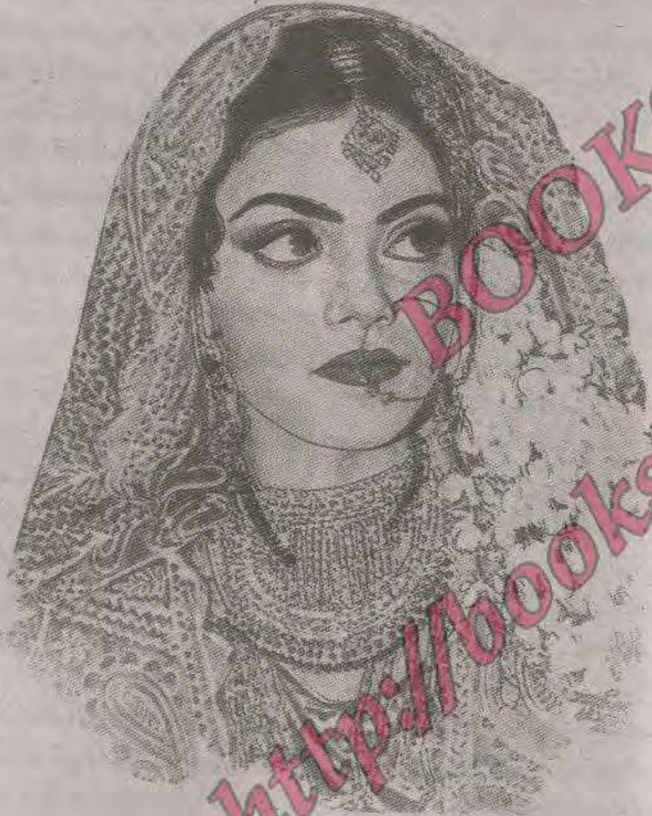
افسانہ

چاند رات اور ہم

وہ لوگ دس سال بعد رمضان سے پہلے پاکستان لوٹے تھے۔ وہ کسی صورت پاکستان نہیں آنا چاہتی تھی۔ پر مما پاپا کی ضد کے آگے مجبور ہو کر وہ پاکستان آنے کے لیے راضی ہوئی تھی۔ جب وہ لوگ کینیڈا شفٹ ہو رہے تھے تو اس کی عمر تقریباً تیرا برس تھی اور وقت کی دھول اس کی آنکھوں پر ایسی چڑھی کہ پاکستان کی یادیں اور رشتوں کی اہمیت کینیڈا کی چکا چوند میں بالکل مدھم پڑ گئیں۔ بالآخر وہ وقت بھی آ گیا جب انہوں نے ایک طویل عرصے بعد اپنے گھر کراچی میں قدم رکھا۔ دادی بوا، پھپھو، چاچو سب موجود تھے۔ ایک خوب صورت انتہائی بڑے سے مکان میں سب نے پرزور طریقے سے خوش آمدید کہا۔ سب آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے ایک دوسرے سے علیک سلیک کرنے میں موجود تھے اور وہ مغربی لباس میں بیگ ہاتھ میں پکڑے حیرانی سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ سب اسے ایموشنل فولز دکھائی دے رہے تھے۔ وہ حیرانی سے ان سب کا میلو ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔

"اف یہ مڈل کلاس لوگوں کے ڈرامے۔" اس نے نخوت سے دل میں کہا۔ تبھی کسی نے زوردار طریقے سے اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

"ہائے میری بچی سونیا! اتنی بڑی ہو گئی۔ میں صدقے جاؤں، ارے بالکل ہی بدل گئی یہ تو چھوٹی سی تھی جب یہاں سے گئی تھی۔" دادی بوا نے گلے





سے بھینچ لیا۔ باقی سب بھی متوجہ ہو کر اسے پیار سے گلے لگانے لگے۔ ایسے میں وہیں دور کھڑا علی، سونیا کے چہرے پر حیرانی اور ناگواری کے تاثرات دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ سونیا اس سچویشن میں گھری کتنا پزل ہو رہی ہے۔ وہ ابھی آفس سے گھر لوٹا تھا ابھی اس کی نظر سونیا پر پڑی تھی کہ اتنے سارے لوگوں میں وہ اتنی کنفیوژ ہو رہی تھی کہ وہ مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ مہمانوں سے ملاقات ترک کر کے وہ سونے چلا آیا۔ سوچا کہ کل مل لے گا۔ علی سونیا کی سب سے بڑی پھپھو کا بیٹا تھا۔ پھپھو جوانی میں ہی بیوہ ہونے کے بعد اپنے میکے میں بیٹے سمیت رہنے لگی تھیں۔ یہ بھرا پرا خاندان خوشیوں سے مزین اس گھر میں بہت سالوں سے آباد تھا۔ علی کی امی نے اپنی تمام تر جمع پونجی لگا کر علی کو انجینئر بنایا تھا۔ وہ کراچی کی ایک مشہور و معروف فرم میں مکینیکل انجینئر تھا۔ اب وہ خود اس قدر مستحکم تھا کہ اپنی ماں کو ایک خوب صورت اور پر آسائش زندگی دے سکتا تھا۔ سارے گھر میں کینیڈا سے آنے والے مہمانوں کا شور تھا۔ اتنے سارے لڑکے لڑکیاں تھے کہ دس بار تعارف...... کے بعد بھی سونیا کو نام یاد نہیں ہوئے تھے۔ چھوٹی پھوپھو بھی اپنے تین بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ تینوں ہی جوان اور نٹ کھٹ تھے۔ باقی چاچو کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ نیز گھر میں اتنے سارے کریکٹر تھے کہ سونیا کے لیے یاد رکھنا مشکل تھا۔

"سونیا جی! آپ ابھی ہمارے پاس سے نہیں ملیں۔ اصل تو وہ ہیں یہاں جو جب بھی گھر پر ہوتے ہیں تو ہم نہ زیادہ شور کر سکتے ہیں نہ تفریح۔" چچا زاد بھائی صائم نے ہنستے ہوئے سونیا کو بتایا، سارے کزنز اس کی اکتاہٹ کو نظر انداز کیے اس سے محو گفتگو تھے۔

"ابھی آج تو آپ لوگ آئے تو گھر میں شور ہو گیا اتنا، زیادہ ورنہ علی بھائی کی موجودگی میں اتنا شور شرابہ...... نو...... نیور......"

"ارے ہاں علی کہاں ہے نظر نہیں آیا ابھی تک؟" سونیا کے پاپا خرم شہزاد نے علی کا نام سن کر استفسار کیا تبھی بڑی پھوپھو یکدم بولیں۔

"ارے خرم وہ ابھی آیا تھا آفس سے آتے ہی سو گیا ہے۔ انشاء اللہ کل چھٹی ہے کل ملاقات کر لے گا سب سے۔" اسی طرح گھنٹوں وہ لوگ باتیں کرتے رہے، پر تکلف ڈنر سے تواضع کی گئی۔ پاکستان کے کھانوں نے سوائے سونیا کے سب کا دل موہ لیا۔ وہ اتنا آئل اور مرچ والا کھانا نہیں کھا سکتی تھی۔ اس لیے صرف سلاد پلیٹ میں لیے بیٹھی رہی۔ سب کے اصرار کے باوجود اس نے کچھ نہیں کھایا اور کھڑی ہو گئی۔ اس نے دبے لفظوں میں اپنے کمرے کے بارے میں استفسار کیا۔ اس کی کزن کرن نے جھٹ کہا۔

"سونیا آپی آپ کا بیڈ میرے کمرے میں ہے، میں اور آپ ساتھ رہیں گے۔"

"وہاٹ...... بٹ آئی کانٹ اسٹے ود اینی باڈی۔"

"I want seporate room."

سونیا نے بے ساختہ کہا۔ خرم شہزاد جانتے تھے کہ یقیناً گھر میں اتنے کمرے موجود نہیں ہوں گے کہ سب کو علیحدہ کمرے دیے جا سکیں۔ تبھی انہوں نے سونیا کو سختی سے آنکھیں دکھاتے ہوئے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ پیر پٹختی ہوئی کرن کے ساتھ کمرے میں چلی گئی۔ سب کے چہروں پر شرمندگی کے آثار تھے تبھی دادی بوا نے ماحول کو خوش گوار کرنے کے لیے ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے بچی ہے کوئی بات نہیں۔ ایک عرصے بعد آئی ہے سمجھ جائے گی یہاں کے حالات۔" یوں ہی ہنستے ہنساتے سب باتیں کرتے رہے۔ خرم شہزاد اور ان کی اہلیہ عالیہ خرم سب بے انتہا شاد تھے۔ مگر سونیا حد درجہ یہاں گھٹن محسوس کر رہی تھی۔ سب انجانے چہرے اس پر ہر وقت کی دعوتیں، ایسے میں اتنے

سارے دن کاٹنا بہت کٹھن تھا۔

☆......☆

"پاپا! ہاؤ کڈ یو ڈو دس ٹو می؟" سونیا تو سن کر گویا جل ہی پڑی تھی، جب خرم شہزاد نے اس کی شادی طے کرنے کی بات سے آگاہ کیا سونیا کا کینیڈا میں بگڑنا خرم شہزاد اور عالیہ خرم کے لیے خطرے کی گھنٹی تھا، تبھی وہ سونیا کو بہانے سے پاکستان لے کر آئے تھے تا کہ یہاں اپنے بھانجے سے اس کی شادی کر سکیں۔ سونیا کی شادی کی عمر بھی تھی اس پر ان کی اولین ترجیح یہ ہی تھی کہ پاکستان میں اپنے ہی خاندان میں شادی ہو۔ سونیا کے اوپر یہ خبر ایک بم کی طرح سر پر پھوٹی تھی۔ وہ جتنی بھی ماڈرن اور آزاد خیال ہو مگر اپنے باپ کے غصے سے پھر بھی ڈرتی تھی۔ اپنی شادی کے فیصلے کے بارے میں جان کر وہ بے حد رنجیدہ تھی اور مسلسل روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"پاپا...... پاپا پلیز! میں یہاں اکیلے نہیں رہ سکتی۔ میں کسی بھی انجان انسان سے شادی نہیں کر سکتی۔ پلیز۔" وہ مسلسل روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ عالیہ خرم کے نزدیک علی سے بہتر کوئی داماد ہو نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے وہ بچی کو سمجھانے کی مکمل سعی کر رہی تھیں۔ خرم شہزاد بھی اسے اس رشتے کو قبول کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ جانتے تھے کہ یہ فیصلہ بہت صحیح فیصلہ ہے۔

"پاپا بعض بڑوں کے فیصلے صحیح نہیں ہوتے۔ I cant never be happy."

"اور میرا دعویٰ ہے کہ تم دوبارہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤ گی کہ علی سے اچھا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ یاد رکھنا کوئی غلط بات یا حرکت مت کرنا، جس سے ہماری سبکی ہو، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ میں چاہتا ہوں تم یہاں رہو اور یہاں کے طور طریقے سیکھ کر ایک مشرقی لڑکی بن کے دکھاؤ۔ اب یہ گھر تمہارا ہے اور اپنے رشتے کا نباہ جتنے احسن طریقے سے کرو گی اتنا ہی اچھا ہے۔" خرم شہزاد کہتے ہوئے اسے روتا چھوڑ کر باہر آ گئے وہ علی سے اس قدر متاثر تھے کہ کسی حال میں بھی اسے کھونا نہیں چاہتے تھے۔ ایسے خوب صورت پڑھے لکھے داماد خوش نصیب لوگوں کو ملتے ہیں۔

دو مہینے بعد ان کی شادی طے پائی تھی۔ گھر میں چھوٹے پیمانے پر منگنی کر دی گئی۔ علی اور سونیا کے علاوہ سب خوش تھے۔ دوسری طرف علی بھی بہت ٹینشن میں تھا کہ سونیا جیسی آزاد خیال لڑکی کیسے گھر بار دیکھ سکے گی۔ تیاریاں عروج پر تھیں۔ سونیا نے ہر کوشش میں ناکامی کے بعد خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ آزاد خیال تھی پر نڈر نہیں تھی۔ کوئی بھی غلط قدم کا سوچ کر اس کی روح کانپ جاتی تھی اور پھر کچھ دن بعد نہایت دھوم دھام سے وہ کرن کے کمرے سے شفٹ ہو کر علی کے سجے سجائے قیمتی اشیاء سے مزین کمرے میں دلہن بن کر پہنچا دی گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ان حالات پر خود کشی کر لے۔ اس طرح کسی انجان آدمی کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل تھا۔ وہ مسہری پر بیٹھی غصے پر قابو پانے کی سعی کر رہی تھی۔ تبھی علی ہاتھ میں کلاہ پکڑے اندر داخل ہوا۔ نہ سونیا کی بھی اس سے بات چیت ہوئی تھی نہ اس کی، دونوں ہی ایک دوسرے سے انجان تھے۔ اس نے خاموشی سے اندر داخل ہونے کے بعد واش روم کا رخ کیا۔ فریش ہو کر واپس آیا تو اپنی دلہن کو ہنوز اسی پوزیشن میں پایا۔ پریشان چہرہ، حسین سراپا، وہ خاموشی سے تولیہ سے ہاتھ خشک کرتا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"اینی پرابلم......؟ کوئی مسئلہ ہے تمہیں یا مجھ سے ڈر لگ رہا ہے؟"

"نہ...... نہیں...... بس ایسے ہی۔" اس نے اچانک سوال پر بوکھلا کر کہا۔ علی کہاں مطمئن ہونے والا تھا اس نے بہت شیرینی کے ساتھ پوچھا۔

"سونیا! تم گھبراؤ مت، بالکل ریلیکس رہو جو کچھ بھی دل میں ہے بول دو۔ میں ہر بات بہت اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ پڑھا لکھا ہوں، تم بتاؤ کیا بات ہے؟ پریشانی تمہارے چہرے سے عیاں ہے۔" علی کا محبت سے اس طرح استفسار کرنا سونیا کے لیے بہت حیران کن تھا۔ تھوڑی پس و پیج کے بعد اس نے اپنے دل کی بات بتا دی کہ وہ یوں اچانک شادی جیسی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھی اور یوں ایک انجان انسان کے ساتھ زندگی میں آگے بڑھنا بہت مشکل تھا۔ یہ ساری باتیں جان کر علی کو حیرانی نہیں ہوئی بلکہ اس کے نزدیک یہ ہی خیالات متوقع تھے اس نے مسکراتے ہوئے سونیا کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

"ارے تم بالکل ٹینشن نہیں لو۔ انجان لوگ کب جان سے پیارے بن جاتے ہیں پتا بھی نہیں لگتا اور جو بھی پرابلم ہو مجھے ایک دوست کی حیثیت سے بتانا، مجھے رشتہ آگے بڑھانے میں کوئی جلدی نہیں ہے۔"

"لیکن میری آپ کی کبھی نہیں بن سکتی۔ میں نے سنا ہے آپ بہت روڈ اور غصے والے انسان ہیں۔ ہر وقت سب کو ڈانٹتے رہتے ہیں۔ میں کیسے آپ کو اپنا دوست بناؤں؟" سونیا نے معصومیت سے اچانک کہا۔ اس کی اتنی بچکانہ اسٹائل میں بات کرنا علی کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر گیا۔

"ہاہاہا...... یہ تم سے کس احمق نے کہا کہ میں غصے والا اور روڈ ہوں؟"

"بس کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں۔ آپ کو میں نے بھی ہمیشہ الگ دیکھا ہے سب سے U look so dry." وہ علی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے معصومیت سے گویا ہوئی۔ علی اس کی باتوں کو بہت انجوائے کر رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سارے ڈر اور خوف دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"جناب! نہ ہی میں رود ہوں نہ خشک انسان ہوں، میرے پاس ٹائم ہی نہیں ہوتا، جتنا ٹائم ملتا ہے میں اس میں آرام کو ترجیح دیتا ہوں۔ یا پھر اپنے کمرے میں مختلف کاموں میں مصروف رہتا ہوں۔ مجھے مصروف رہنے کا شوق ہے لیکن تم آگئی ہو تو کچھ مصروفیت کو خیر باد کہنا پڑے گا۔" وہ شرارت سے سر کھجاتے ہوئے بولا۔ واقعی سونیا نے اسے بالکل الٹ پایا تھا۔ وہ جب سے کمرے میں آیا تھا خوش مزاجی سے محوِ گفتگو تھا۔ وہ مزید اس کی ہچکچاہٹ دور کرنے لگا۔

"تم پریشان مت ہو۔ ٹیک یور ٹائم۔ یہاں رہو، سب کے مزاج کو سمجھو دیکھو میری طرف سے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی لیکن تم جو اتنی پیاری، خوب صورت لگ رہی ہو، ایسے میں رات بھر باتیں کرتے ہوئے گزارنا مجھ غریب پر ستم نہیں ہے؟" وہ شرارت سے اس کے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ سونیا نا سمجھی کے عالم میں کہا۔

"وہاٹ ڈو یو مین...... میں اتنی مشکل اردو نہیں سمجھ پاتی۔"

"آہاہاہا...... ارے بابا کچھ نہیں، تم نا سمجھو تو بہتر ہے۔ چھوڑو اپنی بات کرتے ہیں کچھ بتاؤ اپنے بارے میں ہر چھوٹی سی بڑی بات۔" علی نے بات ٹالتے ہوئے کہا، وہ دونوں بہت دیر باتیں کرتے رہے۔ سونیا کو بھی علی سے بات کرنے میں ایک اپنائیت محسوس ہونے لگی تھی۔ یوں ہی باتیں کرتے کرتے وہ کب سو گئے پتا ہی نہ لگا۔ علی بہت سمجھدار لڑکا تھا اور سونیا کے ڈر اور ہچکچاہٹ سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ تبھی اس نے سونیا کو وقت دیا تا کہ وہ بہت کچھ سمجھ سکے اور زندگی کی حقیقتوں سے واقف ہو سکے۔

☆......☆

اس کی شادی کو ایک مہینہ ہونے والا تھا۔ اب تک اس نے علی کو بے انتہا محبت کرنے والا، مخلص اور خوش مزاج پایا تھا۔ وہ ایک مہینے سے صرف آرام کر رہی تھی۔ گھر کے کاموں سے نہ اسے رغبت تھی۔ نہ اسے کبھی کہا گیا۔ پھوپھو ساس نے اور تمام گھر والوں نے

بھی اس کانچ کی گڑیا کو ہاتھوں کا چھالہ بنایا ہوا تھا۔ اتنے دن گزرنے کے بعد آج دادی بوا نے سونیا پر کھیر پکوائی کا حکم صادر کر دیا۔ کھیر پکانا تو دور کی بات اسے تو چمچ چلانا بھی نہیں آتا تھا۔ سب زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ وہ پریشانی کے عالم میں کمرے میں آئی اور فوراً علی کو فون گھما کر اپنی الجھن سے آگاہ کیا۔ وہ اب ہر پریشانی علی کو بتاتی تھی۔ اسے کبھی کبھی علی میں اپنی ماں کا احساس ہوتا جو ہر وقت ہر گھڑی اس کے لیے ایک ٹانگ پر کھڑا رہتا تھا۔

"ارے بابا...... پریشانی کی کیا بات ہے۔ بے فکر رہو ممی تمہاری ہیلپ کریں گی نا، تم کیوں ٹینشن لیتی ہو۔" علی نے آفس میں کام کے دوران پیار سے سمجھایا۔

"نہیں پھپھو امی نے کہا کہ تم خود بناؤ گی۔ میں نہیں بنا سکتی۔ مجھے تو کوئی کام نہیں آتا۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ علی تو مسکرانے لگا اور پیار سے کہا۔

"سونی! کوئی کام بھی ناممکن نہیں۔ اگر حوصلہ ہو تو You can do any thing ابھی نیٹ سے ریسپی نکالو اور بنانے کی کوشش کرو اور مجھے یقین ہے تم بہترین کھیر بنا سکتی ہو۔ I know very well" علی نے اس قدر حوصلہ بڑھایا کہ وہ واقعی اکیلے کچن میں پہنچ گئی۔ سب کے لاکھ منع کرنے پر بھی اس نے خود کھیر پکانے کا بیڑا اٹھایا۔ سب نے بڑا کہا مگر وہ علی کو دکھانے کے لیے کہ وہ واقعی کر سکتی ہے۔ کھیر پکانے لگی۔ اس نے کئی گھنٹوں میں جیسے تیسے کھیر بنائی اور فریج میں رکھ دی۔ ہر کوئی کھیر ٹیسٹ کرنے پر بضد تھا مگر وہ سب سے پہلے علی کو چکھانا چاہتی تھی۔ رات میں ڈنر پر کھیر سرو کی گئی۔ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے اور کھیر کے لیے ایکسائیٹڈ تھے۔ سب نے کھیر لینے کی کوشش کی۔ دی بوا نے سب سے پہلے کھیر نکالی جو کہ بہت مشکل سے نکال پائیں۔ کھیر بے تحاشا گاڑھی اور سخت سی ہو گئی تھی۔ دادی بوا نے نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ دیا۔

"اے ہے...... کیا کر دیا کھیر کو...... موئی ایک دم سوکھ کے پتھریلی ہو گئی۔ نکالی بھی نہیں جا رہی ہم سے تو۔" دادی بوا کے اچانک کہنے پر سب بری طرح ہنس پڑے۔ سب ہنستے ہنستے نکتہ چینی کر رہے تھے۔ سوائے علی کے جس نے دو پیالے بہت رغبت سے کھائے۔ سونیا سے خود کھیر نہ کھائی جا رہی تھی اور اس کا شوہر صرف اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے دو پیالے کھا چکا تھا۔ سب ہنس رہے تھے۔ مذاق میں علی کو چھیڑ رہے تھے اور سونیا صرف علی کی محبت دیکھ رہی تھی جو تعریفیں کر کر کے کھیر کھانے میں مگن تھا۔ کمرے میں آنے کے بعد بھی وہ تعریف کرتے ہوئے بولا۔

"کھیر تو اتنی مزیدار تھی کہ دل کرتا ہے بنانے والے کے ہاتھ چوم لوں۔"

"YOu wanna kiss my hands? ok fine۔" سونیا نے سامنے ہاتھ کر دیے۔ وہ سیریس سمجھی کہ کھیر واقعی اسے بہت پسند آئی ہے۔ علی نے دونوں ہاتھ تھام لیے اور آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"مجھے پتا نہیں تھا کہ تم اتنی آسانی سے ہاتھ آگے کر دو گی۔ ورنہ میں کہیں اور چومنے کو کہتا۔" سونیا نے اب شرارت بھانپتے ہوئے ہاتھ واپس کھینچ لیے۔ علی خوب ہنسنے لگا۔ علی کی نظر اس کے ہاتھ پر پڑی جہاں جلنے کا لال نشان صاف واضح تھا وہ ایکدم چیخ پڑا۔ کھیر پکانے کے دوران وہ ہاتھ جلا بیٹھی تھی۔ علی نے فوراً اس کے ہاتھ پر کریم لگائی۔ نیز وہ سونیا کا اس قدر خیال رکھنے لگا کہ سونیا کو اب سارا دن علی کی یاد ستاتی رہتی۔ رمضان کے مہینے میں اسے روزے رکھنا انتہائی مشکل لگتا تھا۔ علی ہی اس کی ڈھارس باندھتا رہتا۔ صبح اسے سحری میں زبردستی کچھ پلواتا، اس کے

لیے افطاری میں اس کی پسند کی چیزیں لاتا۔ سونیا کو اب ہر قدم پر علی کی مدد درکار ہوتی۔ اس کا دل کرتا کہ وہ علی کے کچھ کام کرے۔ وہ جب کوئی علی کا کام کرتی وہ الٹا ہو جاتا تھا۔ علی پھر بھی اس کے کاموں میں اس کا حوصلہ بڑھاتا اور محبتیں لٹاتا رہتا تھا۔ جب سے شادی ہوئی تھی وہ صوفے پر سوتا تھا جب کہ سونیا بیڈ پر سوتی تھی۔ علی مکمل اس کو موقع دے رہا تھا کہ سونیا خود اپنے ہاتھوں سے اس کے اور اپنے درمیان میں حائل جھجک کو ختم کر دے۔

رمضان کا مہینہ تیزی سے گزر رہا تھا۔ علی نے اسے اور امی کو کراچی کے بہترین مال سے خوب شاپنگ کروائیں۔ وہ اکثر افطار کرنے باہر چلے جاتے تھے۔ غرض کہ سونیا کے لیے یہ زندگی کے بہترین رمضان تھے۔ علی جیسا دوست پا کر وہ بے تحاشا شاد تھی۔ چاند رات سے ایک دن پہلے وہ اسے بہت خوب صورت مہندی لگوا کر لایا۔ اس کے حنائی ہاتھ سب کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ وہ خود علی کی نور نظر تھی۔ علی اس کی خوشی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ چاند رات والی رات اچانک گھر میں طوفان مچ گیا جب فون پر اطلاع ملی کہ اچانک ہوٹل پر فائرنگ کر دی گئی جس میں کافی لوگ جاں بحق ہو گئے۔ علی کے دوست کے بقول علی بھی رات میں اسی ہوٹل میں موجود تھا۔ بھگدڑ اتنی مچی کہ کوئی ایک دوسرے تک رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ اس اطلاع پر گھر میں کہرام مچ گیا۔ ہر کوئی وہاں ہوٹل کی طرف بھاگنے لگا۔ علی کا موبائل بند جا رہا تھا اور کوئی خبر نہیں تھی۔ سونیا تو سن کر دھپ سے بیٹھ گئی۔ علی کو کھونے کا احساس اس قدر سوہانِ روح تھا اسے آج پتا چلا۔ وہ بس روئے جا رہی تھی۔ اشک تھے کہ رواں تھے اتنے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ چاند رات والے دن ایسی آفت اللہ کسی کے گھر نہ لائے۔ اس خبر نے گویا سونیا کو آدھا پاگل کر دیا تھا۔ سارے مرد حضرات پریشانی کے عالم میں جائے وقوعہ پر جا چکے تھے۔ گھر میں خواتین مصلے بچھائے خدا کے سامنے سجدہ ریز تھیں کہ علی کو کچھ نہ ہوا ہو۔ سب رو رہے تھے کہ اچانک علی ہاتھ میں سامان لیے داخل ہوا۔ پھپھو امی، دادی بوا سب اس کو صحیح سلامت دیکھ کر چیختے ہوئے اس کی طرف لپکے۔ وہ حیران پریشان سا کھڑا سب کو روتا دیکھ رہا تھا۔ ساری بات جاننے کے بعد اس نے بتایا کہ وہ ہوٹل سے بہت دیر پہلے ہی نکل گیا تھا۔ وہ سب کو مطمئن کرتا اپنے کمرے میں آیا جہاں وہ جاء نماز پر بیٹھی روتے روتے اپنے شوہر کی سلامتی کی دعاؤں میں معروف تھی۔ علی کی آواز سن کر وہ بھاگ کر علی سے لپٹ گئی۔ علی خود بھی سونیا کے اس ردِ عمل پر حیران تھا۔ علی اس محبت کے انداز پر حیران ہوا جا رہا تھا۔ وہ دونوں بہت دیر ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ تبھی علی نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”تم لڑکیاں بھی عجیب [illegible] ہو۔ ہم زندہ ہیں تو قدر نہیں کرتی ہو، کچھ ہو جائے تو آنسوؤں کی باڑ آ جاتی ہے۔ اللہ اتنا پیار ایسے ملنا تھا تو ہم پہلے ہی اپنے مرنے کی اطلاع بھجوا دیتے تو آپ پہلے ہی محبتیں لٹانے لگتیں ہم پر۔“

”او گاڈ...... علی...... آئی ریئلی لو یو۔ مجھے چھوڑ کے کبھی مت جائیے گا۔ ورنہ میں بھی مر جاؤں گی۔ میں رہ نہیں سکتی آپ کے بغیر۔ یو آر مائی فرسٹ لو، مائی لائف نیور لیو می پلیز۔“ سونیا نے بغور دیکھتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا۔ علی نے ساتھ نبھانے کے لیے ڈھیروں وعدے کر ڈالے۔ سونیا بس اس سے لپٹی ہوئی تھی اور علی بہانے بہانے سے اسے خود سے اور قریب کر رہا تھا۔ چاند رات ان کی زندگی کی سہانی رات بن گئی تھی اور ایک خوب صورت تمام تر خوشیوں سے مزین مستقبل ان کا منتظر تھا۔

......☆......

شیریں تبسم

افسانہ

اس عید پر

"اوہ! اتنی اونچی ہیل والی سینڈل پسند کی ہے تم نے۔ چل سکو گی؟" سحاب نے اس کی پسند کی ہوئی سینڈل کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔ کیوں کہ وہ ہمیشہ کم ہیل والی سینڈل پہنتی تھی۔

"کیوں کیا برائی ہے اس میں؟" میرب نے برا سا منہ بناتے ہوئے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

"ارے پاگل اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ بلکہ اچھا لگے گا۔ انسان کو ویسے بھی تجربے کرتے رہنا چاہیے۔" سحاب نے خوشگوار انداز میں اس کا موڈ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

رخشندہ، سحاب اور میرب تینوں کزنز تھیں مگر تینوں میں بہنوں سے بڑھ کر محبت تھی اور یہ ان کے بچپن کی عادت تھی کہ عید کی شاپنگ کرنے کے بعد ایک دوسرے کو اپنی جیولری، کپڑے، سینڈل، چوڑیاں دکھاتی تھیں اور چاند رات میں شام کو ہی ہاتھوں میں مہندی لگا کر ایک دوسرے کو دکھاتیں کہ کس کی مہندی زیادہ اچھی لگ رہی ہے۔

"رخشی نے کیسی شاپنگ کی ہوگی سحاب؟" میرب کی آنکھوں میں اداسی کے کالے بادل چھا گئے۔

"پتا نہیں۔" سحاب نے سرد آہ بھری۔

"کیا وہ بھی ہمیں ایسے ہی یاد کر رہی ہو گی؟" میرب نے سینڈل کا ڈبہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"کسی کو بغیر دیکھے بنا آواز سنے، ملاقات کیے بنا بھی اس کے ساتھ احساس کے تعلق کو حیات بخشی جا سکتی ہے تو رخشی تو ہماری اپنی ہے۔ وہ بھلا کیوں تمہیں یاد نہیں کر رہی ہو گی۔" سحاب نے میرب کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پھر کہا۔

"کاش امی اور تائی امی ساری باتیں بھلا دیں تو پھر سے سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔"

"مگر سب کچھ پہلے جیسا ہو گا کیسے۔" میرب مایوس ہو چکی تھی۔

"کیا تمہیں لگتا ہے جس طرح سے ہم ہر بات میں رخشی کو یاد کر رہے ہیں کیا وہ تمہیں یاد نہیں کر رہی ہو گی۔ ارے پگلی وہ تو خود یہ چاہ رہی ہو گی کہ پھر سے سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔" سحاب کچھ دیر بعد پھر بولی۔ "میں خود آج کل رخشی سے رابطے میں نہیں ہوں تمہیں تو تائی امی کے غصے کا پتا ہے۔"

میرب، سحاب اور رخشندہ تینوں تایا چچا کی بیٹیاں تھیں اور آپس میں بہت گہری سہیلیاں بھی مگر پچھلے چند ماہ میں ایک ایسا طوفان آیا کہ ان سب کی محبتیں تہس نہس ہو گئیں مریم (میرب کی امی) کو اپنے چھوٹے بھائی کی شادی کے لیے لڑکی کی تلاش تھی اور ان کی نظر رخشندہ کی خالہ یعنی اپنی دیورانی رقیہ کی چھوٹی بہن رمیزہ پر تھی۔ جس کا اظہار مریم نے رقیہ سے بھی کیا تھا اور ویسے بھی یہ تینوں

دیورانی جٹھانی کم اور دوستیں زیادہ لگتی تھیں۔ ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرنا، صلاح مشورہ کرنا ان کی خوشگوار زندگی کا حصہ تھا۔ باقی رشتے دار ان کو حسد اور رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ رقیہ دلی طور پر اس نئے رشتے کے لیے تیار تھی مگر بگاڑ تب پیدا ہوا جب مریم کے بھائی نے اس رشتے سے انکار کر دیا۔ رقیہ تو آنکھوں پر سنہرے خواب سجا کر بیٹھ گئی تھی کہ آج رشتہ پکا ہوگا اور کل رشتہ پکا ہوگا۔ اسی لیے اس انکار کو رقیہ نے انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ ملنا جلنا تک ختم کر لیا تھا۔ مگر خون کے رشتے کہاں ختم ہوتے ہیں۔ میرب، رخشندہ اور سحاب کا ایک دوسرے سے جدا رہنا ناممکن تھا۔ سارہ ان دونوں بھابھیوں سے چھوٹی دیورانی تھی مگر سحاب کی طرح وہ بھی ان کو منانے کی کوشش کرتی تو کبھی ان کو۔ دونوں ماں بیٹیاں اس تقسیم پر دل سے دکھی تھیں اور زندگی میں پھر سے وہی رونق واپس لانا چاہ رہی تھیں۔

مریم اپنی غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی رقیہ کے رویے کی وجہ سے بے حد شرمندہ تھیں ان کے روزے نماز بلکہ آدھا رمضان تو اسی شرمندگی اور دکھ کی حالت میں گزر گیا۔

☆......☆

"رخشی! افطاری کی تیاری ہو گئی ہو تو جا کر وضو کر لو اور عصر کی نماز پڑھ لو۔ ورنہ قضا ہو جائے گی۔" رقیہ نے کچن میں جھانکتے ہوئے رخشندہ کو آواز دی۔

"امی! بس دو منٹ، ذرا سے برتن رہ گئے ہیں۔ یہ دھو لوں پھر سارا کام ختم۔" رخشندہ نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

"اچھا امی! ہم کب جائیں گے عید کی شاپنگ کرنے۔" رخشندہ برتن دھونے کے بعد اب سنک دھو رہی تھی۔

"ابھی تو اتنے روزے باقی ہیں ابھی سے کیا شاپنگ شاپنگ کی رٹ لگا رکھی ہے تم نے۔" رقیہ نے بے زاری سے کہا اور کمرے میں جا کر تسبیح پڑھنے لگ گئیں۔ آج کل ان کا موڈ سخت آف رہنے لگا تھا۔

"میں جانتی ہوں امی، یہ آپ کا ڈانٹنا، جھڑکنا یہ سب کچھ اسی جلن کا نتیجہ ہے جس میں آپ خود کو بلاوجہ جلا رہی ہیں۔" رخشندہ بھی کچن سے نکل کر رقیہ کے پیچھے پیچھے چلتی کمرے میں آ چکی تھی۔

"میں تمہارا منہ توڑ دوں گی رخشی جو ایسی فضول بکواس کی تو۔" رقیہ غصے سے کانپ اٹھی۔ "اپنی ماں کا ساتھ دینے کے بجائے تم بھی ان لوگوں کا ساتھ دے رہی ہو۔ سب کچھ جانتے بوجھتے تم اپنی چچی کی سائیڈ لے رہی ہو۔"

"اچھا چھوڑیں نا! مجھے مارکیٹ کب لے جائیں گی۔" رخشندہ نے بات کا رخ موڑنا چاہا مگر سامنے سے اسے کوئی جواب نہ ملا کیوں کہ رقیہ اب مسلسل تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں اور اللہ کے ذکر میں مشغول تھیں۔ کیوں کہ اللہ نے دلوں کا سکون اپنے ذکر میں رکھا ہے۔ رخشندہ جانتی تھی اسے ویسے بھی اس بات کا جواب نہیں ملنے والا۔ کیوں کہ وہ اور میرب، سحاب ان دونوں کی امی اور اس کی امی یہ سب لوگ ہر سال عید کی شاپنگ ایک ساتھ ہی کرتے تھے مگر اس بار اسے لگ رہا تھا عید سونی سونی گزرے گی۔ اس نے اپنا فیس بک اکاؤنٹ بھی ڈی ایکٹی ویٹ کر دیا تھا تاکہ میرب اور سحاب سے سامنا ہی نہ ہو۔ موبائل سے سم بھی نکال دی تھی۔ ماں کی عزت کا پاس تو رکھنا ہی تھا نا۔ وہ بس کسی معجزے کے انتظار میں تھی۔

☆......☆

"جلو جلو میری مہندی دیکھ کر۔" سحاب نے ان دونوں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"جلے میری ساس کی ساس، ہونہہ۔" رخشندہ کہاں چپ رہنے والی تھی۔

"تم دونوں کے ناٹک اگر ختم ہو گئے ہوں تو میں اپنا جوڑا دکھاؤں جو میں عید کے دوسرے دن پہنوں گی جب ہم پھپھو کے گھر جائیں گے سچ میں درزی نے اتنا پیارا سیا ہے تم دونوں دیکھتی ہی رہ جاؤ گی۔" میرب بھی آج ان دونوں کو چھیڑنے کے پورے موڈ میں تھی کیوں کہ کبھی کبھی تو آزادی کے ساتھ ہنسنے بولنے کا موقع ملتا ہے اور وہ موقع چاند رات کا ہو تو بات ہی الگ ہے۔

"ایسے کیا ابھی سے ندیدیوں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر بیٹھ گئی ہو دونوں۔ نظر لگاؤ گی کیا میرے لاکھوں میں ایک جوڑے کو، چلو پہلے آنکھیں بند کرو دونوں۔ پھر دکھاؤں گی سوٹ۔" میرب نے زبردستی دونوں کی آنکھیں بند کروائی تھیں۔

"ارے یہ کیا!" سحاب نے آنکھیں بند کر کے کھولیں اسے دونوں کمرے میں نظر نہیں آئیں اور نہ ہی عید کے لیے خریدی گئی چیزوں میں سے یہاں کوئی چیز موجود تھی۔ نہ ہی اس کے ہاتھوں پر مہندی لگی ہوئی تھی۔ سونے ہاتھ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ اسے گزشتہ چاند رات کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ دل ہی دل میں گھٹ رہی تھی۔

☆......☆

"امی آپ نے اتنا اچانک اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟"

"کیا...... توصیف نے ایسا کہا؟" مریم کے حلق سے مارے خوشی کے الفاظ ہی نہیں نکل پا رہے تھے۔

"آنے دو ذرا توصیف میرے سامنے خوب کان کھینچوں گا اس کے، ایسا ہوتا ہے سرپرائز۔" مریم نے لگے ہاتھوں فون پر ہی شکوہ بھی کر ڈالا۔

"ہاں آنے دیں اب اسے۔ عید مبارک تو اب میں اسے کہوں گی۔" فون بند ہوتے ہی مریم نے میرب کو آوازیں لگانا شروع کر دیں۔

"میرب...... او میرب۔ جلدی سے کل کے لیے کپڑے استری کروا اپنے ابو کو فون کر کے بتا دو مٹھائی لے آئیں۔" میرب کمرے سے تقریباً بھاگتے ہوئے صحن میں آئی اور حیرت سے اپنی امی کا منہ تکنے لگی کہ اچانک ان کو کیا ہو گیا۔

"میرب تم نے اب تک مہندی بھی نہیں لگائی۔ کل عید ہے۔ تمہارے ماموں اور نانا نانی سب کل رقیہ بھابھی کے گھر چلیں گے رمیزہ کے لیے توصیف کا رشتہ لے کر۔ اس نے اس رشتے کے لیے ہاں کہہ دی ہے۔" میرب حیران تھی اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

"امی! مگر ماموں مان کیسے گئے؟"

"امی کا ابھی فون آیا تھا امی بتا رہی تھیں توصیف کا پروموشن ہو گیا ہے اور اس کی سیلری ڈبل سے بھی ڈبل ہو گئی ہے۔ سیلری کم تھی تب ہی وہ ٹال رہا تھا ہم سب کو۔" مریم نے میرب کو ایک ہی سانس میں ساری وجہ بتا دی۔

"ارے تم کہاں جا رہی ہو؟" مریم نے میرب کو واپس دوڑ لگاتے دیکھا تو آواز لگائی۔

"امی! سحاب کو یہ خوش خبری سنا کر ابھی آئی۔" جاتے جاتے میرب نے جواب دیا۔

"یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ بے شک تو ہی بگڑے کام سنوارتا ہے۔ بچھڑے ہوؤں کو ملاتا ہے۔" وہ سجدے کی حالت میں زمین پر جھکی جا رہی تھیں اور دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں کہ کل جا کر روٹھی ہوئی بھابھی کو منانا ہے اور ان کو خوش خبری سنا کر عید کا مزہ دوبالا کرنا ہے۔

......☆......



گیتی آراء

افسانہ

سوری رانگ نمبر

''ٹرن ......ٹرن......ٹرن......!'' وقاص کے آفس جانے کے بعدوہ گھر بیٹھی بور ہورہی تھی کہ اچانک فون کی چیختی گھنٹی کی آواز نے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر زندگی کی رمق دوڑا دی۔

''ہیلو!'' صائمہ کے لہجے میں زمانے بھر کی بیزاری بھر آئی۔

''ہیلو ثمینہ! کیسی ہیں آپ؟'' دوسری طرف سے ایک مردانہ اجنبی آواز گونجی۔

''بس جی اللہ کا کرم ہے۔اور آپ سنائیں آپ کے کیا حال چال ہیں؟'' صائمہ کو یونہی شوخی سوجھی تو وہ ثمینہ بن بیٹھی۔

''اور کیا کر رہی تھیں؟ آج کالج نہیں گئیں؟'' اجنبی کے لہجے میں ثمینہ کے لیے بڑی اپنائیت اور پرانی شناسائی لگ رہی تھی۔

''نہیں! آج طبیعت ذرا ناساز لگ رہی تھی۔سر میں صبح سے کچھ درد سا تھا۔بس اس لیے جانے کا موڈ نہیں ہوا۔'' صائمہ نے یونہی بات بنائی۔

''کوئی ٹیبلٹ لے لیتی شمو!'' وہ پریشان ہو اٹھا۔

''دیکھو شمو! تم اپنا بالکل خیال نہیں رکھتیں، یہ بہت غلط ہے اگر تمہیں کچھ ہو گیا جانو تو میرا کیا ہوگا، تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے لیکن نہیں ...... تمہیں کیا تمہاری بلا سے میں جیوں یا مروں۔ تمہیں میری کون سی پروا ہے۔تم تو میری ہر بات کو ایک کان سے سنتی ہو ایک کان سے نکال دیتی ہو۔تمہارے لیے یہ ایک دیوانے کی بکواس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ تمہیں کیا پتا شمو! میں تمہاری محبت میں کتنی دور نکل آیا ہوں۔ اتنی دور کے جہاں سے واپسی مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔''

''اوہ......اوہ! ڈائیلاگ بڑے زوردار ہیں۔بائی دی وے کس فلم یا ناول کے ہیں کچھ یاد ہے آپ کو؟'' صائمہ اجنبی کے زبردست قسم کے اظہار الفت پر ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

''یہ ڈائیلاگ کس فلم یا ناول کے ہیں یہ مجھے یاد نہیں۔ویسے بائی دی وے کیا میں آپ جناب کا اسم گرامی جان سکتا ہوں۔'' اجنبی نے شرارت بھرے انداز میں سرگوشی کی تو صائمہ نے سٹپٹا کر فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

''او مائی گاڈ۔'' وہ اتنی دیر سے یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ اجنبی کو ثمینہ بن کر بے وقوف بنا رہی ہے جو کہ یقیناً اس کی لور، بیوی یا منگیتر جیسے رشتے میں کوئی شے تھی۔ اجنبی کی باتوں سے تو اس نے فی الحال یہی اندازہ لگایا تھا اور وہ یہی سمجھ سمجھ کر خوش ہوتی رہی کہ اسے اپنی لور ثمینہ ہی سمجھ کر بے وقوف بنا باتیں بنائے جا رہا ہے لیکن بعد میں پتا چلا کہ اجنبی تو نہیں البتہ وہ ضرور اسے بے وقوف سمجھ کر خود بے وقوف بن رہی تھی۔ وہ خاصی دیر تک اجنبی کی باتیں سوچ کر محظوظ ہوتی رہی۔

وقاص کے آفس چلے جانے کے بعد جس اذیت اور بوریت کے عذاب سے گزرتی تھی اور گزر رہی تھی وہ فون کے ایک رانگ نمبر سے منٹوں میں دور ہو گئی تھی۔

☆......☆

وقاص اور صائمہ کی شادی کو سال بھر ہی ہوا تھا کہ وقاص کا تبادلہ آفس کی طرف سے اسلام آباد ہو گیا، یعنی اس کے میکے، سسرال اور شہر کراچی سے کوسوں میل دور، جہاں کوئی وقاص کا شناسا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی عزیز و اقارب، رشتے دار اور پھر ایک اجنبی شہر میں شناسائی پیدا کرنے میں تھوڑا وقت تو لگتا ہی ہے اور پھر وقاص کو اس کا اکیلے کہیں آنا جانا بھی تو پسند نہ تھا۔ اس لیے وہ وقاص کے ہمراہ ہی جان پہچان کے لوگوں میں آتی جاتی۔ وقاص صبح آٹھ بجے آفس کے لیے نکلتے تو رات گیارہ بجے تک لوٹتے اور وہ وقاص کی واپسی تک اس دو سو گز کے لیے چوڑے بنگلے میں کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح اکیلی بھٹکتی منڈلاتی رہتی۔ شادی کو سال بھر سے زیادہ کا عرصہ ہو جانے کے باوجود گھر میں اب تک کوئی ننھا منا مہمان بھی تو نہ آیا تھا کہ جس کے ساتھ اور جس کے کام میں مصروف ہو کر اسے وقت کے گزر جانے کا احساس بھی نہ رہتا اور وقت بڑی آسانی سے گزر جاتا اور بات رہی گھر کے کاموں میں وقت بتانے کی تو اس گھر میں افراد ہی کتنے تھے ٹوٹل دو۔ ایک صائمہ اور دوسرا اس کا شوہر وقاص تو ان دو افراد کا کام ہی کتنا تھا۔ تینوں ٹائم کا کھانا ناشتہ تو وہ وقاص کو منٹوں میں تازہ تازہ تیار کر کے ہی کھلاتی اور رہی گھر کی صفائی ستھرائی جھاڑو پونچھا برتن کپڑے تو وہ ماسی، وقاص کی موجودگی میں ہی سویرے کر کے چلی جاتی اور باقی کام رہ ہی کیا گیا تھا۔ گھر کی ڈسٹنگ، صفائی سیٹنگ تو اس سے بھی وہ گھنٹے دو گھنٹے میں فارغ ہو لیتی اور پھر دوپہر سے لے کر رات دس گیارہ بجے تک وہ مسلسل ٹی وی کے پاس بیٹھے اور کتابیں بھی پڑھتے پڑھتے بور ہو جاتی اور پھر اس میں نہ تو اتنا دم تھا نہ اسٹمینا کہ وہ رات کے گیارہ بجے تک مطالعے یا ٹی وی دیکھنے میں وقت کاٹ لے۔ وہ مسلسل ٹی وی اور مطالعے سے بور ہو کر دوبارہ ہی بھلی سیٹنگ کو دوبارہ سیٹ کرنے بیٹھ جاتی، اچھے بھلے بیڈ روم کی سیٹنگ بدل ڈالتی اور جب اللہ اللہ کر کے وقاص گھر لوٹتے تو وہ صبح سے رات تک قفل پڑی زبان کا تالا توڑ کر کسی مینا اور کوئل کی طرح اس کے سامنے کوکتی چلی جاتی۔

''وقاص! دیکھیں میں نے کمرے کی سیٹنگ چینج کی ہے، کیسی لگ رہی ہے؟ وقاص آج میں نے آپ کی پسند کا گاجر کا حلوہ بنایا ہے آپ کھائیں گے تو طبیعت خوش ہو جائے گی۔ وقاص! آج میں نے آپ کی پسند کے گلاوٹ کے کباب اور روٹی بنائی ہے۔ آپ شوق سے کھاتے ہیں ناں۔ وقاص کل آفس کے لیے میں نے آپ کی چیک والی شرٹ اور کالی جینز پینٹ استری کر دی ہے۔'' وہ وقاص کے آفس سے لوٹتے ہی کوئل کی طرح اس کے آگے کوکتی چلی جاتی۔ سارے دن چپ شاہ کا روزہ جو رکھنا پڑتا تھا۔

☆......☆

''ٹرن......ٹرن......ٹرن......!'' وہ یونہی بے زاری سے ٹی وی چینل بدل رہی تھی کہ فون کی گھنٹی یکدم ہی بج اٹھی۔ تو جیسے اس کے مرجھائے چہرے پر بہار آ گئی۔ اس وحشت زدہ ماحول اور سناٹے میں کہیں سے تو زندگی کے آثار نمودار ہوئے۔

''اللہ کرے وقاص ہوں۔'' وہ فون کی طرف لپکی۔

''ہیلو جی! کیسی ہیں آپ؟'' فون پر ایک اجنبی کی آواز گونجی۔

''جی آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟'' صائمہ اجنبی کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے لہجے میں تھوڑی سختی پیدا کرتے ہوئے بولی۔

''ارے سرکار! آپ سے بات کرنی ہے اور کس سے کرنی ہے۔'' وہ بڑی اپنائیت سے بولا۔

''مجھ سے......ارے آپ کا دماغ تو صحیح ہے آپ ہیں کون؟'' وہ بری طرح تپ گئی۔

''ارے اتنا جلدی بھول گئیں، ابھی کل ہی تو ہماری گھنٹوں بات چیت ہوئی ہے۔''

''اوہو......تو آپ ہیں آپ باز نہیں آئیں گے اپنی حرکتوں سے۔'' صائمہ کوشش کے باوجود لہجے میں سختی پیدا کرنے میں ناکام رہی۔

''اچھا چھوڑیں ان باتوں کو یہ بتائیے کیا کر رہی تھیں۔'' اجنبی اس کی نرم و ملائم ڈانٹ کا کوئی نوٹس نہ لیتے ہوئے بولا۔

''بتائیں ناں کیا کر رہی تھیں۔''

''جھک مار رہی تھی اور کیا کر رہی تھی۔'' صائمہ نے مصنوعی غصے سے اسے جھاڑا۔

''میرا مطلب ہے آج کالج نہیں گئیں؟''

''کالج......؟'' ایک لمحے کو وہ اجنبی کے سوال پر سٹپٹا سی گئی۔

''ہاں! بس ذرا سا سر میں درد تھا۔ اس لیے جانے کا موڈ نہیں ہوا۔''

''نصیب دشمناں! کہیں بخار تو نہیں ہو گیا۔ کوئی ٹیبلٹ کوئی وغیرہ لے لیتیں۔'' وہ اپنائیت سے بولا۔

''کیوں لے لیتی، آپ کون ہوتے ہیں مجھے مشورہ دینے والے۔'' وہ اجنبی کی بے تکلفی پر چڑ سی گئی۔

''ارے صاحب نہیں ہیں تو کیا ہو جائیں گے۔ آپ حکم تو کریں۔ آج ہی سہرا باندھ کر نہ آ گیا تو......''

''بدتمیز۔'' صائمہ نے گھبرا کر فون کریڈل پر رکھ دیا۔

''اوہ مائی گاڈ! وہ تو اجنبی کو ایک شریف سیدھا سادا سا آدمی سمجھی تھی اور وہ گھٹیا انسان کیسی چھچھوری باتیں کرنی شروع ہو گیا۔ اپنے چھچھورے پن پر اتر آیا۔'' صائمہ مارے گھبراہٹ کے اپنی بے قابو ہوتی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسے بھی کیا ضرورت اس سے اتنا فری ہونے کی۔ وہ اتنا فری ہو گی تو دوسرے کو تو موقع ملے گا ناں باتیں بنانے کا۔ لیکن وہ بھی کیا کرتی بیٹھے بیٹھے بور جو ہوتی تھی۔ اس مسلسل چپ وحشت زدہ تنہائی اور سناٹے سے گھبرا کر کوئی تو اسے ہنسنے بولنے والا بندہ چاہیے تھا۔ سو وہ ہی سہی۔ گھر میں اکیلی پڑے پڑے وہ اور کیا کرتی کچھ نہ صحیح یہ رانگ نمبر پر بات ہی سہی۔

صائمہ نے اپنے ملامت کرتے دل کو سمجھایا اور ہانڈی جلنے کی خوشبو پورے گھر میں پھیلتے ہی کچن کی طرف دوڑ گئی۔

☆......☆

''ٹرن......ٹرن......ٹرن......!'' ابھی وہ وقاص کے آفس جانے کے بعد گھر کے تھوڑے بہت کام نمٹا کر کمر سیدھی کرنے بیٹھی تھی کہ فون کی گھنٹی یکدم ہی بج اٹھی۔

''ہیلو! جی فرمایئے۔'' وہ ریسیور کان میں لگاتے ہوئے نرم لہجے میں گویا ہوئی۔

''کیسی ہیں آپ؟ ناراض ہیں؟'' دوسری طرف سے اجنبی کی آواز ابھری۔

''آپ باز نہیں آئیں گے۔ پھر نازل ہو گئے آپ؟'' وہ مصنوعی غصے سے دہاڑی۔

''کیوں فون کیا ہے آپ نے؟ مجھے آپ سے بات نہیں کرنی میں بند کر رہی ہوں۔''

''ارے خدا کے لیے ایسا مت کیجیے گا میں صرف پانچ منٹ لوں گا آپ کے۔ اس کے بعد بے شک آپ بند کر دیجیے گا۔'' وہ منت سماجت پر اتر آیا۔

''جی بکیے کیا بکنا چاہ رہے ہیں آپ۔'' اسے اجنبی کی حالت پر رحم آ گیا۔

''کیا کر رہی تھیں۔'' وہ بڑی اپنائیت سے گویا ہوا۔ ''کیا کروں گی بھئی گھر کے کام کاج اور کیا۔'' وہ مصنوعی خفگی بھرے لہجے میں بولی۔ مبادا کہ کہیں وہ اسے ایسی ویسی لڑکی نہ سمجھ کر الٹی سیدھی باتیں بنانا شروع ہو جائے۔

''آج کالج نہیں گئیں؟'' اجنبی کی خوب صورت آواز نے اس کی سوچوں کا تسلسل توڑ دیا۔

''اس ضروری بات کے لیے آپ نے فون کیا ہے۔ میں کالج گئی یا نہیں۔''





"ارے نہیں۔ آپ تو خفا ہو گئیں۔ میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔ ویسے بائے دی وے آپ کا نام کیا ہے؟"

"آپ سے مطلب، آپ اپنے کام سے کام رکھیں، سمجھے۔" وہ یکدم ہی غصے میں آ گئی۔

"چلیں نام نہ سہی اپنی تاریخ پیدائش ہی بتا دیں۔" اجنبی کے لہجے میں شوخی کا عنصر نمایاں تھا۔

"کیوں بھئی کیوں بتا دوں آپ کو اپنی تاریخ پیدائش آپ سے مطلب۔"

"ارے آپ غلط سمجھ رہی ہیں خدانخواستہ میرا کوئی اور ایسا ویسا مطلب نہیں تھا۔ میں تو صرف آپ کا نام اور تاریخ پیدائش معلوم کر کے آپ کے بارے میں آپ کے مستقبل کے بارے میں کچھ باتیں کچھ ستاروں سے متعلق کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔" اجنبی نے صائمہ کو گرم ہوتا دیکھ کر خواتین کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس ملک کی 75 فیصد خواتین اپنے بارے میں اپنے ستاروں کے بارے میں جاننے کے لیے کتنی کریزی ہوتی ہیں۔

"اچھا تو آپ ستاروں کا حال بھی جانتے ہیں؟" صائمہ کے لہجے میں دلچسپی کا عنصر نمایاں تھا۔

"جی بالکل! میں نے بڑے بڑے پامسٹ کو پڑھا ہے۔ ستاروں کے بارے میں بھی یہ ناچیز بہت کچھ جانتا ہے۔"

"اچھا تو پھر میرے بارے میں آپ کچھ بتائیں۔"

"لیکن میرے حضور! آپ پہلے مجھے اپنا نام اور ڈیٹ آف برتھ تو بتائیں۔"

"او سوری! صائمہ، صائمہ وقاص اور ڈیتھ آف برتھ 6 مارچ۔" صائمہ نے ہچکچاتے ہچکچاتے اپنا نام اور تاریخ پیدائش بتا دیا۔

"چار مارچ یعنی کے حوت۔ یہی اسٹار ہے ناں آپ کا؟"

"جی۔" مختصر سا جواب ملا۔

"حوت یعنی کے پرکشش شخصیت کی مالک، ایک ہی ملاقات میں دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا لینے والی، پرکشش آنکھوں اور چہرے کی مالک، فنون لطیفہ کی دلدادہ۔"

"ارے آپ تو میرے اسٹار کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔" وہ اجنبی کو اپنے ستارے کے بارے میں یوں روانی سے بولتا پا کر حیرانی سے بولی۔

"جی اور سنیے آپ کا لکی کلر ارغوانی ہے اور لکی دن جمعرات کا ہے اور لکی نمبر 7 ہے یعنی 7 کا ہندسہ آپ کے لیے خوش بختی کا باعث رہے گا۔ بس اب محترمہ کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے اپنا لکی نمبر، کلر، دن ضرور ذہن میں رکھ لیا کریں۔ یہ آپ کے لیے خوش بختی کا باعث رہے گا۔"

"ارے واہ آپ تو بہت کچھ جانتے ہیں ستاروں کے بارے میں۔" صائمہ کے لہجے میں حیرانگی اور خوشی دونوں نمایاں تھی۔

"ارے صاحب! یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم تو نام سے انسان کی شخصیت کے بارے میں اس کے حال مستقبل اور ماضی کے بارے میں پورا کا پورا حال بتا دیتے ہیں اسے اس کے بارے میں اس کے ماضی حال مستقبل کے بارے میں پورا کا پورا علم فراہم کر دیتے ہیں۔ وہ بھی منٹوں میں زائچہ بنا کر۔" وہ شو مارتے ہوئے بولا۔

"ویسے بائی دی وے اگر آپ بھی اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہیں تو بتا دیجیے گا منٹوں میں آپ کا زائچہ بنا کر آپ کے مستقبل اور ماضی حال کے بارے میں آپ کو آگاہ کر دیں گے۔" وہ صائمہ کی بڑھتی دلچسپی محسوس کرتے ہوئے بولا۔

"تو پھر ٹھیک ہے آپ ابھی میرا زائچہ نکال کر میرے مستقبل کے بارے میں بتایئے۔" وہ دیوانگی

کی حد تک دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔
"جی میرے سرکار وہ تو ٹھیک ہے لیکن پہلے آپ مجھے ایک دفعہ پھر اپنا پورا نام بتائیں گی تو میں زائچہ نکالوں گا ناں۔" اجنبی اس کی حماقت اور جلد بازی پر ہنستے ہوئے بولا۔
"ارے ہاں سوری! میرا نام صائمہ ہے، صائمہ وقاص علی۔" وہ مارے خوشی و جوش کے اپنا پورا نام بتا بیٹھی۔
"صائمہ وقاص علی۔" وہ دھیرے سے اس کا نام دہراتے ہوئے بولا۔
"بس جناب! آپ فکر نہ کریں میں ابھی اور اسی وقت آپ کا زائچہ نکالتا ہوں...... لیکن لیکن اس طرح نہیں اس طرح جلدی جلدی کے چکر میں کہیں زائچہ خراب نہ ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں صائمہ آپ کا زائچہ جو نکالوں ناں تو وہ اطمینان سے بیٹھ کر ایک تفصیلی زائچہ نکالوں۔ بہت دیکھ بھال کر۔"
"جی جی! بالکل مجھے کوئی جلدی نہیں ہے بس زائچہ تفصیل سے اور صحیح ہونا چاہیے۔" صائمہ اجنبی کی بات کی تائید کرتے ہوئے بولی۔
"جی تو پھر میرا خیال ہے یہ زائچہ آج اور کل کے اندر بنانے کے بجائے اگلے ہفتے عید آ رہی ہے کیوں ناں یہ زائچہ آپ کو اگلے ہفتے عید کے تحفے کے طور پر بنا کر بھیجا جائے۔ اس طرح یہ ایک ہفتے کے اندر تفصیلی زائچہ بھی نکل جائے گا اور میری طرف سے عید کا ایک حقیر سا تحفہ بھی ہو جائے گا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"
"جی، جی بالکل ٹھیک ہے۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ ایک تفصیلی زائچہ ہو میرا چاہے وہ ایک ہفتے بعد ہی کیوں نہ بنے اور چلیں یہ بھی اچھا ہے کہ یہ آپ کی طرف سے عید کا تحفہ بھی ہو جائے گا۔"
"جی بالکل! اس میں آپ کا لکی نمبر، لکی پتھر، لکی کلر، لکی جیون ساتھی وغیرہ وغیرہ گویا کہ ایک تفصیلی جائزہ۔ یہ آپ کو عید کا تحفہ عید سے پہلے چاند رات کو مل جائے گا۔"
"اوہ تھینک یو ویری مچ، میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں سمجھ نہیں آ رہا۔" وہ زائچہ نکلوانے کے نام پر بڑی ایکسائیٹڈ ہوئی جا رہی تھی۔
"یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن یہ تو بتائیں کہ یہ زائچہ آپ مجھ تک پہنچائیں گے کیسے؟" صائمہ یکدم ہی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔
"ارے یہ کون سا بڑا مسئلہ ہے جو آپ یوں پریشان ہو رہی ہیں۔ آپ کالج تو جاتی ہیں ناں بس آپ مجھے کالج اور اسٹاپ کا نام بتا دیجیے جہاں سے آپ کالج کی بس لیتی ہیں بس وہیں پہنچ کر یہ زائچہ آپ کے حوالے کر دوں گا۔" وہ جیسے چٹکیوں میں مسئلہ حل کرتے ہوئے بولا۔
"نہیں جی! یہ میرے لیے ناممکن ہے۔" صائمہ اس کی بات سے گھبراتے ہوئے بولی۔
"کیوں بھئی اس میں کیا قباحت ہے آپ کالج تو جاتی ہوں گی پھر میرے خیال میں اس سے بہتر اور محفوظ طریقہ کوئی نہیں ہے۔"
"میں نے کہا ناں محترم! یہ میرے لیے ممکن نہیں تو آپ سمجھا کریں ناں بات کو؟" وہ اجنبی کی تکرار سے ضد سے چڑ سی گئی۔ اب وہ اجنبی کو کیا بتاتی کہ وہ کوئی بیس یا بائیس سالہ کالج گرل نہیں بلکہ 27 سالہ ایک ہاؤس وائف ہے اور دوسرے وہ زائچہ دینے کی آڑ میں اس سے ملنے اور دیکھنے کی خواہش جو دل میں لیے ہوئے ہے وہ ایسے دو دو ٹکے کے لڑکوں کے ایسے چھچھورے ارادوں کو خوب جانتی تھی۔ اس نے کیا اسے ایسی ویسی لڑکی سمجھ رکھا تھا جو اپنے شوہر کو دھوکا دے کر الٹے سیدھے لوگوں سے محبت کی پینگیں بڑھاتی پھرے گی۔ ہونہہ!" صائمہ نے حقارت منہ سکیڑا۔
"ارے اگر یوں وقاص کے چلے جانے کے بعد اس کے اکیلے ہو جانے کا مسئلہ نہ ہوتا اور یہ وحشت ناک تنہائی اور سناٹا وقاص کے آفس جانے کے بعد

اسے کاٹ کھانے کو نہ دوڑتا تو وہ ایسے دو دو ٹکے کے چھچھورے لڑکوں کو وہ سیدھا کرنا خوب جانتی تھی اگر اس وحشت ناک بوریت کا احساس اسے مار نہ ڈالتا تو وہ اس اجنبی کی وہ خبر لیتی کہ بس وہ بھی یاد رکھتا۔ بس اس کا مسئلہ ہی ایسا تھا کہ یہ کوفت اور وحشت ناک ٹائم پاس کرنا ہوتا تھا۔ چاہے وہ اسی طرح سہی۔ سو وہ کر رہی تھی۔
"ارے کہاں کھو گئیں۔" یکدم ہی خاموشی میں اجنبی کی آواز گونجی
"ارے نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ہاں تو کیا سوچا آپ نے زائچے کے بارے میں؟"
"صائمہ ایسا کر لیتے ہیں کہ آپ اگر برا نہ مانیں تو اپنے گھر کا ایڈریس مجھے بتا دیں پھر جس وقت مناسب ہو میرا مطلب ہے جس وقت گھر پر آپ اکیلی ہوں مجھے بتا دیں میں باہر سے ہی آپ کو آپ کا زائچہ آپ کے حوالے کر کے چلا جاؤں گا۔ کیا خیال ہے؟" اجنبی نے ڈرتے ہچکچاتے تجویز پیش کی تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو اٹھی۔
"ارے ہوش میں تو ہیں آپ؟ دماغ تو صحیح ہے کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے میں کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوں جو آپ کو اپنے گھر بلاؤں گی۔ ذرا ہوش میں رہ کر بات کریں آپ سمجھے۔
آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ یہ زائچہ آپ مجھے ڈاک کے ذریعے روانہ کر دیں، میں گھر میں کہہ دوں گی کہ فلاں فلاں رسالے میں آیا تھا کہ اپنا زائچہ نکلوائیں سو میں نے اپنے لیے نکلوا کر منگوایا ہے۔" صائمہ نے اپنی دانست میں تیر مارا۔
"کیسا آئیڈیا ہے؟"
"ہاں آئیڈیا تو برا نہیں ہے۔" وہ مرے ہوئے لہجے میں بولا۔ اس کے ارمانوں پر جو اوس پڑ گئی تھی۔
"تو کل آپ میری عیدی یعنی عید کا تحفہ بھیج رہے ہیں ناں؟" صائمہ کے لہجے میں بھرپور شوق کا عنصر نمایاں تھا۔
"کیوں نہیں میرے سرکار! آپ کوئی فرمائش کریں اور ہم پوری نہ کریں یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ جناب آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" وہ بڑے لاڈ سے گویا ہوا تو صائمہ کو اس کی باتوں کا یہ عامیانہ سا انداز قطعی پسند نہ آیا۔ ایک لمحے کو تو اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے اس انداز پر فون پٹخ دے لیکن پھر زائچہ کا خیال اسے ایسا کرنے سے روک دیتا۔
"اچھا ٹھیک ہے مجھے ذرا گھر کے کام نمٹانے ہیں۔ آپ جناب فون بند کریں۔ خدا حافظ۔" صائمہ نے فون بند کرنے پر ہی اکتفا کیا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔
اپنے کمرے میں لیٹی وہ دیر تک اجنبی کے بارے میں سوچتی رہی۔ ابھی اس سے بات چیت اور ملاقات کو دن ہی کتنے ہوئے تھے صرف دو تین دن یا زیادہ سے زیادہ چار دن اور ان چار دنوں میں وہ اس کے اسٹار اور عید کا تحفہ تک یاد رکھے بیٹھا تھا۔ حالانکہ خود اس نے کبھی وقاص سے عید کے تحفے کی ڈیمانڈ نہیں کی تھی اور وقاص جو اس سے بے انتہا محبت کا دعویٰ کرتے ہیں انہوں نے آج تک کبھی کوئی گفٹ نہیں دیا۔ کبھی اس کی برتھ ڈے کا دن تحفہ یاد نہیں رکھا کبھی اس کے اسٹار کے بارے میں نہ پوچھا نہ جانا۔
وہ یکدم ہی اداس سی ہو گئی۔
"خیر چھوڑو۔" وہ بھی کیا بے کار کی باتیں سوچنے لگی۔ کہاں وہ دو ٹکے کا لوفر، لڑکیوں کو فون پر لائن مارنے والا بدمعاش اور کہاں اس کا بردبار سا شریف النفس شوہر، بھلا وقاص کا اس لوفر اجنبی سے کیا مقابلہ، وہ کتنی احمق اور پاگل ہے جو ایسی عجیب عجیب باتیں سوچنے بیٹھ جاتی ہے۔" وہ اپنی بے ہنگم سوچوں کو وہیں جھٹک کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔
☆......☆
آج صبح سے صائمہ کی نظریں مین گیٹ پر جمی ہوئی

تھیں۔ ہر آنے جانے والے پر اسے پوسٹ مین کا گمان ہوتا لیکن وہ تھا کہ آنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ صبح کا ناشتہ دوپہر کا کھانا رات کا کھانا صفائی ستھرائی گویا کہ وہ گھر کے ہر کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھ گئی تھی لیکن ڈاکیے کو نہ آنا تھا نہ آیا گویا کہ اجنبی نے اسے خوب بے وقوف بنایا۔ دراصل اصل مقصد محترم کا ملاقات کرنا تھا سو وہ اس نے منع کر دیا تھا۔ بس اسی لیے اس لوفر نے فون کا سلسلہ بند کر دیا۔ وہ ایسے دو ٹکے کے لوگوں کو اور ان کی نیت کو خوب جانتی تھی۔" صائمہ نے حقارت سے سوچا۔

"لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ محترم خود خرامہ خرامہ تشریف لا رہے ہوں۔"

"نہیں...... نہیں بھئی کوئی شخص اتنا گھٹیا اور کمینہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کے سختی سے منع کرنے کے باوجود ایسی حرکت کرے۔ نہیں ایسا نہیں کر سکتا۔" دوسرے لمحے اس نے خود ہی اپنی منفی سوچ کی نفی کر دی۔

"لیکن...... لیکن آج تو اس کا فون بھی نہیں آیا، کہیں ایسا تو نہیں...... کہ اس نے سوچا ہو کہ اچانک پہنچ کر سرپرائز دوں۔"

"نہیں بابا نہیں! اللہ نہ کرے اگر ایسا ہوا تو وقاص تو مجھے گھر سے کھڑے کھڑے ہی نکال دیں گے ساتھ میں خود اور دنیا کی نظروں میں خود ہی ذلیل ہو جاؤں گی۔ حالانکہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کسی گندی نیت، ذہنیت کے ساتھ وقاص کے ہوتے ہوئے اس سے بات نہیں کرتی۔ اس کا مقصد تو صرف اور صرف وقت گزاری اور اس وحشت ناک سناٹے سے تھوڑی دیر کے لیے چھٹکارا پانا ہے اور بس اس طرح وہ اس وحشت ناک تنہائی سے تو بچ جاتی ہے اور یہ بور ٹائم وقاص کے بنا نہ کٹنے والے لمحے چٹکیوں میں مزے سے گزر جاتے ہیں۔ بس جسٹ فار انجوائے منٹ، بس اور نہ تو کوئی اس کا مقصد تھا نہ اجنبی سے کوئی لگاؤ۔" صائمہ نے خود کو ضمیر کی عدالت میں کھڑا کرتے ہوئے اپنے حق میں فیصلہ دے دیا۔

وقاص کے آفس سے لوٹنے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی تھا اور اس دوران نہ تو اجنبی کا زائچہ آیا تھا اور نہ ہی فون صائمہ نے آخری بار پتھرائی آنکھوں سے فون کی طرف دیکھا اور پھر مایوس ہو کر ایک شکست خوردہ چال کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ آج پتا نہیں کیا تھا کہ اس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی گھبراہٹ وحشت سی طاری تھی۔ ایک تو زائچہ نہ ملنے کا ملال دوسرے اجنبی کے چیٹر نکلنے اور اپنے بے وقوف بننے کا ملال۔ ان سب باتوں نے مل کر اس کا موڈ آف کر کے رکھ دیا تھا لیکن وہ یہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ وہ چیٹر تھا یہ بھی تو ممکن ہے اسے کوئی حادثہ کوئی مسئلہ درپیش آ گیا ہو جس بنا پر اس کا زائچہ نکالنا یا بھیجنا ناممکن ہو گیا ہو۔ بہرحال حتمی طور پر وہ کیا کہہ سکتی تھی۔ باتوں سے تو وہ کہیں سے بھی چیٹر نہیں لگا تھا۔

"خیر چھوڑو! اس کی بلا سے وہ کچھ بھی ہو بس وہ جو ذرا زائچہ نکلوانے کے نام پر خوش ہو رہی تھی وہ ساری خوشی پل بھر میں خاک میں مل کر رہ گئی اور بس۔" وہ اپنی بے کار کی بے تکی سوچوں کو جھٹک کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

وقاص کے لوٹنے میں صرف دس منٹ رہ گئے تھے اور اس نے اب تک سویٹ ڈش تیار نہیں کی تھی۔ وہ جلدی جلدی کچن میں سویٹ ڈش کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔

"وقاص! آپ جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر کھانے کی ٹیبل پر آ جائیں۔ آج آپ کے لیے ایک زبردست سرپرائز ہے۔" صائمہ ہمیشہ وقاص کو اس کی سالگرہ کے موقع پر کھانے کی ٹیبل کو اس کی من پسند چیزوں اور ڈشوں اور وقاص کے من پسند پکوان بنا سجا کر سرپرائز دیا کرتی تھی۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔" صائمہ نے بڑی چاہ سے سیخ کباب کی پلیٹ وقاص کو دیتے ہوئے وش کیا۔

"او...... تو یہ تھا سرپرائز۔" وقاص نے یونہی اپنی پلیٹ پر جھکے جھکے بے دلی سے کہا اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔

"وقاص! یہ کیا بات ہوئی میں نے اتنی محنت سے آپ کے لیے مزے مزے کے کھانے تیار کیے اور آپ خوش بھی نہیں ہوئے۔ نہ تعریف کی اور نہ ہی انعام دیا۔" وقاص کے اس انداز اور بے زاری پر وہ روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

"انعام! صائمہ بیگم انعام تو میں تمہیں ایسا زبردست دینے والا ہوں کہ تم بھی ساری زندگی یاد رکھو گی۔" وہ کھانا ختم کر کے اٹھتے ہوئے بولا تو صائمہ وقاص کے لہجے کا روکھا پن محسوس ہونے کے باوجود خوشی سے چیخ نکل گئی۔

"ہیں...... کیا سچ کہہ رہے ہیں آپ!"

"ہاں! تمہارا انعام تمہیں کل مل جائے گا۔ میں نے پیپر تیار کرا لیے ہیں وہ کل اوکے ہو کر آ جائیں گے۔"

"پ...... پ...... پیپرز...... کیسے پیپرز......" وقاص کے لہجے کی کڑواہٹ اور پیپر کا لفظ صائمہ کی روح فنا کرنے لگا۔

"وقاص یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیسے پیپرز؟" صائمہ نے خوف سے ہنڈولے میں ہچکولے لیتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا تو جیسے وہ پھٹ پڑا۔

"کیسے پیپرز...... جو شوہر کی غیر موجودگی میں دوسروں سے یاری کرے، فون پر لمبی لمبی باتیں بنائے، دوستی رکھے، انہیں اپنے گھر کا ایڈریس دے کر وہاں آنے کا دعوت نامہ جاری کرے۔ ایسی عورت کو کیا کہنا چاہیے؟ صائمہ بیگم! اگر میں فون پر اجنبی کے بھیس میں تمہیں چیک نہ کرتا تو تم تو مجھے وفادار خلوص کے نام پر یونہی بے وقوف بناتی رہتیں، وفا اور خلوص کا ڈھونگ رچائے مجھے دھوکا دیتی رہتیں۔ ارے ذلیل عورت! تجھ سے اچھی تو وہ بازاری عورتیں ہوتی ہیں جن کے چہرے پر ذلت کی چھاپ دیکھ کر انسان دھوکا تو نہیں کھاتا۔" وقاص غصے سے انگارا ہوتی آنکھوں سے صائمہ کو گھورتے ہوئے زہر اگلتے چلے گئے۔

"پیپرز میں نے تیار کرا لیے ہیں کل تمہیں مل جائیں گے۔" وقاص غصے سے پاؤں پٹختے اپنے اندر کا سارا غبار اس پر اڑاتے وہاں سے نکل گئے۔

اور صائمہ دکھ سے پھٹتا سر تھامے، آنسوؤں میں ڈوبی سوچتی رہ گئی کہ وقاص نے اسے سمجھنے میں کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ وہ تو صرف وقت گزاری کے تحت اس اجنبی سے بات کر لیتی تھی لیکن وقاص تو کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ وقاص کو اب کیا سمجھاتی کیا بتاتی اسے۔

"میرے اللہ! تو تو دلوں کے حال جانتا ہے پھر یہ تو نے مجھے کس جرم کی اتنی بڑی سزا دے ڈالی، میرا تو کوئی قصور بھی نہیں تھا۔" وہ خدا کے حضور بلک بلک کر رو دی۔

"بے قصور صائمہ بیگم! تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے دین، مذہب اور اسلام اور قرآن و سنت میں کس کتاب میں لکھا ہے کہ تم کسی غیر محرم اور اجنبی مردوں سے بنا کسی مطلب کے لہک لہک کر باتیں بناؤ۔ ان سے وقت گزاری کے لیے ہنسی مذاق کرو۔ گھنٹوں بے تکی بے سروپا باتیں کرو، ان کے دل میں فتنہ ڈالو۔ ان کے لیے فتنے کا سبب بنو۔ صرف اس لیے صائمہ بیگم کہ تھوڑی دیر کو تمہارا ٹائم اچھا پاس ہو جائے جب کہ تمہارے مذہب اور دین نے اسے ناپسندیدہ اور حرام قرار دیا ہے۔ تب بھی صائمہ بیگم تم خدا کی خدائی سے لڑو گی، اس کی مقرر کی ہوئی حدوں کو پھلانگنے کی کوشش کرو گی تو منہ کے بل تو گرو گی ناں، چوٹ تو کھاؤ گی ناں پھر اب کس بات کا رونا ہے یہ تمہارے اپنے ہی کیے دانستہ اور نادانستہ گناہوں کی سزا ہے۔ پھر تمہیں

کس بات کا دکھ ہے۔" وہ خود کو ضمیر کے کٹہرے اور عدالت میں گھسیٹتی، ندامت اور پچھتاوے کے آنسوؤں کو آنکھوں میں سجائے اپنی بدنصیبی اور بے وقوفی پر دھاڑیں مار مار کر رو دی۔

"یہ آج کے دن کیا نحوست پھیلائی ہوئی ہے۔ بند کرو یہ رونا دھونا اور ماتم کرنا۔" پتا نہیں کب تک وہ تکیے میں منہ دیے زار و قطار روتی رہی تھی کہ اسے وقت گزر جانے کا احساس بھی نہ ہوا۔ وقاص کب باہر سے لوٹے اسے کچھ خبر نہ ہوئی وہ تو کمرے میں وقاص کی گرجدار کرخت آواز کمرے میں گونجی تو اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا تو وقاص کو اپنے قریب کھڑا انگارہ برساتی نگاہوں سے گھورتا دیکھ کر وہ تن من تک کانپ گئی۔

"یہ لو انعام چاہیے تھا نا تمہیں۔ بڑا مری جا رہی تھیں ناں عید کے تحفے کے لیے۔ یہ لو تمہارے پیپرز تیار ہو کر آگئے ہیں۔" وہ ہاتھ میں تھامے پیپرز کو اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولا اور وہ جو پہلے ہی دکھ سے نڈھال ہوئی جا رہی تھی وقاص کے ہاتھ میں پیپرز دیکھ کر بالکل ٹوٹ سی گئی۔

"وقاص...... وقاص خدا کے لیے ایسا نہ کریں وقاص یہ...... کیا...... کیا کر دیا آپ نے......" وہ تکیے میں منہ چھپا کر دھاڑیں مار مار کر رو دی۔

"چلو بند کرو اب یہ رونا دھونا اور پانی پیو۔" وقاص اس کے قریب پانی کا گلاس تھامے کھڑے تھے۔

"چلو اب نخرے وخرے دکھانا بند کرو اور یہ پانی پیو۔ پہلی اور آخری دفعہ تمہاری اس بے وقوفی اور غلطی کو معاف کر رہا ہوں آئندہ ایسی حرکت کی ناں تو دس جوتے ماروں گا اور گنوں گا ایک احمق لڑکی۔" وقاص نے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ تو جیسے صائمہ کو ایک لمحے کو خود یقین نہ آیا۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے وقاص کی طرف دیکھا جیسے اس کے لہجے اور چہرے پر سچائی کی جھلک ڈھونڈ رہی ہو۔

"ہاں بھئی میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں پہلی اور آخری دفعہ تمہیں معاف کر رہا ہوں آئندہ ایسی حرکت کی ناں تو کھڑے کھڑے نکال دوں گا سمجھیں۔" وقاص نے آنکھوں میں ڈھیروں حیرت اور آنسو لیے صائمہ کی سرخ ہوتی ناک پیار اور شرارت سے مروڑ دی۔ تب وقاص کے لہجے کی مٹھاس اور آنکھوں میں بھری شرارت دیکھ کر صائمہ کو بے یقینی کی دہلیز سے باہر کھینچ لائی۔

"اور...... اور وہ پیپرز؟" صائمہ نے ایک بار پھر بے یقینی کی کیفیت کے ساتھ وقاص کو دیکھا۔

"ارے بھئی وہ تو آپ کا عید کا تحفہ، آپ کا انعام آپ کا مکمل زائچہ جو آپ کو ڈرانے کے لیے اسٹامپ پیپر میں لپیٹ کے دیا تھا۔" وقاص نے سامنے پڑے رول ہوئے پیپرز کو کھول کر زائچہ اس کے سامنے کر دیا۔

"بدتمیز۔" صائمہ نے آنسوؤں کی دھند میں مسکراتے ہوئے وقاص کی شرارت پر ایک گھونسا پیار سے اس کے سینے پر رسید کرنا چاہا تو وقاص نے بڑے پیار سے اسے اپنی مٹھی پر روکتے ہوئے اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا تو وہ بھی اس کے کشادہ سینے میں منہ چھپا کر سسک پڑی۔ بلک بلک کر رو پڑی۔

"ارے بس، بس ایسی بے ہودہ کالز کے لیے شریف لڑکیوں کے لیے ایک چھوٹا سا جملہ ہوتا ہے "سوری رانگ نمبر" اگر آپ بھی یہ استعمال کر لیتیں تو افاقہ ہوتا۔"

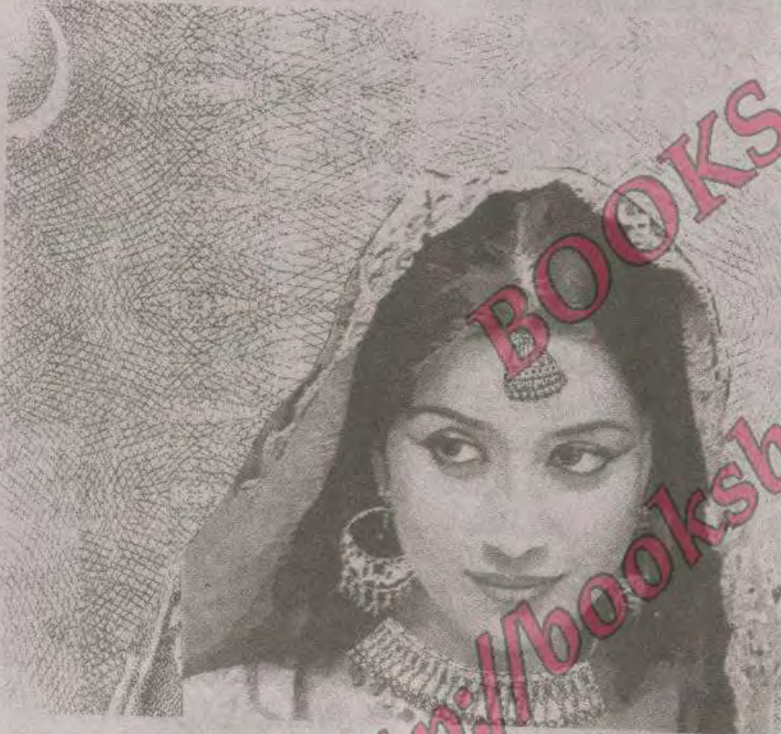
وہ آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھاتے ہوئے اس کے آنسو اپنی چوڑی چکلی ہتھیلی میں جذب کرتے ہوئے شرارت سے بولا تو صائمہ نے ندامت اور خوشی کے جذبات میں بہتے آنسوؤں کو وقاص کی ہتھیلی پر روک دیا۔

......☆......

افسانہ

میں، محبت اور تم

وانیہ جیسے ہی یونیورسٹی کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی سامنے وہی شخص مسکراتا ہوا دکھائی دیا۔ وانیہ کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔ اس کے دل نے اسے جی بھر کر دیکھنے کی خواہش مگر وہ اپنے دل کی اس خواہش کو اگنور کر کے نظریں جھکا گئی۔ اسے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیے دو ماہ ہو گئے تھے اور وہ جب بھی اسے دیکھتی تھی اس کا دل اسی طرح اس کے لیے دھڑکنے لگتا تھا اور وہ بھی تو اسے ہر اس جگہ دکھائی دے جاتا، جہاں وہ جاتی۔ وہ لائبریری جاتی تو وہ پہلے سے وہاں موجود ہوتا، کینٹین جاتی تو وہ وہاں براجمان ہوتا اور کبھی وہ ں کے ڈپارٹمنٹ کے لان میں چلا آتا۔ اسے خاموشی سے دیکھتا رہتا تو کبھی اس کے ڈپارٹمنٹ میں چلا آتا۔ یونیورسٹی کے سبھی اسٹوڈنٹ اسے لائیک کیا کرتے تھے۔ اس کا گروپ یونیورسٹی کا سب سے فیمس گروپ تھا۔ وہ جنرلزم کا اسٹوڈنٹ تھا مگر اردو ڈپارٹمنٹ میں اس کے بے شمار فرینڈ تھے اور وہ ہر روز ان کے ڈپارٹمنٹ میں ضرور آتا تھا۔ وہ چپکے چپکے اسے دیکھا کرتی تھی وہ اسے ہی دیکھ رہا ہوتا تھا۔ وہ اپنی نظریں جھکا جاتی۔ اسے یہ لگتا تھا کہ وہ اردو ڈپارٹمنٹ میں صرف اس کے لیے آتا ہے۔ دھیرے دھیرے وہ اسے اپنا لگنے لگا تھا اس کا دل اس کی محبت میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ایسے ہی شہزادے کے خواب تو دیکھے





تھے۔ ڈیشنگ، اسمارٹ اور جینئس۔ اس کے دل میں اس کے لیے کیا ہے وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی مگر نہ جانے کیوں پھر بھی وہ اس کی محبت کو اپنے دل میں محسوس کرنے لگی تھی۔ یونیورسٹی کے سبھی اسٹوڈنٹ اسے پرنس کہہ کر پکارتے تھے۔ اس یونیورسٹی میں اس کے بہت کم دوست تھے۔ وانیہ کی صرف ایک ہی بیسٹ فرینڈ تھی آئمہ۔ ہاں مگر آئمہ کی فرینڈ شپ بھی پرنس کی طرح پوری یونیورسٹی میں پھیلی ہوئی تھی اور پرنس آئمہ کا بہت اچھا اور بہت کلوز فرینڈ تھا۔ وہ آئمہ سے ملنے جب بھی آتا اس سے بھی مخاطب ہوتا تھا مگر صرف ہیلو ہائے کی حد تک، وہ آئمہ سے اکثر کہتا۔

”یار آئمہ! مجھے کبھی کبھی شک ہوتا ہے کہ کہیں تمہاری فرینڈ وانیہ گونگی تو نہیں، یہ تم سے بات کرتی ہے یا پھر تم دونوں کی فرینڈ شپ صرف اشاروں سے بات کر کے قائم ہے۔“ اور آئمہ، پرنس کی بات سن کر قہقہہ لگا دیتی اور وانیہ کو دیکھتے ہوئے کہتی۔

”میری فرینڈ ہرگز گونگی نہیں، بس تھوڑی شرمیلی ہے۔ یہ بہت پیاری گفتگو کرتی ہے مگر کم بولتی ہے، اس پوری یونیورسٹی میں صرف میں ہی ہوں جسے وانیہ کی فرینڈ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔“ آئمہ پرنس کو مسکراتے ہوئے بتاتی تو وہ بھی مسکرا دیتا۔ وہ مسلسل پرنس کو سوچتے ہوئے اپنے ڈپارٹمنٹ میں داخل ہوئی اسے دیکھتے ہی آئمہ چلائی۔

”وانی! اتنی دیر کیوں لگا دی آج تو نے۔ مجھے تو لگا تھا کہ آج میری وانی نے بھی یونیورسٹی سے آف کر ہی لیا، جانتی ہو سبھی اسٹوڈنٹ پوچھ رہے تھے تمہارے بارے میں اور پوچھنے سے زیادہ انہیں تجسس ہو رہا تھا کہ وانی آج نہیں آنے والی، بھئی تم کبھی یونیورسٹی سے چھٹی جو نہیں کرتیں میری پڑھاکو فرینڈ۔“ آئمہ نے وانیہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو وانیہ اس کی بات سن کر مسکرا دی اور بولی۔

”کیا تمہیں سچ میں لگ رہا تھا کہ آج میں نہیں آنے والی۔“

”ہاں یار مجھے لگا کہیں تمہاری طبیعت خراب نہ ہو۔ ویسے تھینک گاڈ! تم آ گئیں یہ دیکھو آج کے نیوز پیپر میں کیا چھپا ہے۔“

”ایسا کیا ہے اس میں۔“ وانیہ نے بیٹھتے ہوئے نیوز پیپر پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”یار! اس نیوز پیپر کی حالت پر مت جاؤ۔ ہمارے ڈپارٹمنٹ کے اتنے اسٹوڈنٹ اور صرف دو نیوز پیپر آئے، بس چھینا جھپٹی میں یہ حال ہو گیا۔“ آئمہ نے وانیہ کو تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

آئمہ کی بات سن کر وانیہ مسکرا دی اور کہنے لگی۔

”مجھے سمجھ نہیں آتا نیوز پیپر کے لیے اتنی ایکسائٹڈ کیوں ہو اور یہ سارا ڈپارٹمنٹ بھی اس طرح ری ایکٹ کر رہا ہے۔ اس نیوز پیپر کے لیے جیسے کبھی کوئی نیوز نہ سنی ہو نہ پڑھی ہو۔ جب سے مجھے تو بالکل بھی انٹرسٹ نہیں رہا آج کل نیوز میں جب بھی کسی نیوز پر نظر ڈالو دل جل کر رہ جاتا ہے۔ وہی سسکتی چیختی آہیں، کہیں خودکش حملہ اور کہیں بھوک پیاس سے دم توڑتے بچوں کی کہانی یا پھر کسی شوہر کا بیوی پر تشدد یا خاندانی رسم و رواج کی بھینٹ چڑھ جانے والی معصوم دوشیزہ کی داستان یہی تو ہو رہا ہے آج کل ہمارے ملک میں۔“ وانیہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ وہ اپنے ملکی حالات پر ایسے ہی دکھی ہو جایا کرتی تھی۔

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔“ وہ نہ جانے کب سے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے اچانک پیچھے مڑ کے دیکھا تو وہ اسی سے مخاطب تھا۔

”آپ ٹینشن کیوں لیتی ہیں، ملکی حالات دیکھ

کر بس دعا کریں اور مجھے یقین ہے ہمارے ملک کے حالات بہت جلدی سدھر جائیں گے۔“ وانیہ حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت سے اسے تکے جا رہی تھی۔ وہ اسے کیا کہے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کی زبان کو تو جیسے تالا لگ گیا تھا۔ کتنی حسین گفتگو کرتا ہے وہ شخص وانیہ اسے بتانا چاہتی تھی مگر بتا نہیں پائی۔ اس نے آئمہ کے ہاتھ سے نیوز پیپر لے کر کاغذ کا ایک جہاز بنایا اور ہوا میں اڑا دیا۔ ڈپارٹمنٹ کی سبھی لڑکیاں اس کے اردگرد آ گئی تھیں۔ اس سے مسکرا کر بات کر رہی تھیں اور وہ بھی ان سب سے بہت اچھی طرح بات کر رہا تھا۔ وانیہ اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کیا ہے اس شخص میں کہ سب اس کے گرویدہ ہیں۔ وہ کچھ دیر بعد واپس چلا گیا تھا مگر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جا کر بھی یہیں رہ گیا ہے۔ اس کے دل میں براجمان ہو گیا تھا۔ وہ اس کی دھڑکنوں میں شامل ہو کر اس کے سینے میں دھڑکنے لگا تھا۔

”کہاں کھوئی ہوئی ہو تم؟“ آئمہ نے وانیہ کا کاندھا ہلاتے ہوئے کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ کیا سوچ رہی تھی کہ اپنے دل میں چھپی باتیں وہ کبھی کسی سے شیئر نہیں کرتی تھی اور اسی لیے آج بھی بات چھپا کر مسکرانے لگی تھی۔

”وانیہ! آج تو تمہاری گفتگو نے پرنس کو بھی امپریس کر دیا۔ جانتی ہو کیا کہہ رہا تھا، آئمہ تمہاری فرینڈ بہت اچھا بولتی ہے اور اپنے دلکش انداز گفتگو سے کسی کو بھی مات دے سکتی ہے۔ وانیہ، پرنس کی اس بات سے تو میں بھی متفق ہوں کہ تمہارا انداز گفتگو بہت ساحرانہ ہے۔ تم اچھا بولتی ہو اور پرنس اچھا لکھتا ہے۔ خوب بنے گی جو مل بیٹھیں گے دو دیوانے۔“ آئمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بس بھی کرو میری تعریفیں کرنا بند کرو۔ وہ بھی اتنی خالص اردو میں۔“ وانیہ نے اسی کے انداز میں بولتے ہوئے کہا۔

”ہم ایم اے اردو کر رہے ہیں یہ ہماری پوری یونیورسٹی کو پتا ہے مگر تم تو لگتا ہے کہ لکھنو کے نوابوں سے کچھ زیادہ ہی امپریس ہو، اس لیے اتنے ادب سے مخاطب ہو۔“ وانیہ نے اس کو تنگ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اکثر آئمہ کو تنگ کرتی رہتی تھی آئمہ آج کل اپنی اردو پر خصوصی توجہ دے رہی تھی۔

”وانیہ! تم میرا مذاق اڑا رہی ہو۔ کچھ شرم کرو میں تمہاری فرینڈ ہوں۔“ آئمہ نے وانیہ کے کان کو کھینچتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں میری اتنی مجال کہاں۔“ وانیہ نے یہ کہتے ہوئے اپنے کان کو سہلایا۔

”اچھا تم کہہ رہی تھیں کہ پرنس اتنا اچھا لکھتا ہے تو میں کچھ سمجھ نہیں پائی کیا اچھا لکھتا ہے پرنس۔“ وانیہ نے اس سے پوچھا۔

”ارے اتنی دیر سے اور کیا دکھانا چاہتی تھی میں تم کو، پرنس کا لکھا کالم ہی تو دکھا رہی تھی نیوز پیپر میں۔ جانتی ہو پرنس کتنے کم عرصے میں کتنا زیادہ فیمس ہو گیا ہے وہ کالم نگار ہے۔ نہ جانے کہاں سے آ جاتے ہیں اتنے اچھوتے ٹاپک اس کے مائنڈ میں۔ ہر بار اتنا شاندار لکھتا ہے کہ پڑھنے والا اس کے لفظوں میں کھو جائے۔ بہت حساس دل ہے اس کا شاید اسی لیے اس کے لفظوں میں اتنی گہرائی اتنا دکھ صاف صاف نظر آتا ہے۔“ آئمہ مسلسل پرنس کی تعریف کر رہی تھی اور وہ حیران ہو رہی تھی کہ اسے تو پتا ہی نہیں تھا کہ پرنس کالم نگار ہے اور پتا چلتا بھی کیسے اس نے پرنس کے بارے میں کبھی کسی سے کچھ پوچھا ہی کہاں تھا۔ وہ تو اس کا اصل نام تک نہیں جانتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں کسی کو یہ خبر نہ ہو جائے کہ اس کے دل میں کیا چل رہا ہے اس کے دل میں

پروان چڑھتی محبت کسی کو نظر نہ آ جائے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا حال دل کسی پر عیاں ہو اور وہ بھی اتنی جلدی جب کہ ابھی تو وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ پرنس اس کے لیے کیا فیلنگ رکھتا ہے۔

☆......☆

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں گزرتے جا رہے تھے۔ وانیہ دن بدن پرنس کی محبت میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ پرنس سے آج بھی وہ صرف ہیلو ہائے کی حد تک ہی بات کیا کرتی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس سے اپنے مراسم نہیں بڑھا سکی تھی۔ پرنس نے اس سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا مگر اس کی آنکھوں میں اپنی محبت نظر آتی تھی۔ اسے یقین تھا ایک دن پرنس اپنے دل کی بات زبان پر ضرور لائے گا اور وہ اس دن کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی مگر کبھی کبھی وہ پریشان بھی ہو جاتی تھی کہ اگر پرنس نے اسے کبھی محبت کی نظر سے دیکھا ہی نہ ہو اور کبھی اس سے محبت کی ہی نہ ہوئی تو کیا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا یقین جھوٹا نکلے اس کا وہم ہو کہ پرنس اس سے محبت کرتا ہے۔ تو کیا ہوگا کیسے رہ پائے گی وہ پرنس کے بنا وہ جب سے یونیورسٹی سے لوٹی تھی مسلسل پرنس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

تبھی بتول بیگم اس کی (اماں) اندر داخل ہوئیں۔

''وانیہ بیٹا! کیا بات ہے جب سے یونیورسٹی سے آئی ہو کمرے میں گھسی بیٹھی ہو، کھانا بھی نہیں کھایا تم نے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟''

''ہاں اماں! میں ٹھیک ہوں اور کھانا اس لیے نہیں کھایا کہ میں نے کینٹین میں آج آئمہ کے ساتھ کھا لیا تھا۔ جانتی ہیں اماں وہاں کینٹین کے رشید چاچا کے ہاتھ کی بنی بریانی کتنی ٹیسٹی ہوتی ہے۔ بس اس لیے کچھ زیادہ ہی کھا لی تو اب بھوک نہیں۔ ہاں رات کو کھا لوں گی۔ ویسے کیا بنا رہی ہیں رات کے کھانے میں؟''

''بیٹا سوچ رہی ہوں کہ کچھ اچھا بنا لوں آج تمہارے ابا کے شاگرد کے لیے کھانا بھجوانا ہے۔'' بتول بیگم نے جواب دیا۔

''کیوں بابا ابھی تک گھر نہیں آئے اور یہ ابا کا کوئی خاص شاگرد ہے کیا؟'' وانیہ نے سوال کیا۔

''ہاں بیٹا! تمہارے بابا اب تھوڑا لیٹ آیا کریں گے۔ انہوں نے صبح بتایا تھا مجھے اور یہاں کا کوئی نیا شاگرد ہے جس کو وہ خصوصی ٹائم دے رہے ہیں۔ وہ بہت کم وقت میں بہت زیادہ سیکھنا چاہتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے بتول بیگم اس کے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

☆......☆

وانیہ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی تھی اور اس کے بہت ضد کرنے پر اس کے بابا نے اجازت تو دے دی تھی مگر وہ وقتاً فوقتاً اسے نصیحتیں کرنا نہیں بھولتے تھے۔ اس کے بابا امام مسجد تھے اور ایک مدرسے میں اسلامی تعلیم دیا کرتے تھے۔ شاید اسی لیے ان کے دل میں خدشہ لاحق رہتا تھا کہ ان کی بیٹی سے کوئی خطا نہ ہو جائے وہ اکثر اسے کہتے تھے۔ ''بیٹا نامحرم لوگوں سے دوستی کی اسلام اجازت نہیں دیتا، بیٹا یاد رکھنا کبھی ایسا قدم مت اٹھانا، جس کی بنا پر ہمیں شرمندہ ہونا پڑے۔''

وہ ہمیشہ فرمانبرداری سے سر جھکا کر کہتی۔ ''بابا آپ فکر مت کریں۔ آپ نے مجھ پر بھروسہ کر کے میری خواہش پوری کی ہے۔ آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔'' اور اس نے اپنے بابا کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔ بس اس سے یہ گستاخی ضرور ہو گئی تھی کہ وہ اپنے دل کو کسی نامحرم کے لیے دھڑکنے سے نہیں روک پائی تھی اور وہ بھی

شاید اس لیے کہ اس کے دل نے اس نامحرم شخص کے لیے دھڑکنے سے پہلے اس سے اجازت لینا ضروری نہیں سمجھی تھی۔ اس اجنبی شخص کو اپنے دل کی سب سے بلند مسند پر براجمان اس نے نہیں کیا تھا۔ یہ تو دل نے خود ہی اس شخص کے لیے نہ جانے کب دروازہ کھول دیا تھا اور وہ اس کے دل میں گھر کر گیا تھا اور وہ دل کی اس من مانی کے سامنے اپنی ایک نہیں چلا پائی تھی اور تب وہ سمجھی تھی کہ اسے ہی محبت کہتے ہیں اور محبت تو اللہ اپنے بندے کے دل میں ڈالتا ہے۔ بندہ کیا کر سکتا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی جب اس کے بابا کو اس کی محبت کے بارے میں علم ہوگا تو ان کا ردعمل کیا ہوگا۔

☆......☆

وانیہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو کر کمرے سے باہر آئی تو بتول بیگم نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بیٹھنے کو کہا۔ وہ اپنی تسبیح میں مشغول تھیں۔ تسبیح کے آخری دانے گرانے کے بعد انہوں نے وانیہ پر پھونک ماری اور پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ چند منٹ بعد جب وہ دعا مکمل کر چکیں تو وانیہ سے مخاطب ہوئیں۔

''وانیہ بیٹا! آج یونیورسٹی سے چھٹی کر لیتی تم...''

''مگر کیوں اماں؟'' وانیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ بیٹا! تمہاری رقیہ خالہ آنا چاہتی تھیں۔'' انہوں نے ایک دور کی رشتے دار خاتون کا نام لیتے ہوئے بتایا۔

''تو اماں! رقیہ خالہ آپ سے ملنے آ رہی ہوں گی نا؟ آپ تو گھر پر ہی ہیں نا پھر میں کیوں چھٹی کروں؟'' وانیہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ارے بیٹا! میری بات تو سن لو پوری۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پھر سے بٹھایا۔

''وہ دراصل بہت دن سے آنا چاہ رہی تھیں مگر میں ہی ٹال رہی تھی، وہ اپنے بیٹے کے لیے تمہارا ہاتھ مانگ رہی ہیں۔ بس اسی سلسلے میں آنا چاہ رہی ہیں۔ میں سوچ رہی تھی آج بلا لوں اسے ایک بار وہ تمہیں دیکھ لے بہت سال ہو گئے۔ اسے تم سے ملے ہوئے اس وقت تو تم میٹرک میں تھیں۔ جب وہ پچھلی بار آئی تھیں۔ بیٹا وہ چاہتی ہیں کہ ماہ رمضان سے پہلے بات پکی ہو جائے اور پھر عید کے فوراً بعد رخصتی ہو جائے۔ تم جانتی ہو زیادہ شور شرابہ تو تمہارے بابا کو پسند نہیں، اس لیے سب اسلامی طریقے سے ہوگا ہاں اپنی طرف سے تمہاری ہر خوشی کا خیال رکھیں گے۔ زیورات اور کپڑے اور تمام جہیز کا سامان تمہاری پسند سے ہی لیں گے۔'' اس کی اماں نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

''اماں! آپ تو سب کچھ طے کیے بیٹھی ہیں۔ لگتا ہے آپ کے لیے میری خوشی تو ضروری ہی نہیں اور صرف کپڑے زیورات اور جہیز کا سامان پسند کر لینے سے کیا ہوتا ہے جب کہ میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی جس سے آپ میری شادی کرنے کا سوچ رہی ہیں، اماں پلیز آپ رقیہ خالہ کو صاف انکار کر دیں۔ مجھے نہیں کرنی ان کے بیٹے سے شادی۔'' وہ اچانک سے برہم ہو گئی تھی اور اسے خود بھی پتا نہیں چلا تھا کہ وہ اماں کے سامنے اتنا کچھ کیسے بول گئی تھی۔

بتول بیگم حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے مخاطب ہوئیں۔

''دیکھو وانیہ! میرا دل بڑا گھبرا رہا ہے۔ سچ سچ بتاؤ تم کیوں انکار کر رہی ہے اس رشتے سے، سچ بتا وانیہ...''

وانیہ نے اپنی اماں کے چہرے کی طرف دیکھا جو بہت پریشان ہو گئی تھیں۔ تبھی اس نے اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ”میری پیاری اماں! آپ پریشان نہ ہوں کوئی وجہ نہیں ہے اس رشتے سے انکار کی بس مجھے ابھی شادی نہیں کرنی اپنی پڑھائی مکمل کرنی ہے اور آپ جانتی تو ہیں مجھے بڑے بڑے شہر اچھے لگتے ہیں جب کہ رقیہ خالہ تو گاؤں میں رہتی ہیں نا، پلیز اماں آپ انہیں انکار کر دینا اس رشتے سے اور آپ پریشان مت ہوں اب میں یونیورسٹی جا رہی ہوں خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر نکل آئی جب کہ بتول بیگم اس کے جانے کے بعد دل ہی دل میں دعا کرنے لگیں۔

”اے خدا! میرے گھرانے کی عزت کو محفوظ رکھنا۔“ ان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے آ رہے تھے وہ سوچ رہی تھیں کہ کہیں اس نے کوئی روگ تو نہیں پال لیا۔ وانیہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ انہوں نے اس کی پرورش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ وہ کبھی کچھ غلط نہیں کرے گی مگر نہ جانے کیوں ان کا من بہت بے چین ہو رہا تھا۔

☆......☆

وانیہ اردو ڈپارٹمنٹ کے لان میں بیٹھ کر اپنے نوٹس تیار کر رہی تھی۔ تبھی آئمہ اسے ڈھونڈتے ہوئے آ پہنچی۔

”تم یہاں ہو اور میں تمہیں لائبریری میں دیکھنے گئی تھی۔ کبھی تو اپنے دماغ کو ریسٹ کرنے دیا کرو۔ اب تک اتنا تو پڑھ چکی ہو کہ با آسانی یونیورسٹی میں ٹاپ کر لو گی۔ اس بات کا میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔“ آئمہ نے اس کے ہاتھ سے پن لے کر بند کرتے ہوئے کہا۔

وانیہ اس کی بات سن کر مسکرا دی۔ ”کیا ہوا کیوں ڈھونڈ رہی تھیں تم مجھے کوئی خاص وجہ؟“

”ارے ہاں ہے نا بہت خاص وجہ۔ وہ اپنا پرنس ہے نا وہ ڈھونڈ رہا تھا تمہیں اور میں اس کی ہیلپ کر رہی تھی۔ تمہیں ڈھونڈنے میں۔“

”پرنس......! مگر کیوں اسے کیا کام آ پڑا مجھ سے جب کہ تم تو جانتی ہو میرے اور اس کے درمیان کوئی فرینڈ شپ تو ہے نہیں۔“ وانیہ نے جواب دیا۔

”ارے واہ تم میری فرینڈ ہو تو اس ناتے میرے سب فرینڈ تمہارے فرینڈ ہوئے اور خیر آج تو پرنس تمہیں بذات خود ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے تمہیں انوائیٹ کرنا تھا۔ وہ تمہیں یاد ہے نا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ پرنس کالم نگار ہے۔“

”ہاں یاد ہے بالکل۔“

”ہاں تو بس جس نیوز پیپر میں پرنس لکھتا تھا، کل اس نیوز پیپر کی سالانہ تقریب تھی جس میں پرنس کو بھی انوائیٹ کیا گیا تھا اور پرنس کو بیسٹ کالم نگار کے ایوارڈ سے نوازا گیا ہے اور نیوز پیپر کے چیف ایگزیکٹو نے پرنس کے تمام کالموں کو کتابی شکل میں لانے کا اعلان کیا ہے۔ بس اسی خوشی میں پرنس اپنے تمام فرینڈز کو ٹریٹ دے رہا ہے اور تم بھی اس کی فرینڈز لسٹ میں شامل ہو، تبھی تو وہ تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ تمہیں خود انوائیٹ کرنا چاہتا تھا مگر پھر اسے اچانک کسی کام سے جانا پڑا۔ اس لیے اس نے تمہیں انوائیٹ کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپ دی۔ اس نے کہا ہے کہ میں تم سے کہوں تمہیں ہر صورت آنا ہے۔ بولو چلو گی نا کل، ارے یار تمہیں نہیں پتہ کل ہم سب کتنا انجوائے کرنے والے ہیں فائیو اسٹار میں ٹریٹ کی فرمائش کی تھی۔ ہم سب نے پرنس سے اور اس نے قبول کر لی۔“ آئمہ نے اسے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا اور پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔

”اوہ...... ہاں یاد آیا، میرے پاس نیوز پیپر ہے جس میں کل کی تقریب کی تصاویر ہیں یہ دیکھو۔“

آئمہ نے اپنے پرس سے نیوز پیپر نکالا۔ وانیہ نے ہاتھ میں پکڑ کر اسے دیکھا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ مشہور کالم نگار کرشنا ایوارڈ وصول کرتے ہوئے۔ پرنس کی تصویر کے نیچے لکھی لائن اسے پریشان کر رہی تھی۔

”تم آ رہی ہو نا کل؟“ آئمہ نے اسے مخاطب کیا۔

”نہیں میرے بابا مجھے پرمیشن نہیں دیں گے۔“ وہ بمشکل بول پائی تھی۔ اسے ایسے لگ رہا تھا کہ اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔ اس کا وجود بے جان ہو رہا ہے۔ نیوز پیپر اس کے ہاتھ سے نیچے جا گرا تھا۔

”آئمہ! یہ پرنس کا نام کرشنا ہے؟ پرنس مسلمان نہیں ہے کیا یہ نام تو ہندو کمیونٹی میں رکھا جاتا ہے نا؟“ اس نے آئمہ سے سوال کیا۔

”ہاں تو پرنس ہندو مذہب سے تعلق رکھتا ہے تو اس کا نام مسلمانوں والا کیسے ہو سکتا ہے؟“ آئمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”وانیہ! مجھے نہیں لگتا ہمیں اس کے مذہب کو اپنی فرینڈ شپ کے درمیان ایشو بنانا چاہیے۔ اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں نا دوستی کے درمیان کوئی شرط مت رکھو اور دوستی کی بنیاد صرف دوست کی وفاداری ہوتی ہے۔ تو بس پرنس سے ہماری فرینڈ شپ آج تک اسی لیے قائم ہے کیونکہ اس نے کبھی ہمارے مذہب کے بارے میں پوچھا اور نہ ہی اپنے مذہب کو ہم سے ڈسکس کیا۔ بس اسی لیے ہمیں تو یہ یاد بھی نہیں رہتا کہ وہ غیر مسلم ہے۔ اس کی نیچر اتنی اچھی ہے اس میں ایک اچھے انسان کی سبھی خوبیاں ہیں وہ کبھی نہ خود کچھ غلط کرتا ہے اور نہ کسی کو غلط کرتے دیکھ سکتا ہے۔ اتنا تو تم بھی جان ہی گئی ہو گی اتنے عرصے سے اس کو اس یونیورسٹی میں دیکھ رہی ہو۔“ آئمہ بنا اس کے دل کی حالت سمجھے بولتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ آئمہ کی نظریں جونہی اس کے چہرے پر پڑیں وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

”وانی! کیا ہوا میری کسی بات پر مائنڈ کیا؟ پلیز وانی بتاؤ مجھے؟“ آئمہ نے پریشان ہو کر اس سے پوچھا۔

”آئمہ! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ پرنس غیر مسلم ہے۔ کاش آئمہ تم نے مجھے بتا دیا ہوتا۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”وانیہ! مجھے لگا تم بھی ہم سب کی طرح یہ بات جانتی ہو کہ پرنس غیر مسلم ہے۔ میں نے تم سے جان بوجھ کر یہ بات نہیں چھپائی۔ وانی میرا یقین کرو یہ سب انجانے میں ہوا۔ وانیہ میں تمہیں دکھ کیسے دے سکتی ہوں بھلا، تم میرے لیے بہت اہم ہو وانی۔“ آئمہ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں تھیں۔ آئمہ نے وانیہ کو گلے سے لگا لیا۔ وانیہ کے آنسوؤں کا بند ٹوٹ گیا۔

”وانیہ! تمہارے رونے کا کوئی اور ریزن بھی ہے۔ مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے پلیز اگر کوئی بات ہے تو سچ سچ بتاؤ۔“ آئمہ نے وانیہ سے سوال کیا۔

”آئمہ! مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی۔ میرے نادان دل نے وہ خطا کی ہے جس کی کوئی معافی نہیں۔ میرے دل کی نادانی میں کی گئی خطا سے مجھے وہ دکھ ملا ہے جس کا مداوا عمر بھر نہیں ہو پائے گا۔ میں خود سے شرمندہ ہوں کہ میں نے محبت کیوں کی۔ جانتی ہو آئمہ میں پرنس سے محبت کر بیٹھی ہوں اور محبت بھی اتنی کہ شاید اب اس کے بنا جی بھی نہ پاؤں مگر جینا تو ہو گا نا مجھے پتا نہیں

تھا وانیہ کہ پرنس مسلمان نہیں ہے۔ مجھے بہت پچھتاوا ہو رہا ہے آئمہ کہ میں کس طرح اس سے محبت کر بیٹھی۔ میں کیوں سمجھ نہیں پائی کہ وہ مسلم نہیں ہے۔" وانیہ کی بات سن کر آئمہ کو بھی حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

"آئمہ! یہ سب میری غلطی ہے، پرنس نے تو مجھ سے کبھی اپنی کسی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ بس میں ہی غلط فہمی کا شکار ہو گئی۔ میں نے اس سے یکطرفہ محبت کی تھی اور مجھے اس بات کا دکھ نہیں ہے کہ میری محبت یک طرفہ تھی بلکہ دکھ تو اس بات کا ہے کہ میں نے ایک غیر مسلم لڑکے سے اتنی شدت سے محبت کیوں کی!" وہ بری طرح ٹوٹ گئی تھی اور رو رہی تھی۔ آئمہ چاہ کر بھی اس کے دکھ کو کم نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں خدا سے التجا کی تھی کہ وانیہ کے دل کو قرار آ جائے۔

☆......☆

دن بہت تیزی سے گزر رہے تھے مگر وانیہ کی زندگی تو جیسے رک سی گئی تھی۔ اس کا دکھ وقت گزرنے کے ساتھ بھی کم نہیں ہو پایا تھا۔ وہ پرنس کو چاہ کر بھی اپنے دل سے نکال نہیں پائی تھی اس کی اداسی اس کا درد اب اس کے چہرے پر بھی نظر آنے لگا تھا۔ یونیورسٹی جانا اس نے بہت کم کر دیا تھا۔ ایگزامز بھی بہت قریب آ گئے تھے مگر اس کا دل کتابوں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس کی اماں (بتول بیگم) اور اس کے بابا مولوی عبدالرحمٰن، بیٹی کو یوں اداس کھویا کھویا دیکھتے تو کڑھ کے رہ جاتے۔ وہ ہر نماز میں اس کی خوشیوں کی دعا مانگتے مگر اس کی خوشیاں تو پتا نہیں کہاں کھو گئی تھیں۔

بالآخر اس کے بابا نے وانیہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور وانیہ کے کمرے میں چلے آئے۔ وہ بظاہر تو کتابوں میں سر گھسائے بیٹھی تھی مگر صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا دھیان کتابوں میں نہیں تھا۔

"وانیہ بیٹا! کیسی چل رہی ہے تمہاری پڑھائی؟"

"بابا آپ......" اس نے چونک کر اپنے بابا کی طرف دیکھا اسے اپنے بابا کے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ مولوی عبدالرحمٰن اس کے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گئے۔

"وانیہ بیٹا! کیا بات ہے کوئی پریشانی ہے تو ہمیں بتاؤ۔ شاید ہم تمہاری پریشانی کو کم کر سکیں۔ کچھ عرصہ پہلے تمہاری اماں نے تمہارے رشتے کا ذکر کیا تھا مگر تم نے شادی سے انکار کر دیا۔ کیا بات ہے دیکھو میری بیٹی اسلام نے تمہیں اس بات کا مکمل حق دیا ہے کہ تمہاری شادی سے پہلے تم سے تمہاری رائے لی جا سکے۔ اس لیے میں تمہاری پسند کا مکمل خیال رکھوں گا اگر تمہاری رضا مندی اس رشتے میں نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ ہاں اگر تمہیں کوئی اور پسند ہے تو تم اپنے دل کی بات مجھے بلا جھجک بتا سکتی ہو۔ تم جانتی ہو میرے نزدیک اونچ نیچ ذات یا امیری غریبی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ خدا مجھے سنت رسولؐ پر چلاتے ہوئے ثابت قدم رکھے۔ میں تمہاری بات کو اہمیت دوں گا۔ اس لیے تم اپنے دل کی بات بتا دو۔" انہوں نے اپنی بات مکمل کر کے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور اس کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔

وانیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اس کے بابا اس کی خوشیوں کی راہ میں حائل نہیں ہو رہے تھے۔ یہ اس کے لیے بہت خوشی کی بات تھی مگر وہ یہ جانتی تھی کہ سنت رسولؐ کے مطابق وہ ایک غیر مسلم سے کیسے شادی کر سکتی ہے۔ وہ اسلام کے خلاف کیسے جا سکتی ہے؟ اسے اس سب کی نہ اس کا دین اجازت دیتا ہے اور نہ ہی اس کا دل۔ وہ اپنے بابا کو کیا بتاتی کہ اس نے جس سے محبت کی

ہے اس کے اور وانیہ کے درمیان مذہب کی وہ مضبوط دیوار تھی جسے وہ چاہ کر بھی نہیں گرا سکتی تھی۔ پرنس نے اس سے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا اور آج وہ اس کے اظہار محبت نہ کرنے کی وجہ بھی بخوبی سمجھ چکی تھی۔ وہ جان گئی تھی اس کی محبت کو کبھی اظہار کی زبان نصیب نہیں ہو گی۔

وہ ایسے شخص سے محبت کر بیٹھی تھی جو ایسا خواب تھا جس کی تعبیر ناممکن تھی۔ اس کی غلطی کی سزا اس کے اماں بابا کیوں بھگتیں، یہ سوچ کر اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جانتی تھی اس کے فیصلے میں اس کی اپنی کوئی خوشی نہیں مگر اپنے اماں بابا کی خوشی کی خاطر اسے اپنا فیصلہ سنانا ہی تھا۔ مولوی عبدالرحمٰن اس کے جواب کے منتظر تھے۔

"بابا! میرے لیے آپ سے بہتر فیصلہ کون کر سکتا ہے۔ آپ کو میری زندگی کا فیصلہ کرنے کا مکمل حق حاصل ہے۔ میں مکمل رضا مندی اور خوشی سے آپ کو اجازت دیتی ہوں آپ جہاں چاہیں وہاں کر سکتے ہیں میری شادی۔" اپنا جواب سنا کر وانیہ نے اپنے بابا کے چہرے کی طرف دیکھا وہ بہت مطمئن اور سرشار نظر آ رہے تھے۔

☆......☆

وانیہ! آج بہت دنوں کے بعد یونیورسٹی آئی تھی۔ آئمہ اسے دیکھتے ہی چہک اٹھی اور اس کے گلے لگ گئی۔

"وانیہ اتنے دن کی غیر حاضری تم ٹھیک تو تھیں جانتی ہو میں نے تمہیں کتنا مس کیا اور تم نے اپنا موبائل بھی آف کیا ہوا تھا اور تمہارے بنا تو لگتا تھا پوری یونیورسٹی اداس لگ رہی تھی اور پرنس تو کوئی دن نہیں تھا جب اس نے تمہارے بارے میں نا پوچھا ہو۔ بہت بے قرار تھا وہ تمہارے لیے اور میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ تمہاری محبت یکطرفہ نہیں تھی۔" آئمہ کی بات سن کر وانیہ نے نظریں جھکا دیں اور پھر اس سے مخاطب ہوئی۔

"آئمہ تم نے اسے کچھ بتایا تو نہیں سچ سچ بتاؤ تم نے اس سے کوئی بات تو نہیں کی۔"

"نہیں وانیہ! میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی وہ مجھ سے تمہارا کانٹیکٹ نمبر مانگ رہا تھا مگر میں تمہاری پرمیشن کے بنا کیسے دے سکتی تھی۔ ہاں البتہ جب میں نے اس سے پوچھا تو اسے بتانا ہی پڑا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ اس وقت سے جب اس نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم نے وانیہ سے محبت کی تھی تو پھر اپنی محبت سے اسے آگاہ کیوں نہیں کیا تو وہ کہنے لگا کہ وہ وقت بھی بہت جلدی آ جائے گا میرے اظہار محبت نہ کرنے کی ایک بہت بڑی وجہ ہے اور وہ وجہ کیا ہے اس نے میرے پوچھنے پر بھی مجھے نہیں بتائی۔ ہاں بس اتنا کہا کہ بہت جلد تم جان جاؤ گی۔" آئمہ نے اسے تفصیل سے بتایا۔

آئمہ کی بات سن کر وانیہ اس پر برہم ہونے لگی۔ وانیہ کو اچانک ہی غصہ آ گیا تھا۔ "آئمہ! کیا ضرورت تھی اس سے یہ سب پوچھنے کی، میں پرنس کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتی اور نہ ہی مجھے اس سے محبت ہے اور نہ مجھے اس بات سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتا ہے اور ویسے بھی میرے بابا میری رضا مندی سے میرا رشتہ طے کر چکے ہیں اور بہت جلد میری شادی ہے۔" اس نے اپنی زندگی میں بہت کم جھوٹ بولے تھے اور شاید یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ تھا، جو وہ بڑی مشکل سے بول پائی تھی۔

"میری زندگی میں پرنس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے آئمہ اور آئندہ میرے سامنے اس کا نام مت لینا۔" آئمہ اس کی بات سن کر ششدر رہ گئی اور

تبھی ان دونوں کی نظر ڈپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑے پرنس پر پڑی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ آئمہ نے چند لمحوں میں اندازہ لگا لیا تھا کہ پرنس ان کی گفتگو سن چکا ہے۔ آئمہ تیزی سے اٹھ کر پرنس کے قریب آئی، اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ پرنس سے کیا بات کرے، اسے کن لفظوں میں سمجھائے۔ جب کہ وانیہ زمین میں نظریں گاڑھے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبائے بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی پرنس کا کوئی گناہ نہیں مگر خطا تو اس کی بھی نہیں تھی یہ تو مقدر کا کھیل تھا جس سے وہ ہار گئی تھی۔ پرنس کے ہاتھ میں کوئی ڈبہ تھا جواب نیچے گر گیا تھا۔ وانیہ نے ایک نظر زمین پر گری ہوئی مٹھائی پر ڈالی اور تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آئمہ نے وانیہ کو اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔

"وانیہ پلیز! ایک بار صرف میری بات سنو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا...... تم پوچھو گی نہیں کہ میں یہ مٹھائی کیوں لایا ہوں۔" وہ اس کی طرف دیکھے بنا تیزی سے باہر نکل گئی۔

آئمہ پرنس کو تسلی دے رہی تھی۔ "پرنس! تم فکر مت کرو تم یہ مٹھائی کیوں لائے ہو مجھے بتاؤ میں سمجھاؤں گی وانیہ کو۔" اسے پرنس پر بہت ترس آرہا تھا مگر وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

☆......☆

آج وانیہ کا آخری پیپر تھا۔ وانیہ کی نظریں پرنس کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ آج بھی نہیں آیا تھا اور آئمہ کی بہت جلدی میں شادی ہو گئی تھی۔ اس لیے اس نے بھی یونیورسٹی چھوڑ دی تھی۔ اس نے ایگزام بھی نہیں دیے تھے۔ پرنس بھی یونیورسٹی چھوڑ گیا تھا۔ بہت دنوں سے اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ یہ سب باتیں اسے اپنے ڈپارٹمنٹ کے اسٹوڈنٹ سے پتا چلی تھیں۔ وہ آخری بار اس شخص کو دیکھنا چاہتی تھی جو آج بھی اس کے دل میں تھا مگر شاید قدرت کو منظور نہیں تھا اس کی سب سے عزیز دوست بھی اس سے ناراض ہو گئی تھی۔ تبھی تو اس نے دوبارہ بھی اس سے ملنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ مایوس ہو کر گھر واپس لوٹ آئی تھی۔

وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی۔ بتول بیگم اور مولوی عبدالرحمٰن بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"وانیہ بیٹا! تم اپنے امتحانات سے فارغ ہو گئیں، مجھے بہت خوشی ہے مگر اس سے بھی بڑی ایک اور خوش خبری ہے۔" بتول بیگم نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا خوش خبری ہے اماں؟" وانیہ نے ان سے پوچھا۔

"بیٹا! تمہارے بابا نے اپنے ایک شاگرد سے تمہارا رشتہ پکا کر دیا ہے۔ پرسوں تمہارا محمد حسین کے ساتھ نکاح ہے۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے، خوب صورت ہے اور شریف ہے۔ بہت مذہبی ہے۔ اس کے والدین اس کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ باقی فیملی سکھر میں رہائش پذیر ہے۔ وہ ملتان میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تعلیم ملتان جیسے تاریخی شہر سے کمپلیٹ کرے اور دین اسلام کے متعلق اس نے جو کچھ بھی سیکھا وہ تمہارے بابا سے ہی زیادہ سیکھا، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے تمہارے لیے تمہارے بابا نے چنا ہے اور وہ ان کا شاگرد ہے۔" بتول بیگم نے اسے محمد حسین کے بارے میں بتایا۔ مولوی عبدالرحمٰن بھی اٹھ کر اس کے پاس آ گئے اور کہنے لگے۔ "بیٹا وہ تمہیں عید کے فوراً بعد اپنے ساتھ لاہور لے جائے گا۔ اس کی ملازمت لاہور میں ہی ہے ابھی نئی نئی

ملازمت ہے آفس کی طرف سے ہی ایک چھوٹا سا فلیٹ ملا ہے۔ محمد حسین مالدار نہیں ہے اس کی شرافت ہی اس کی دولت ہے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد اپنی محنت اور ایمانداری سے بہت کچھ بنا لے گا۔ ہمیں یقین ہے وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔"

"ٹھیک ہے بابا! آپ خوش تو میں بھی خوش۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے مسکرائی۔

"وانیہ بیٹا! میں چاہتا ہوں محمد حسین کے بارے میں تم سب جان لو یہ تمہارا حق ہے۔ اسی لیے چاہتا ہوں جو نہیں بتا پایا وہ بھی بتا دوں۔"

"بابا آپ نے محمد حسین کے بارے میں سب جان لیا تو مجھے کچھ بھی جاننے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں آپ میرے لیے کبھی کچھ غلط نہیں کر سکتے۔ آپ پریشان نہ ہوں مجھے آپ کا یہ فیصلہ دل و جان سے قبول ہے اور زندگی میں آپ سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔ اس لیے مجھے مزید کچھ نہیں جاننا۔" وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

☆......☆

وانیہ کا نکاح محمد حسین سے ہو گیا تھا اور رخصتی میں بھی بہت کم دن باقی تھے۔ ماہ رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ گھر میں سب ہی خشوع خضوع سے عبادت میں مصروف تھے۔ عید کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ وانیہ کی رخصتی کی تیاریاں بھی چل رہی تھیں۔ وانیہ اپنے ماں بابا کی خوشی کے لیے بے دلی سے ان تیاریوں میں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ اس کی رخصتی عید کے دوسرے دن ہونا قرار پائی تھی۔ افطاری کے بعد بتول بیگم، وانیہ سے مخاطب ہوئیں۔ "وانیہ بیٹا! تمہارے بابا کہہ گئے ہیں نماز مغرب کے بعد تیار رہنا آج تمہاری شادی کا جوڑا خریدنے جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے اماں۔" اس نے خاموشی سے رضامندی ظاہر کی۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے اماں ابا کے ساتھ مارکیٹ آ گئی۔ وہ یہ سب اپنی اماں اور ابا کی خوشی کی خاطر کر رہی تھی۔ ورنہ دل نے تو جیسے خواہشیں کرنا ہی چھوڑ دیں تھیں۔ شادی کا جوڑا اس نے بہت جلدی پسند کر لیا تھا۔ وہ شاپنگ مال سے باہر نکل رہی تھی کہ اس کی نظریں آئمہ پر پڑیں۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آئی۔

"آئمہ! تم یہاں......!"

"ارے وانی! تم" دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران تھیں فوراً ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

"اماں! یہ میری دوست ہے آئمہ۔" وانیہ نے اماں کو بتایا تو انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا خوش رہو بیٹا۔ مولوی عبدالرحمٰن نے بھی آئمہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور پھر کہنے لگے۔ "تم دونوں سہیلیاں باتیں کرو میں اور تمہاری اماں جب تک جیولر سے زیور کا ڈبہ اٹھا لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بابا ہم سامنے آئس کریم پارلر میں ہیں۔ آپ وہیں آ جائیے گا۔" وانیہ نے خوش ہو کر کہا اور آئمہ کے ساتھ آئس کریم پارلر میں داخل ہو گئی۔

"ہاں تو اب بتاؤ تم اتنے دن یونیورسٹی کیوں نہیں آئیں؟" آئمہ نے وانیہ سے سوال کیا۔

"دل نہیں کیا اسی لیے نہیں آئی۔" وانیہ نے مختصر سا جواب دیا۔

"جانتی ہو اس دن پرنس مٹھائی کیوں لایا تھا وہ مسلمان ہو گیا ہے اس لیے۔ مگر تمہیں تو شاید کچھ جاننا ہی نہیں تھا۔ وہ بھی چند دن ہی یونیورسٹی آیا تھا پھر اس نے یونیورسٹی چھوڑ دی وہ بہت ہرٹ ہوا

تھا اس نے تمہاری سب باتیں سن لی تھیں۔ بولو تم نے جھوٹ بولا تھا نا اس دن کہ تمہارا رشتہ پکا ہو گیا ہے اور بہت جلد تمہاری شادی ہے۔" آئمہ اس سے سوال پر سوال کیے جا رہی تھی۔

"ہاں آئمہ اس دن جھوٹ بولا تھا مگر اب سچ میں میرا نکاح ہو گیا ہے اور عید کے دوسرے روز رخصتی ہے۔" وانیہ نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

"تم تو رخصت ہو کر سسرال سدھار جاؤ گی اور وہ نہ جانے کہاں تڑپ رہا ہوگا۔" آئمہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "کاش وانیہ تم نے تھوڑا انتظار کیا ہوتا کاش تم اس سے بدگمان نہ ہوئی ہوتیں۔ وانیہ پرنس کہہ رہا تھا کہ وہ اسلام سے بہت سالوں سے متاثر تھا اور پھر اس نے دین کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی اور اسے احساس ہو گیا کہ اسلام ہی سچا دین ہے وہ کہہ رہا تھا کہ وانیہ سے محبت میں نے اس وقت کی تھی جب میرا مذہب ہندو تھا مگر میں اس سے اپنی محبت کا اظہار اس وقت کروں گا جب میں مسلمان ہو جاؤں گا مگر شاید تم ایک دوسرے کے نصیب میں ہی نہیں تھے۔"

"آئمہ اب پرنس کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا۔" وانیہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

"خدا کرے وہ ٹھیک ہی ہو یہ تو میں بھی نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہے۔" آئمہ نے فکرمندی سے کہا۔ تبھی آئمہ کے شوہر کا فون آ گیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھا وانیہ میں چلتی ہوں، میرے ہسبینڈ پارکنگ ایریا میں میرا ویٹ کر رہے ہیں۔ میں جا رہی ہوں، ہاں مگر تمہاری رخصتی پر ضرور آؤں گی اور اس خوش نصیب انسان سے بھی ملوں گی جو تمہارا ہمسفر بنے گا۔ تم مجھے اپنا ایڈریس بتا دو۔" آئمہ نے اس کا کاندھا ہلایا جو خیالوں میں مگن تھی۔ "کیا سوچ رہی ہو کہ اچھی دوست ہے جو بن بلائے ہی مہمان بن رہی ہے۔"

"ارے نہیں ایسا کیسے سوچ سکتی ہوں میں اور اچھی دوست وہی ہوتی ہے جو بلاوے کا انتظار نہ کرے اور بن بلائے ہی خوشیوں میں شامل ہو جائے۔" وانیہ نے بھیگی آنکھوں سے کہا۔

"تم خوش تو ہو وانی؟" اس کی بات سن کر آئمہ نے سوال کیا۔

"مجھے خود نہیں پتا میں خوش ہوں یا نہیں۔ ہاں اماں ابا بہت خوش ہیں تو بس ان کی خوشی ہی میرے لیے اہم ہے۔" یہ کہہ کر وانیہ، آئمہ کو اپنے گھر کا ایڈریس سمجھانے لگی۔

آئمہ کے جانے کے بعد وہ سوچ رہی تھی۔ "آئمہ اچھا ہوا تم مل گئیں اور مجھے یہ بتایا کہ پرنس مسلمان ہو گیا تھا ورنہ عمر بھر مجھے زندگی میں پچھتاوا نہیں ہوگا کہ میں نے کسی غیر مسلم سے محبت کی تھی۔" تبھی بتول بیگم اور مولوی عبدالرحمٰن آ گئے۔

"وانیہ چلی گئی تمہاری دوست۔" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں اماں چلی گئی وہ۔" یہ کہہ کر ان کے ہمراہ گھر کی طرف چل پڑی مگر اس کا دل بار بار پرنس کی یاد دلا رہا تھا۔ وہ اسے بھول ہی کہاں پائی تھی کہ اب اس کی یادوں میں مزید شدت سے اضافہ ہو گیا تھا۔

☆......☆

آج تیسواں روزہ تھا۔ وہ افطاری کے بعد نماز مغرب ادا کرنے کے لیے جاء نماز پر آ کھڑی ہوئی۔ صدق دل سے نماز ادا کرنے کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ آج بھی وہ اس کی دعا میں شامل تھا۔ اس نے پورے ماہ رمضان اپنی ہر دعا میں پرنس کی سلامتی کی دعا مانگی تھی اور خدا

سے یہ دعا مانگی تھی کہ وہ اسے اتنا مضبوط بنا دے کہ وہ محمد حسین کی شریک حیات کے روپ میں اس کے ساتھ یہ رشتہ مکمل ایمانداری سے نبھائے وہ محمد حسین کے لیے اپنے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ "اے خدا! مجھے میرے ماضی سے نکال کر زندگی میں آگے ایمانداری سے اپنا رشتہ نبھانے کی ہمت عطا کر۔" وہ دعا مانگ کر اٹھی تو اس کی اماں نے اسے اپنے پاس بلایا۔

"وانیہ بیٹا کوئی اچھا سا سوٹ پہن کر ہلکا پھلکا تیار ہو جاؤ۔ محمد حسین آیا ہے تمہارے ابا نے اسے فون کر دیا تھا کہ عید ہمارے ساتھ ہی منائے اور ویسے بھی پرسوں اسے تمہیں لینے آنا ہی تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں ہے تم اسے چائے دے کر آؤ اور پھر اس کے ساتھ بازار چلی جاؤ وہ تمہیں اپنے ساتھ بازار چوڑیاں پہنانے لے جانا چاہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے اماں۔" اس نے رضامندی ظاہر کی اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں موجود تھی۔ مگر چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے فرش پر کیسے پہنچا اسے بھی پتا نہیں چلا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ پرنس سامنے بیٹھا تھا وہ جان گئی تھی کہ وہی محمد حسین ہے خدا نے اس کی محبت اسے لوٹا دی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ نکلے تبھی محمد حسین اس کے قریب آ گیا اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "مجھے بھی یقین نہیں آ رہا۔ جب تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تو میں نے اپنی شادی اپنے روحانی باپ اپنے استاد کی مرضی سے کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جب انہوں نے اپنی بیٹی کا ہاتھ مجھے تھمایا تو میں قدرت کے اس عجیب اتفاق پر حیران ہو گیا کہ جس سے محبت کی اس کا نام بھی وانیہ اور جس سے شادی ہو رہی ہے اس کا نام بھی وانیہ اور پھر دل کو یہ سوچ کر تسلی دی تم نہ سہی تمہاری ہم نام سہی۔ کم از کم یہ نام جب جب پکاروں گا کہیں نہ کہیں دل کے کسی کونے میں تمہیں محسوس کروں گا اور دیکھو خدا کی کرم نوازی خدا نے مجھے وہ نوازا ہے کہ عمر بھر بھی شکر ادا کروں تو بھی کم ہے۔

میں نے پہلی بار ماہ رمضان کے روزے رکھے تھے۔ کہا جاتا ہے ان روزوں کا انعام آخرت میں خدا سے ملاقات کی صورت اور دنیا میں عید کی صورت ملتا ہے۔ ہمارے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ آج مجھے پتا چلا کہ مجھے تو دنیا میں بھی انعام مل گیا ہے۔ میں نے کبھی عید نہیں منائی میں نہیں جانتا تھا عید کی خوشی کیا ہوتی ہے مگر اب جان گیا کہ میری عید سچ میں بہت حسین ہو گئی ہے۔" وانیہ نے حیرت سے پرنس کی طرف دیکھا جو سچ میں محمد حسین بن گیا تھا۔

"صرف آپ کی ہی نہیں میری دعائیں بھی سنی ہیں پروردگار نے آپ کو مجھے سونپ کر میری عید سچ میں حسین کر دی ہے۔"

وہ دونوں خوشی کے آنسو بہا رہے تھے۔

"وانیہ میری فیملی نے میرا مکمل بائیکاٹ کر دیا ہے۔ مجھے بہت دکھ تھا اس بات کا مگر اب تمہیں پا کر میرا سارا دکھ ختم ہو گیا۔" محمد حسین نے اس کے ہاتھ تھام کر کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اب باتیں ہی کرتے رہو گے یا چوڑیاں بھی پہنا کر لاؤ گے۔"

"ہاں چوڑیاں تو پہناؤں گا مگر اپنی پسند کی اور اپنے ہاتھ سے۔" تو وہ مطمئن ہو کر مسکرا دی اور دل ہی دل میں ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔

......☆......

امبرین ناز

افسانہ

ماہم کی عید



''السلام علیکم امی جی!'' ماہم نے کالج سے آ کر سامنے تخت پر بیٹھی شائستہ بیگم کو با آواز بلند سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! میری گڑیا آ گئی۔''

''جی امی جی! میں کپڑے چینج کر کے آتی ہوں۔'' ماہم کہتی ہوئی کمرے میں گئی۔

''بیٹا! آ جاؤ کھانا لگ گیا ہے۔'' شائستہ بیگم نے کھانے کی ٹیبل سجا کر ماہم کو آواز لگائی۔

''کیا بات ہے آج تو کھانا بڑے اہتمام سے بنایا گیا ہے۔'' احمد صاحب نے ڈش پر سے ڈھکن اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں اور اس سے زیادہ اہتمام تو کل سے ہو گا۔'' شائستہ بیگم نے احمد صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کل سے کیوں امی! کیا خاص بات ہے کل۔'' زین نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کل سے رمضان المبارک غم خواری کا مہینہ ہمدردی کا مہینہ ہمارے درمیان ایک بار پھر سے آ رہا ہے بیٹا۔'' شائستہ بیگم نے کہا۔

''واؤ امی جی! کھانا بہت لذیذ بنا ہے۔'' ماہم نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا ماہم! اب آپ بھی اپنی امی کا ہاتھ بٹایا کریں گھر کے کاموں میں۔'' احمد صاحب نے پیار سے کہا۔

''جی ابو جی! میرے پیپرز ختم ہونے ہی والے ہیں اب میں اپنی پیاری امی جی سے مزے مزے کے کھانے بنانا سیکھوں گی۔'' ماہم نے ایک نظر محبت سے شائستہ بیگم کو دیکھا۔

ماہم سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ احمد صاحب اور شائستہ بیگم کی دو ہی اولادیں تھیں۔ ماہم کی پیدائش کے دو سال بعد زین کی آمد ہوئی۔ اس طرح ان کا گھرانہ خوش حال گھرانوں میں شامل ہوا۔

احمد صاحب کا جوتوں کا کاروبار تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی دنیا میں بہت خوش تھے۔

☆......☆

''امی! مجھ سے نہیں رکھا جاتا روزہ، بھوک برداشت نہیں ہو رہی مجھ سے۔'' زین نے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''زین! اب تم بڑے ہو گئے ہو ایسی نادانی کی باتیں نہیں کیا کرو بیٹا۔ میٹرک کر لیا ہے اب تمہیں کالج میں ایڈمیشن لینا ہے اور تم ہو کہ بچوں جیسی باتیں کرتے ہو۔'' شائستہ بیگم نے ناراضگی سے کہا۔

''روزہ ہم مسلمانوں پر فرض ہے بیٹا! انسان روزہ رکھتا ہے بھوکا پیاسا رہتا ہے تو نعمتوں کی قدر آتی ہے۔ دل میں احساس ہوتا ہے کہ جو لوگ سال کے دوران بھوکے رہتے ہیں ان کے اوپر کیا گزرتی ہے۔ تو انسان کے دل میں دوسروں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے ہمدردی کرتا ہے اور یہ ہی انسانیت ہے۔'' شائستہ بیگم نے پیار سے سمجھایا۔

''مگر امی! عامر بھی تو روزہ نہیں رکھتا ان کی مما کچھ نہیں کہتی انہیں۔'' زین نے اپنے کلاس فیلو عامر کے بارے میں نادانی سے کہا۔

''بیٹا! پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ غلط ہے ان کی مما کو عامر کو سمجھانا چاہیے اور دوسری بات بیٹا یہ کہ حضرت علیؓ کا قول ہے: ''تم اپنے اندر اچھائی تلاش کرو، بجائے یہ کہ تم دوسروں میں اچھائی تلاش کرو'' تو بیٹا ہمیں اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ حدیث میں ہے: ''تین آدمیوں سے قیامت کے دن کھانے پینے کا حساب نہیں ہوگا، چاہے کچھ بھی کھائیں بشرطیکہ کھانا حلال ہو، ایک روزہ دار، دوسرا سحری کھانے والا، تیسرا اسلامی سرحد کی حفاظت کرنے والا مجاہد۔'' شائستہ بیگم نے نرمی سے کہا۔

''امی جی! میری ٹیچر نے ہمیں بتایا ہے کہ ''رمضان میں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی نیکیوں کا ثواب دس گنا سے سات سو گنا تک مقرر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں سوائے روزے کے کہ وہ میرے لیے ہے اور اس کا بدلہ میں خود دوں گا۔''

ماہم نے اپنے عید کے کپڑوں پر ڈیزائن کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بیٹا! آپ کی ٹیچر بالکل ٹھیک کہتی ہیں

رمضان کے بعد اللہ نے ہمارے لیے عید کا تحفہ مقرر کر رکھا ہے۔ نئے کپڑے بنانے اچھے اچھے کھانے بنانے مل کر خوشیاں منانے کا حکم ہے۔" شائستہ بیگم نے کہا۔

"السلام علیکم! عید مبارک۔" زین اور احمد صاحب نماز پڑھ کر آئے تو ماہم اور شائستہ بیگم نے سلام کیا۔

"ماشاء اللہ! ہمارا بیٹا کتنا پیارا لگ رہا ہے اس شیروانی میں۔" شائستہ بیگم نے زین کی پستہ کلر کی شیروانی کی طرف اشارہ کیا۔

"اور کیوں نہ لگے ہمارے بیٹے نے رمضان کے پورے روزے رکھے ہیں۔ دیکھو کتنا نور آ گیا ہے چہرے پہ۔" احمد صاحب نے بھی تائید کی۔

"کیا بات ہے آج تو صرف زین کی ہی تعریف ہو رہی ہے۔ مجھے تو نظر انداز کیا جا رہا ہے، دزاز ناٹ فیئر۔" گرے اور ریڈ کنٹراس کے سوٹ میں ملبوس ماہم نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

"ارے بھئی ہماری گڑیا تو ہے ہی اتنی پیاری کہ اسے کسی تعریف کی ضرورت نہیں۔" احمد صاحب نے ماہم کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ابو جی! میں نے شیر خورمہ بنایا ہے اور اپنے زین کی فیورٹ دودھ دلاری بھی آ جائیں ناشتہ کرلیں۔" ماہم نے کہا۔

"چلو بیٹا ضرور۔" احمد صاحب نے خوش دلی سے کہا۔

"امی جی! نے وائٹ کڑھائی کے ساتھ پوریاں بنائی ہیں۔" ماہم نے ٹیبل سجاتے ہوئے کہا۔

"ابو جی! ہماری عیدی۔" زین نے کہا۔

"ہاں بیٹا! آپ کی عیدی تو ضرور ملے گی۔ یہ لو۔" انہوں نے زین اور ماہم کو ہزار ہزار کے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ دونوں نے عیدی وصول کر کے سلام کیا۔

"ہمیشہ خوش رہو۔" احمد صاحب نے دونوں بچوں کو دل سے دعا دی۔

"اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے ہمیں اتنے سعادت مند بچے عطا کیے۔" احمد صاحب نے شائستہ بیگم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

☆......☆

ماہم چوڑیوں کا کنٹراس کر کے ہاتھوں میں پہن رہی تھی کہ اس کے موبائل کی بیپ بجی اس کے چچازاد سمیع کا نام اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو...... السلام علیکم!" ماہم نے ریسیو کر کے کہا۔

"عید مبارک۔"

"تمہیں بھی عید مبارک۔" سمیع نے کہا۔

"گھر کب آ رہے ہو؟" ماہم نے شوخی سے کہا۔

"پرسوں آؤں گا ناں، تمہیں یاد ہو کہ نا یاد ہو پرسوں ہمارا نکاح ہے۔" سمیع نے شریر سے انداز میں اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

ماہم اور سمیع کی نسبت بچپن سے طے تھی۔ سمیع کے دبئی سے واپس آنے پر عید کے تیسرے دن نکاح ہونا قرار پایا تھا۔ خوشی اس کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔

☆......☆

آج عید کا تیسرا دن اور ماہم کا نکاح تھا۔ وہ لائٹ پنک میکسی جو اس کے ہونے والی سسرال سے آئی تھی۔ پنک میک اپ کیے بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں پر کاجل لگائے بہت دلکش لگ رہی تھی۔

"امی جی میں کیسی لگ رہی ہوں؟" وہ شیشے کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"ہماری گڑیا بہت حسین لگ رہی ہے۔" شائستہ بیگم اور احمد صاحب نے ایک ساتھ کہا۔

"بس بیٹی کی ہی تعریف کریں، ذرا داماد کو بھی لفٹ کروالیں چچا جان!" سمیع نے اندر داخل ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"کیوں نہیں ہمارا بیٹا تو تراشا ہوا انمول ہیرا ہے۔ جبھی تو اپنی اکلوتی بیٹی کو تمہارے حوالے کر رہے ہیں۔" احمد صاحب نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"اللہ تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔" شائستہ بیگم ماہم کو محبت سے سمیع کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو دل سے دعا دی۔

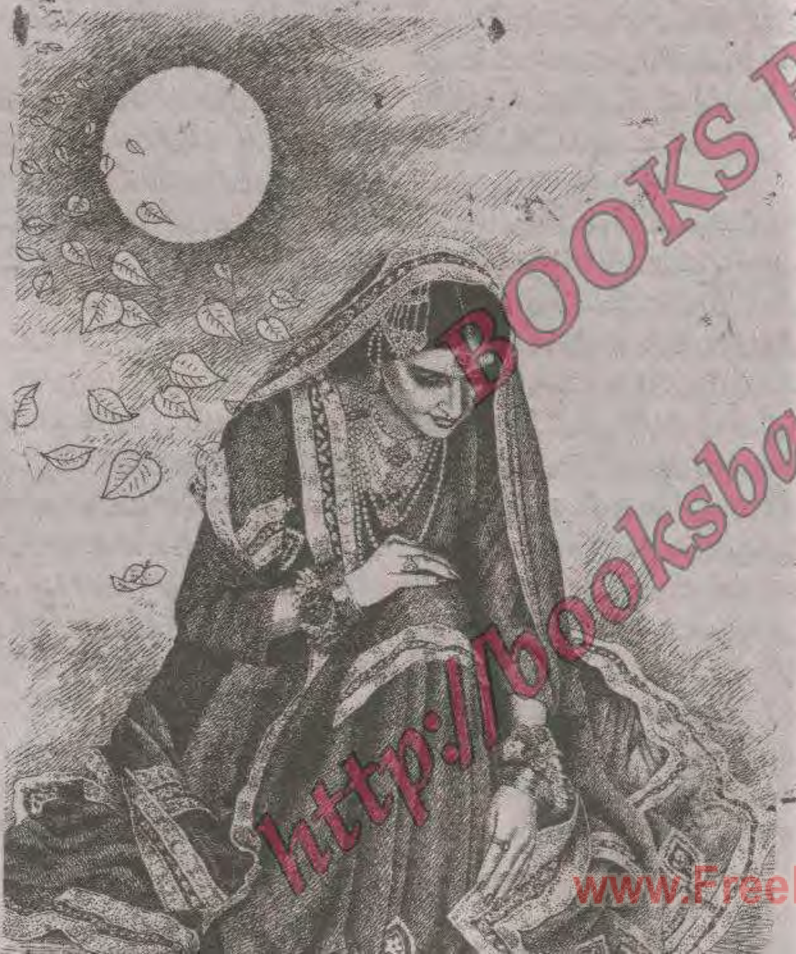
......☆......

درخشاں ضیاء

افسانہ

پہلی عید

شاہ میر کی شادی ہو رہی ہے اسی ماہ، جس نے بھی سنا اسے حیرت ہوئی یہ بات نہ تھی کہ وہ شادی کے قابل نہ تھا۔ شاہ میر ایک پڑھا لکھا ویل سیٹلڈ لڑکا تھا۔ حیرت کی وجہ یہ تھی کہ کل ہی شاہ میر کی والدہ کا چالیسواں تھا اور لوگوں کا خیال تھا کہ شادی آگے بڑھا دی جائے گی لیکن رزاق علی، شاہ میر کے والد نے اس



وقت سب کو حیران کر دیا جب وہ مہمانوں کے جانے کے بعد پھیلاوا سمیٹ رہے تھے کہ شادی اسی تاریخ پر ہوگی جو ان کی مرحومہ بیگم نے طے کی تھی۔ مرحومہ نے اپنی زندگی میں ہی ایک وچولن کے ذریعے شاہ میر کی نسبت طے کر دی تھی۔ شادی کی زبانی تیاریاں وہ شروع کر چکی تھیں پر وقت کا کسی کو علم نہیں ہوتا کہ کون سا رنگ ڈھال لے۔ ایک اچانک آنے والا ہارٹ اٹیک انہیں زندگی کی قید سے آزاد کرا گیا اور وہ اپنے سارے خواب اپنے بچوں اور شوہر کی آنکھوں میں سجا کر ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں موند گئیں۔

شاہ میر شادی کے لیے راضی نہ تھا۔ وہ تھوڑا وقت چاہتا تھا۔ تین بہنوں کا وہ اکلوتا بھائی تھا۔ دو بہنوں کے بعد منتوں مرادوں سے ہوا تھا۔ اماں کے دل کے بے حد قریب تھا مگر رزاق علی کے آگے کسی کی ایک نہ چلی۔ وہ گھر جو کل تک سوگواری میں ڈوبا ہوا تھا وہاں شادی کے شادیانے گونج اٹھے۔ کسی کے جانے سے زندگی رکتی نہیں ہے۔ ہر شخص دنیا میں اپنے حصے کا کام کر کے چلا جاتا ہے اور باقی لوگ کام ختم ہونے تک دنیا میں ہی دل لگاتے ہیں، یہی قدرت کا قانون ہے۔

شاہ میر کی بڑی دو بہنیں نازیہ اور شازیہ شادی شدہ تھیں۔ ایک چھوٹی بہن مازیہ تھی جو کہ کالج اسٹوڈنٹ تھی۔ پہلے تو بڑی دونوں بہنوں کو ابا کا یہ فیصلہ صحیح نہیں لگا مگر جب انہوں نے تصویر کا دوسرا رخ دیکھا تو تسلی ہوئی کہ اچھا ہے شاہ میر کی دلہن گھر آ جائے، گھر کو ایک سمجھدار عورت کی ضرورت تھی گو مازیہ ابھی انٹر میں تھی۔ مگر امورِ خانہ داری میں اچھی طرح طاق نہیں تھی وہ گھر کو اچھی طرح سنبھال نہیں سکتی تھی۔ بڑی دونوں بہنیں بھی کب تک رکتیں وہ بھی بھرے پرے سسرال میں رہتی تھیں۔ رزاق علی اپنی مرحومہ بیگم کوثر رزاق کی خواہش کے ساتھ ساتھ فیحہ کے گھر والوں کا بھی سوچ رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی وجہ سے کسی کا نقصان ہو، شاہ میر بھی بالآخر دل سے راضی ہوگیا۔ قصرِ کوثر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ دو منزلہ خوب صورت عمارت برقی قمقموں سے سجا دیا گیا۔ بھائیوں کی شادی میں بہنیں ویسے ہی دیوانی ہو جاتی ہیں اور پھر شاہ میر تو تھا بھی اکلوتا بھائی۔ بہنوں کی خوشی دیدنی تھی۔ شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ جیسے اماں چاہتی تھیں سب ویسے ہی ہو رہا تھا۔ بری شاندار بنائی گئی ڈھونڈ ڈھانڈ کر اچھے سے اچھا سلائی کڑھائی والے کو منہ مانگی قیمت دے کر کپڑے بنوائے گئے۔ مرحومہ نے اپنی زندگی میں ہی سب بچوں کی شادی کے لیے زیورات بنوا کر رکھے تھے مازیہ کی خواہش پر چند بڑے ڈیزائنر کے سوٹ بھی بری میں رکھے گئے۔ شاہ میر بہنوں کی خوشی میں خوش تھا۔ رزاق علی اپنے گھر میں خوشیوں کو لوٹتے دیکھ کر رب کا شکر بجالائے اور دل کھول کر خرچ کر رہے تھے۔

☆......☆

رب تعالیٰ کی منشا سے بالآخر خیریت سے شادی کا دن بھی آ گیا۔ بانکا سجیلا دولہا گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی دلہن کی ڈولی گھر لے آیا۔ جوڑی اتنی حسین تھی جس نے بھی دیکھا ماشاء اللہ کہا۔ تینوں بہنیں بھائی بھاوج کے واری صدقے جا رہی تھیں۔ نئی دلہن کے آنے سے قصر کوثر میں ایک خوشگوار تبدیلی آئی۔ فیحہ، مازیہ سے چند سال بڑی تھی۔ دونوں کی خوب دوستی ہوگئی۔ شازیہ اور نازیہ بھی چند دن گھر پر رہیں تا کہ فیحہ کو کچھ سمجھنے میں مسئلہ نہ ہو۔ پھر وہ بھی اپنے اپنے گھروں کو سدھاریں ان کے شوہر اچھے تھے جو اتنا لمبا عرصہ انہیں میکے میں رہنے دیا مگر اب وہ ان کا صبر آزمانا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے فیحہ کا گھر انہیں سونپ کر اپنے اپنے گھروں کو سدھاریں۔ رزاق علی کو تو ایسا لگ رہا تھا کہ اللہ نے انہیں ایک اور بیٹی نواز دی ہے۔ شاہ میر سہاگ رات پر فیحہ کے حسن کو دیکھ کر اس کا دیوانہ ہو گیا تھا مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس کی صورت سے زیادہ اس کی سیرت کا اسیر ہو گیا تھا۔ غرض سب اپنی اماں کی پسند کو داد دیتے تھے۔ سب فیحہ سے خوش تھے۔ فیحہ کی بھی حتی الامکان یہ کوشش تھی کہ گھر کے سب لوگ اس سے شادور ہیں۔ اس نے بھی گھر کی ذمہ داری کو احسن طریقے سے سنبھال لیا۔ فیحہ کا ایک ہی بھائی تھا ہمیشہ اسے بہن کی کمی محسوس ہوتی یہاں آ کر یہ کمی بھی پوری ہو گئی تھی۔ یہ نئے رشتے اس کے لیے زنجیر نہیں پھولوں کی مالا ثابت ہوئے۔

☆......☆

شاہ میر ایک آفس میں ایچ آر کی پوسٹ پر فائز تھا۔ رزاق علی کی اپنی ایجنسی تھی۔ صبح ناشتے کے بعد سب سے پہلے شاہ میر اور مازیہ گھر سے نکلتے وہ مازیہ کو کالج ڈراپ کرتا ہوا آفس جاتا۔ ابا 10 بجے تک اپنی ایجنسی کھول لیتے سب کے جاتے ہی وہ گھر کی صفائی ستھرائی میں جت جاتی۔ دوپہر میں وہ کچھ ہلکا پھلکا ہی بناتی یا رات کے سالن کے ساتھ روٹیاں یا چاول بنا لیتی۔ مازیہ کے آنے کے بعد ہی وہ کھانا کھاتے دوپہر میں ابا بھی گھر آ جاتے۔ ابا تو کھانا کھا کر اپنے کمرے میں کچھ دیر آرام کرتے۔ وہ کھانے کے برتن دھو کر مازیہ کو اپنے کمرے میں لے جاتی۔ دونوں کو ناولوں کا شوق تھا۔ بس پھر کہانیوں پر تبصرے ہوتے۔ اپنی اپنی پسندیدہ رائٹرز پر باتیں ہوتیں مازیہ اپنے بچپن کے قصے سناتی۔ اماں کی باتیں بتاتیں۔ جسے فیحہ بہت غور سے سنتی، شام کو شاہ میر آ جاتا تو چائے اکٹھے پی جاتی۔ ایک ساتھ ساتھ بیٹھی رہتیں اور جب رات کا کھانا بنانے کچن میں جاتی شاہ میر بھی تو وہیں ڈیرہ ڈال لیتا یا تو ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی لگا لیتا مگر اس کی نظریں ٹی وی سے زیادہ بیوی کا طواف کرتیں۔ کچن میں کام کرتی فیحہ شرم سے لال ہوئے جاتی۔ زندگی بہت حسین ہو گئی تھی کچھ لے کر کچھ دیا تھا زندگی نے۔ شازیہ اور نازیہ بھی ہفتے پندرہ دن میں ایک دن رکنے ضرور آتیں اور پھر محفل عروج پر ہوتی۔ باہر جانے کا پروگرام بنتا۔ سب مل کر شاہ میر کی جیب ہلکی کرواتیں۔ شاہ میر کی کوشش ہوتی کہ وہ زیادہ وقت فیحہ کے ساتھ گزارے۔

شاہ میر اور ابا جی کے جانے کے بعد وہ کچن میں آ گئی۔ آج کام معمول سے زیادہ تھا۔ آج اسے خشک حلوے کی مٹھائی بنانی تھی۔ کل ہی اسے مازیہ نے بتایا تھا کہ یہ اس گھر کا رواج ہے کہ ہر شب برات پر حلوہ بنتا ہے اور محلے میں باقاعدہ بٹتا ہے۔ ابھی وہ سوجی بھون ہی رہی تھی کہ مازیہ آ گئی۔ اس کے کالج کی چھٹیاں پڑ گئی تھیں۔

"پورے گھر میں سوجی کی خوشبو پھیل گئی میں تو کچن میں کھنچی چلی آئی۔" مازیہ شرارتی انداز میں بولی۔

"اب آ ہی گئی ہو تو ڈرائی فروٹ کاٹو۔"

"اوکے جو حکم بھابھی۔" دونوں نے ہنستے مسکراتے حلوہ بنایا۔ جبھی حلوہ بہت زبردست بنا۔ سب نے بہت تعریف کی۔ اس نے شاہ میر کے ہاتھ دونوں بہنوں کو بھی حلوہ بھجوایا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا ریت رواج کے معاملوں میں اس کے سسرال والے بہت پکے تھے۔

☆......☆

رمضان کی آمد آمد تھی۔ اس نے مازیہ کو ساتھ لگا کر پورے گھر کی صفائی کی۔ تمام کمروں کی چادریں کرٹن تبدیل کیں۔ پورے گھر کی دھلائی ہو گئی تھی۔ سب کام کرتے کرتے شام ہو گئی۔ دونوں تھک کر چور ہو گئی تھیں کہ شاہ میر آ گیا اس کے دوست نے ایک ہوٹل میں دونوں کو ڈنر پر انوائیٹ کیا تھا۔

"ابھی کھانا بنانا ہے مجھے۔" وہ تھوڑا تردد کا شکار تھی۔

"ارے بھابھی! چلی جائیں بھائی کے دوستوں میں سے شادی کے بعد آپ کی یہ پہلی دعوت ہے۔ کھانے کی فکر نہ کریں میں بنا لوں گی۔ آپ کے ساتھ رہ کر تھوڑا بہت سیکھ گئی ہوں۔" مازیہ کے کہنے پر اسے تسلی ہوئی اور جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ شاہ میر

کی فرمائش پر اس نے پرپل کلر کا خوب صورت کڑھائی سے مزین سوٹ پہنا موقع کی مناسبت سے تیار ہوئی۔ شاہ میر کی ستائش بھری نظروں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اچھی لگ رہی ہے۔ ایک خوب صورت شام گزار کر دونوں کافی دیر سے گھر لوٹے۔ واپسی میں شاہ میر نے اسے موتیا کے کنگن بھی پہنائے۔ مازیہ کے لیے اس کی فیورٹ آئس کریم لے کر دونوں گھر لوٹے۔

☆......☆

رمضان کا مقدس مہینہ اپنے آخری عشرے میں داخل ہو گیا تھا۔ ہر مومن سر بسجود ہو کر جہنم سے نجات کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ ابا کے کہنے پر رمضان کے دوسرے عشرے میں ہی قریب کے رشتے داروں کے لیے افطار پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ جبھی ایک شام افطار کے بعد اس کے بھائی بھابھی اس کی عیدی لے کر آگئے۔ وہ تو کھل سی گئی۔ شاہ میر اور باقی سب گھر والے بھی اس کے بھائی بھابھی سے تپاک سے ملے۔

"واؤ زبردست۔" مازیہ کو اس کا سوٹ بہت پسند آیا۔ اس کے دو سوٹ، ایک سوٹ شاہ میر کا اور میچنگ کا پورا سامان تھا۔ بلاشبہ تمام چیزیں بہت اچھی تھیں۔ وہ تو ویسے ہی اپنی بھابھی کی چوائس کی فین تھی۔ پھر بھائی بھابھی کے نہ نہ کرنے کے باوجود انہیں کھانا کھلا کر دم لیا۔ کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔

"امی آپ کا بھیجا ہوا سوٹ بہت حسین ہے لیکن اس عید پر میں شاہ میر کی پسند کا لایا سوٹ ہی پہنوں گی۔" وہ کپڑے الماری میں رکھتے دل ہی دل میں مسکرائی تھی۔

☆......☆

عید کا چاند نظر آگیا تھا۔ مسجدوں اور ٹی وی پر اعلان ہو رہا تھا۔ وہ کچن میں برتن سمیٹ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ شیر خورمہ کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ جبھی مازیہ چلی آئی۔

"کوئی کام کروا دوں بھابھی۔"

"نہیں میں کر لوں گی تم بس ابا کے کپڑے پریس کر لینا۔"

"وہ تو میں نے کل ہی کر لیے تھے۔" مازیہ لاپرواہی سے بولی۔

"بہت بری بات ہے مازی! تم نے اپنا سوٹ دکھایا تک نہیں۔"

"کیا کرتیں بھابھی دیکھ کر اتنی دفعہ تو دیکھا ہے آپ نے۔"

"کیا کل تم پرانا سوٹ پہنو گی؟" علیشے نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بھابھی امی کے جانے کے بعد کل پہلی عید ہے ہم نہیں منائیں گے۔" وہ دکھی لہجے میں بولی۔

"کیا نہیں مناؤ گے۔ عید تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رمضان کا تحفہ ہے تم تحفہ لینے سے انکار کرو گے۔"

"مجھے یہ سب نہیں پتا بھابھی! بس امی کے جانے کے بعد یہ پہلی عید ہے۔ اس لیے کل ہم سب نئے کپڑے نہیں پہنیں گے۔" مازیہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ مگر وہ اس سے یہ نہ پوچھ سکی اماں کے جانے کے بعد ہی اس کی شادی پر انہوں نے سینکڑوں نئے جوڑے بنوائے دھوم دھام کی اور عید جو کہ اللہ کا تحفہ ہے اس سے منہ موڑ رہے ہیں۔ اماں کے بعد پہلی شادی تھی اس پر بھی نئے کپڑے نہ بنواتے۔ ان کے جانے کے بعد سب کچھ پہلی دفعہ پہلے کی طرح ہی کیا، پھر عید ہی کیوں؟ کیوں سوگ تین دن سے زیادہ کا منا رہے ہیں یہ لوگ؟ وہ کیا کیا سوچے بیٹھی تھی کہ زبردست تیاری کرے گی۔ دلہن کی طرح مہندی لگوائے گی مگر یہاں تو سب کچھ ہی الٹ گیا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پڑھے لکھے کو سمجھانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا جاہل کو سمجھانا آسان ہے۔ وہ مازیہ سے، شاہ میر سے کہہ نہ سکی اس کی بھی تو شادی کے بعد "پہلی عید" ہے۔

☆......☆

عید سروے

عید سروے کے سوالات

1۔ عید 2015ء کے لیے کیا خاص پلاننگ کی ہے؟
2۔ عید ان کا خیال لاتی ہے، کن کا؟
3۔ عید کے حوالے سے کوئی یونیک ڈش یا مشروب بتائیں۔
4۔ ان کے گھر سے پہلی عید پر کیا آیا تھا؟
5۔ عید کے دن میزبان بننا زیادہ اچھا لگتا ہے یا مہمان بننا۔
6۔ عید کے دن سب سے زیادہ عیدی کا ریکارڈ کتنا ہے؟
7۔ میکے اور سسرال کی عید میں کیا فرق ہے؟
8۔ عید کے ڈریسز خود ڈیزائن کرتی ہیں یا ٹیلر کے آسرے پر چھوڑ دیتی ہیں۔
9۔ عید پر پہلی وش کس کی لینے کی تمنا ہے؟
10۔ عید کی صبح سہانی لگتی ہے یا شام؟

سیدہ فرزانہ حبیب فرزین......... کراچی

السلام علیکم صالحہ آپی! سب سے پہلے آپ کو اور ردا کی پوری ٹیم کو دل کی عید مبارک۔ عید ہم مسلمانوں کا خاص تہوار ہے۔ ماہ رمضان کے مقدس مہینے کی رحمتوں اور عبادتوں کے صلے میں اللہ پاک خاص عید کا تحفہ عطا کرتا ہے۔ اس دن ہر مسلمان اپنی استطاعت کے مطابق عید کی خوشیوں میں شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا میری بھی عید کے لیے خاص پلاننگ ہے کہ اس بار عید پر میں اپنی کزن اور فرینڈز کو اپنی طرف سے سرپرائز دعوت دوں گی جس میں ساری ڈشز اور ارینجمنٹ ان کے لیے اسپیشل میرے ہاتھ سے بنی ہوگی۔

2۔ بلاشبہ عید خیال لاتی ہے اپنوں کا خاص طور پر وہ جو ہم سے بچھڑ گئے۔ مگر ان کی یادیں ہر خوشی کے موقع پر آنکھیں نم کر دیتی ہیں۔ مجھے میرے مرحوم ماموں اور نانی اماں بہت یاد آتی ہیں اور بہن جو لاہور میں ہے ہمارے ساتھ عید پر شامل نہیں ہوتی۔

3۔ عید کے حوالے سے اسپیشل یونیک ڈش جو میں نے "ردا" سے ہی دیکھ کر بنائی تھی اسٹرابیری ٹرائفل جو کافی مزیدار اور توانائی سے بھرپور تھی۔ چونکہ طویل جواب لکھنے پر پابندی ہے لہٰذا (ترکیب لکھنے سے معذرت)

4۔ میری پچھلے سال ہی منگنی ہوئی ہے لہٰذا پہلی عیدی بڑی اسپیشل تھی جس میں دو اسٹائلش سوٹ، میچنگ جیولری، چوڑیاں، کاسمیٹکس، پرفیوم پرس (ہینڈ بیگ) اور میوے، سویاں، فروٹ وغیرہ شامل ہیں۔

5۔ میزبان اور مہمان دونوں بننا پسند ہے۔ مزہ آتا ہے جب لوگ ٹائم نکال کر ہم سے ملنے آتے ہیں۔ رونق ہوتی ہے اور جب دوسروں کے گھر دعوت ہوتی ہے تو اس کا بھی اپنا مزہ ہے۔

6۔ آہ! عیدی اب کہاں؟ جتنی ملتی ہے اس سے زیادہ ہمارے چھوٹے کزنز، بہن بھائی اور اسٹوڈنٹ وصول لیتے ہیں۔

7۔ ابھی تو میکے کی عید کے مزے لوٹ رہے

ہیں بھائی اور پاپا سے عیدی وصولنے اور امی کے ہاتھ کے شیر خورمے سے عید میٹھی اور خوشگوار گزر رہی ہے۔ اگلے سال سسرال کی عید کا ذکر خیر کریں گے (ہاہاہا)۔

8۔ ارے نہیں جی میری بہن فرحانہ ماشاء اللہ خود ڈیزائنر ہے۔ وہ ہی ہم سب کے کپڑے ڈیزائن کرتی ہے۔ میری پیاری ماما جانی کے مشورے اسے چار چاند لگا دیتے ہیں۔

امید ہے میرے جوابات آپ سب کو پسند آئیں گے۔ آج ہم بھی ردا کے ساتھ عید کی خوشیوں میں شامل ہوئے اس کے لیے ردا آپی کا شکریہ۔

فروش شفق.........کراچی

1۔ عید 2015ء کے لیے یہی خاص پلاننگ ہے کہ اس بار عید پر اپنی فیملی کی پسندیدہ ڈشز بناؤں گی اور جہاں تک میرا خیال ہے عید پر کہیں جانے سے بہتر اپنے گھر میں عید انجوائے کی جائے۔ ہسبینڈ اور بچوں کی کھانے کی فرمائش پوری کی جائے۔

2۔ عید کے دن کی مصروفیت اتنی ہوتی ہے کہ کچھ سوچنے یا کسی کے خیال کی فرصت ہی نہیں ملتی ہے۔ عید کا پورا دن ایک ایک لمحہ بس واجد اور اپنے بچوں کے ساتھ انجوائے کرنے کا دل کرتا ہے۔

3۔ عید پر ویسے تو میں بریانی، اچار گوشت اور میٹھے میں شیر خورمہ بناتی ہوں مگر اسپیکی بہت پسند ہے اور مشروب میں آف کورس کولڈ ڈرنک یا ٹھنڈا ٹھنڈا دودھ ملا کوکس۔

4۔ واجد کے گھر سے پہلی عید پر اسکائی بلیو جارجٹ کا ملتانی کڑھائی والا سوٹ، چوڑیاں، سینڈل، پرس، مہندی یہ سب آیا تھا۔

5۔ مہمان بننا کسے اچھا نہیں لگتا۔ مزہ آتا ہے کہ بغیر محنت کے ہمارے لیے ٹیبل سجائی جائے مگر میں میزبان بھی بری نہیں ہوں میرا کوئی فیورٹ مہمان آجائے تو بس نہیں چلتا کہ اپنا دل نکال کر اس کے آگے رکھ دوں (یہ صرف محاورہ ہے)۔

6۔ اب ہماری عیدی کیا ہے۔ ہمارے بچوں کی عیدیاں ہوتی ہیں مگر سب سے زیادہ عیدی واجد کے بعد مجھے میرے میکے سے ملتی ہے، اس کے علاوہ ہر سال عید پر میرے دیور مجھے پچاس روپے عیدی دیتے ہیں۔

9۔ میکے اور سسرال کی عید میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ میکے میں اتنا ہلا گلا شور شرابہ نہیں ہوتا جب کہ سسرال میں بچہ بچہ فل انجوائے کرتا ہے۔ ان کی شرارتیں شور شرابہ کرنا اور بڑوں کا ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد ڈانٹنا مگر پھر بھی دونوں کی عید میں بہت فرق ہے۔

8۔ نہیں میں بھی طارق روڈ سے کبھی کریم آباد سے ریڈی میڈ سوٹ ہی خریدتی ہوں اس کے علاوہ تھری پیس لان کاٹن کے سوٹ تو زیب محل سے لے کر سلواتی ہوں۔

9۔ آف کورس بھئی واجد کی، وہ بھی ہماری عیدی کے ساتھ۔

10۔ عید کی صبح بچوں اور واجد کے ساتھ گزرتی ہے جو کہ میرا نہیں خیال کہ کوئی ماں یا بیوی اس صبح کو انجوائے نہیں کرے گی اور شام اپنے سسرال میں سب کے ساتھ گزرتی ہے۔ اس میں بھی الگ ہی انجوائے منٹ ہے اور عید کا دوسرا دن اپنے میکے میں جس کا اپنا الگ چارم ہے۔

فریدہ فرید.........پاکپتن شریف

فریدہ فرید ردائے دوستی کو عید مبارک کہتے ہوئے حاضر ہے۔ ردا عید نمبر میں عید سروے کا سلسلہ ایسا ہی ہے جیسے عید الفطر پر شیر خرما کا ذائقہ کچھ بھی نیا کر لو روایتی میٹھے کا اپنا ہی مزہ ہے۔

1۔ عید 2015ء کی سب سے اہم پلاننگ

مدینہ پاک کی خاک کو چومنا ہے۔ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی چوکھٹ بوسی، مسجد نبوی میں نماز عید کی ادائیگی میری ناقص عبادات وجود کا حاصل ہے۔ شہر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اعتکاف کی سعادت محض فضل اللہ اور عطائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے جبین شکر بجالانے لائق نہیں۔

2۔ عید اپنے پیاروں کی دید کا نام ہے۔ انہی کا خیال لاتی ہے جو پاس ہوں وہ دل میں اتر جاتے ہیں اور جو رضائے الٰہی سے دور ہو گئے ہوں وہ دل چیر دیتے ہیں ہمارے پیارے سلامت رہیں تو ہر دن عید ہے۔

3۔ عید کے حوالے سے گرمیوں کے موسم کی مناسبت سے کولڈ کافی، فرحت بخش مشروب ہے اور اس کی ریسپی بھی ہے۔ جوسر میں ایک گلاس دودھ، ایک گلاس پانی، ایک چمچ کافی اور ڈھیر ساری برف ڈال کر گرائنڈ کر لیں۔ اس کو گلاس میں ڈال کر اوپر سے کسی بھی آئس کریم کے دو چمچ بھی ایڈ کر لیں (یاد رہے آئس کریم کو گرائنڈ نہیں کرنا) مزیدار کولڈ کافی تیار ہے۔ مزہ نہ آئے تو پیسے واپس۔

4۔ ان کے گھر سے قبل ان شادی کچھ بھی عیدی نہیں آئی۔ وہ باقاعدہ منگنی کے انتظار میں رہے اور ہم بنا منگنی شدہ کہلائے شادی شدہ قرار پا گئے اس لیے عیدی سے محروم ہی رہے۔

5۔ مہمان بننا کب اچھا نہیں لگتا۔ میزبانی اگرچہ تھکا دینے والا فرض ہے مگر عید کے دن گھر کی سجاوٹ پر کی گئی محنت وصول کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

6۔ نسبتی تعلق عید کی اصل ہے تو نکاحی تعلق عیدی کی وجہ ہے۔ جناب من عید کے دن کچھ زیادہ ہی پیارے لگتے ہیں گر عیدی مطلب کی دے دیں تو قربان جانے کو دل کرتا ہے میں لکھ رہی ہوں اور وہ گھور رہے ہیں کہتے ہیں ہر روز عیدی لے لو اور ہر لمحہ پیار سے دیکھو۔ شادی کے بعد پہلی عید پر انہوں نے بطور عیدی اپنا پورا والٹ دے دیا تھا اور ایسی عادت بگاڑ دی ہے کہ اب ہم ان کے والٹ میں کچھ رہنے ہی نہیں دیتے۔

7۔ میکے میں عید مناتے ہیں اور سسرال میں عید گزارتے ہیں میکے میں عیدی لیتے تھے اب دینے والے ہیں میکے میں فکر ہوتی تھی تو صرف اپنی عیدی اور جیولری کی سسرال میں فکر ہوتی ہے پکوانوں کی اور مہمانوں کی۔

8۔ عید کے ڈریسز ہوں یا عام دنوں کے میرے کپڑوں کی ڈیزائننگ میری پیاری بہن و دیورانی سعیدہ علی کرتی ہے۔

9۔ عید کی پہلی وش گھر کے بزرگوں کی دعاؤں سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

10۔ عید کی صبح زیادہ پرجوش اور بارونق ہوتی ہے آمد بہار کا سماں ہوتا ہے اس کے برعکس عید شام جاتی جیسا ماحول ہوتا ہے۔

باوجود کوشش کے مختصر تحریر نہ کر سکی طوالت پر معذرت کے ساتھ اللہ حافظ۔

شاہدہ علی.........لاہور

1۔ پلاننگ تو کچھ خاص نہیں ہے۔ بس اللہ پاک سے یہ دعا ہے کہ اس سال رمضان اور عید پرامن طریقے سے گزریں۔

2۔ عید میری امی جی کا خیال لاتی ہے جو 2005ء میں ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئیں۔ اللہ کریم محمد وآل محمد کے صدقے میں ان کے درجات بلند کرے۔

3۔ مینگو کسٹرڈ: دودھ ایک کلو، چینی ایک کپ، سویاں ایک چوتھائی کپ، آم دو کپ چوکور کٹے ہوئے، کسٹرڈ پاؤڈر تین کھانے کے چمچ (دودھ میں مکس کیے ہوئے) کریم ایک پیکٹ پاؤ والا۔

ترکیب: دودھ کو گرم کر کے اس میں کسٹرڈ پاؤڈر

ملالیں۔ پھر اس میں چینی اور سویاں ڈال کر اتنا پکائیں کہ گاڑھا ہو جائے۔ تیار کسٹرڈ کو چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کرلیں۔ آم کے ٹکڑوں میں کریم مکس کرلیں۔ اب باؤل میں ایک تہہ کسٹرڈ کی اور ایک تہہ کریم مکس کیے ہوئے آموں کی لگاتی جائیں۔ فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کرلیں۔ خود بھی کھائیں اور دوسروں کو بھی کھلائیں۔

4۔ "اُن" ابھی کوئی لے کے نہیں تو ابھی تک کچھ آیا بھی نہیں ہاہاہا۔

5۔ ففٹی ففٹی۔ سارا دن میزبانی کرکے بھی اکتا جاتی ہوں اور مہمان بن کر بھی۔ سو کبھی میزبان تو کبھی مہمان۔

6۔ میرے پاس دو تین ہزار سے زیادہ عیدی کبھی بھی نہیں ہوئی یہ بھی وہ عیدی ہوتی ہے جو ڈائریکٹ میرے ہاتھ میں آتی ہے۔ ورنہ جو عیدی میری سب سے چھوٹی بہن کے ہاتھ آتی ہے وہ اس پر قبضہ کرلیتی ہے اور پھر مانگے نہیں دیتی بقول اس کے میں سب سے چھوٹی ہوں میرا زیادہ حق بنتا ہے۔

7۔ عید تو عید ہے کیا میکے کی اور کیا سسرال کی مگر میرا مشاہدہ ہے کہ میکے کی عید بے فکری کی ہوتی ہے اور سسرال کی ذمہ داریوں سے بھری ہوئی۔ سو میکے کی عید لڑکیاں زیادہ انجوائے کرتی ہیں۔

8۔ ڈیزائننگ میں خود کرتی ہوں اور میرے پاپا چونکہ بہت ماہر ٹیلر ہیں تو سلائی وہ کردیتے ہیں۔

9۔ یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ کس کا نام لوں اور کا نہ لوں۔ جس کا لیا وہ خوش اور جس کا نہ لیا وہ ناراض۔ سو تمنا کو تمنا ہی رہنے دیجیے۔

10۔ شام...... کیونکہ عید کی صبح بہت افراتفری والی ہوتی ہے۔ شام تک گرمی بھی کم ہو جاتی ہے اور قدرے سکون بھی ہو جاتا ہے۔

شازیہ مصطفی عمران..........کراچی

1۔ عید 2015ء کے لیے کوئی خاص پلاننگ نہیں کی کیوں کہ جب سے شادی ہوئی ہے میری کوئی پلاننگ نہیں چلتی کیوں کہ میرے ہسبنڈ کی عید کے دن سستی کی وجہ سے دھری رہ جاتی ہے۔ عید میں چند دن رہ جاتے ہیں تو جلدی جلدی شاپنگ کرواتے ہیں مگر اس دفعہ عمران نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ عید کی ساری شاپنگ رمضان سے پہلے کرلیں گے۔

2۔ عید پر تو ہم ان کے پاس ہی ہیں جو عید سے پہلے ان کا ہی خیال لاتی تھی مگر اب عید پر مجھے اپنے میکے کی عید بہت یاد آتی ہے۔

3۔ عید کے حوالے سے کوئی یونیک ڈش نہیں آتی کیوں کہ سب کچھ عمران کی امی کی مرضی سے بنتا ہے اور رہا مشروب تو کولڈ ڈرنک سوفٹ ڈرنک استعمال کرتی ہوں۔ مشروب مجھے کوئی نہیں آتا۔

4۔ پہلی عید پر میری منگنی ہوئی تھی وہی عید کا جوڑا جیولری وغیرہ وہ سب میں نے عید کے ایک ہفتے بعد میری منگنی تھی اس پر پہنا تھا۔

5۔ عید کے پہلے دن تو میرے گھر سے آتے ہیں اور عید کے دوسرے دن بھی میں میزبان ہی ہوتی ہوں۔ ویسے عید کی شام ہم لوگ عمران کی بہن اور میری بہنوں سے ملنے چلے جاتے ہیں کیوں کہ عید کے تیسرے دن میکے میں دعوت ہوتی ہے۔

6۔ عید کے دن عیدی کا ریکارڈ جب میں شادی سے پہلے اعتکاف میں بیٹھی تھی بہت زیادہ عیدی ملی تھی یہ یاد نہیں کتنی تھی۔

7۔ میکے اور سسرال کی عید میں فرق یہ ہے کہ میکے میں عیدیں پررونق ہوتی تھیں مزا آتا تھا ہر طرح کی آزادی تھی اپنی مرضی سے عید گزارتے تھے اور اب شادی کے بعد اپنے میاں کے موڈ پر چلنا ہوتا ہے۔ But سسرال کی عیدیں خاموشی سے گزر جاتی ہیں میں اور عمران باہر گھوم پھر آتے

ہیں مگر ماشاء اللہ جب سے ایمان ہوئی ہے ہماری عیدیں اچھی ہوگئی ہیں۔

8۔ عید کے ڈریسز شادی کے بعد سے تو ریڈی میڈ لینے شروع کردیے ہیں کیوں کہ ایمان کچھ کرنے نہیں دیتی ورنہ میں تو خود ڈیزائننگ کرتی تھی اب تو ٹیلر سے بھی سلواتی ہوں۔

9۔ عید پر پہلی وش اپنے ہسبنڈ کی ملتی ہے اور چاہوں گی ہمیشہ ان کی وش ملتی رہے، آمین۔ دوسری ندیم اور شائلہ کی ملتی ہے یہ میرے سگے بہن بھائی کی طرح ہیں۔

10۔ عید کی صبح سہانی سسرال میں تو اور شام ایک سی ہی عام دن کی طرح ہوتی ہے البتہ میری امی کے گھر بہت مزا آتا ہے اور ہاں جب میں اور عمران جب شام میں ہم باہر نکلتے ہیں عید کی شام اچھی لگتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہوں گی اللہ حافظ، تمام پڑھنے والوں کو اور ردا کی پوری ٹیم کو پیشگی عید مبارک۔

ریحل آرزو..........اوکاڑہ

1۔ عیدالفطر کی ابھی فی الحال کوئی خاص پلاننگ نہیں کی۔ ابھی تو رمضان المبارک کی آمد پر جوش اور خوش ہوں دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمیں اس ماہ مبارک میں خوب رحمتیں برکتیں سمیٹنے کی توفیق دے اور ہمارے گناہ معاف فرمائے۔ ہماری عبادات اپنی بارگاہ میں قبول و مقبول فرمائے، آمین۔

2۔ عید ان پیارے اپنوں کا خیال لاتی ہے جو گزشتہ عیدوں میں ہمارے ساتھ تھے اور بچھڑ گئے جو اب ہمیشہ یادوں کی ہی صورت ہمارے ساتھ رہیں گے اور عید پر ان لوگوں کا بھی خیال آتا ہے جو عید کی خوشیوں سے بھرپور انداز میں لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

3۔ میٹھی عید کے حوالے سے میٹھی سی "ایزی ملک برفی" کی ترکیب۔ اجزاء: ملک پاؤڈر دو کپ، کریم ایک کپ، کنڈینسڈ ملک ایک کپ، پستے پچاس گرام، روز واٹر ایک کھانے کا چمچ، الائچی آدھا چائے کا چمچ پسی ہوئی۔ ترکیب: ملک پاؤڈر، کریم، کنڈینسڈ ملک، پستے، روز واٹر اور الائچی کو مکس کریں۔ اور مائیکرو ویو میں چار منٹ کے لیے رکھ دیں۔ مزے دار ایزی ملک برفی جھٹ پٹ تیار۔

4۔ عید کے دن مہمانوں کی آمد زیادہ اچھی لگتی ہے۔

5۔ عیدی کا کبھی حساب نہیں رکھا۔ عیدی دینے والے کا خلوص یاد رہتا ہے۔

6۔ جی ہاں عید کے ڈریسز خود ڈیزائن کرتی ہوں۔

7۔ عید پر پہلی وش ہمیشہ عید کی نماز ادا کرنے کے بعد ابو جی اور بھائی کی جانب سے ہی ملتی ہے مگر اس بار تمنا ہے کہ مجھے ردا رائٹرز ندا حسنین، افشاں علی، سحرش فاطمہ، اقراء صدف، دانیہ، ثناء ناز اور عائشہ خان بھی عید وش کریں۔

8۔ چاند رات کے بعد اجلی اجلی نکھری سی عید کی صبح سہانی لگتی ہے ہر طرف عید کی گہما گہمی جوش و خروش سے چمکتے دمکتے بنے سنورے چہرے اچھے لگتے ہیں۔ فضا میں مہکتی مہندی کی مہک اور چوڑیوں کی چھنکار بچوں کی عیدی کے لیے تکرار سب دل کو بہت بھاتا ہے مگر جیسے جیسے شام ہوتی ہے عید کی خوشیاں ماند پڑنے لگتی ہیں۔ عید کی صبح سہانی اور شام اداس ہوتی ہے۔

ایقان علی..........ٹوبہ ٹیک سنگھ

سب سے پہلے تو مدیرہ صاحبہ، ردا ڈائجسٹ کی تمام ٹیم، مصنفات اور قارئین کو السلام علیکم! اب آتے ہیں جوابات کی طرف!

1۔ عید 2015ء کے لیے کچھ زیادہ خاص پلاننگ تو نہیں البتہ ہمارے ایک ماموں ممانی ہیں جو کہ ہر عید پر ہمارے گھر آتے ہیں۔ چاٹ، کوک، بریانی کی دعوت اڑا کر بنا عیدی رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ اس دفعہ عید پر ان کی تواضع بینگن کی بھجیا اور

کدو کے لیے شوربے سے کرنے کا ارادہ ہے، کیسا؟

2۔عید کی صبح سب سے پہلے اس پپا (کنستر) بجانے والے کا خیال لاتی ہے جو سارا رمضان سحری کے وقت آتا ہے۔ سحری ختم سے دو منٹ پہلے آتا ہے اور وہ طوفان مچاتا ہے کہ الامان...... عید کی صبح بھی یہی خیال آتا ہے کہ بس آنے والا ہو گا منحوس اور سو دو سو سے کم کی تو بات بھی نہیں کرتا۔

3۔ہے ایک یونیک ڈش۔ اجزاء: ایک عدد پیاز، چھری، برتن، ٹماٹر، کھیرا پیاز لیں اور اسے اچھی طرح کاٹیں اب ٹماٹر کو بھی اچھی طرح دھو کر کاٹ لیں۔ کھیرا اور اگر چاہیں تو سلاد کے پتے بھی ملا کر سلاد تیار کریں۔ سلاد تیار ہے۔ نزدیکی ہوٹل سے گرما گرم بریانی منگوا کر اس سلاد کے ساتھ نوش کریں۔

4۔اُن کے کن کے؟ پڑوسیوں کے؟ سویاں پتلے پانی جیسے دودھ میں تیرتی ہوئیں۔ پڑوسیوں کے نہیں؟ پھر؟ ممانی وغیرہ کے؟ جی وہ انتہائی تھرڈ لے ہیں کچھ نہیں بھیجتے۔ ان کے بھی نہیں؟ پھر کون؟

5۔دونوں بننا پسند نہیں۔ میزبان بنیں تو مہمانوں کی فرمائش ختم نہیں ہوتی اور مہمان بنیں تو دوسرے ہماری فرمائش پوری نہیں کرتے سو گھر رہنا ہی ٹھیک ہے۔

6۔ہمارے گھر والے انتہائی کنجوس ہیں اور رشتے دار وغیرہ مکھی چوس۔ ڈھیلہ دے کر راضی نہیں کسی کو۔ دس پندرہ روپے عیدی کیا دیں گے کم سے کم عیدی کا ریکارڈ پوچھتیں۔

7۔ابھی فی الحال اس کا تجربہ نہیں کیوں کہ گزشتہ 19 عیدیں فی الحال ہم نے میکے میں ہی گزاری ہیں۔

8۔نہیں جی اتنے ہم "ماریہ بی" یا "ونیزہ احمد" نہیں کہ جو ڈیزائننگ کریں۔ ٹیلر کا تو منہ بند ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا گھر میں ماما سلائی کر دیتی ہیں کپڑے۔

9۔اپنی خود کی۔ عید کی صبح آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ہم خود کو ہی عید مبارک کہہ لیتے ہیں۔

10۔صبح ہی نسبتاً بہتر ہوتی ہے کیوں کہ شام میں تو ہم اپنے ننھیال یعنی نانی اور ماموں ممانی کے گھر جاتے ہیں۔ (جی وہی جن کا اوپر تذکرہ ہو چکا...... مکھی چوس ٹائپ کے (ان کا منہ ہمیں دیکھتے ہی سوچ کر کیا ہو جاتا ہے۔ سو لوٹ کر بدھو گھر کو آجاتے ہیں۔)

آخر میں ایقان علی کی طرف سے ردا ڈائجسٹ کی ساری ٹیم، مصنفات، قارئین اور خاص طور پر صالحہ آنٹی کو عید مبارک۔

عباس گل........رحیم یار خان

السلام علیکم! صالحہ آپی! نورین ملک جی ردا ڈائجسٹ کے تمام معزز اسٹاف، اراکین، رائٹرز، ریڈرز اور آپ دونوں کو ہماری جانب سے بہت بہت عید مبارک قبول ہو۔ اللہ پاک اس عید کو ہم سب کے لیے صحیح معنوں میں خوشی، امن و آشتی کا باعث بنائے، آمین۔ اب آتے ہیں عید سروے کے جوابات کی طرف۔ صالحہ آپی! نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی عید سروے کا اہتمام کر کے ردا کی روایت کو برقرار رکھا ہے جن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

1۔عید پلاننگ تو کوئی خاص نہیں ہاں اس عید پر ڈریس چوڑی دار پاجامہ، فراک اور بڑا سا دوپٹہ سلوانے کا سوچا ہے۔ باقی انشاءاللہ ہم سب گھر والے ساتھ ہوں گے عید کے دن۔

2۔عید کا دن ہو اور خیال ان کا
عید سے کم نہیں جمال ان کا
وہ محبت کا چاند ہیں ایسا
ہے دل میں روشن رخ ہلال ان کا

3۔عید الفطر پر تو شیر خورمہ ہی بنایا جاتا ہے اور

منٹ اسپرائیٹ ڈرنک اور ملک شیک بھی۔

4۔ان کے گھر سے؟ کن کے گھر سے؟ اچھا ان کے گھر سے ارے بھئی وہی روایتی سا تحفہ آیا تھا۔ کپڑے، جوتے، چوڑیاں، سویاں، مٹھائی اور کچھ نقد رقم۔

5۔میزبان بننا زیادہ اچھا لگتا ہے۔

6۔گزشتہ عید پر سات ہزار 300 روپے عیدی ملی تھی۔ جو کم از کم ہمارے لیے تو ایک ریکارڈ ہی ہے۔

7۔میکے اور سسرال کی عید میں وہی فرق ہے جو فرق حسینہ معین اور ڈاکٹر انور سجاد کے ڈرامے میں ہے۔ (سمجھنے والے سمجھ تو گئے ہوں گے)۔

8۔نہیں بھئی ہم نے ٹیلر کو کبھی فائدہ نہیں پہنچنے دیا۔ ہمیشہ گھر میں ہی کپڑے ڈیزائن کیے اور سلوائے ہیں لیکن اب سوچ رہے ہیں کہ ٹیلر کو بھی چار پیسے کما لینے دیں اس کا ہنر بھی آزما کر دیکھ لیں ایک بار کیا خیال ہے آپ کا؟

9۔پہلی وش تو امی ابو اور بہن سے لینے کی تمنا ہے۔

10۔عید کی صبح زیادہ سہانی لگتی ہے مگر شام کا بھی اپنا لطف ہے جب سب جمع ہوتے ہیں گپ شپ کھانا پینا چلتا ہے تو خوب مزا آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے گھروں کی رونقیں اور عید کی خوشیاں برقرار رکھے اور پاکستان کو امن و آشتی کا گہوارہ بنائے، آمین ثم آمین۔

مہرین کنول.........کراچی

السلام علیکم اور ستاروں کی بارات سے جشن کے جیسی خوشبوؤں سے معطر خوشیوں کی سوغات سے بھری عید مبارک ہو۔ صالحہ آپی، نورین آپی، ردا اسٹاف و قارئین کو۔

1۔میں نے کوئی خاص پلاننگ نہیں کی ہے۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ عید اللہ کا دیا ہوا روزے داروں کے لیے تحفہ ہے۔ خوشی کا دن ہے اس میں روٹھوں کو منانا عید ملنا اپنوں سے پرائیوں سے اور جن سے عام حالات میں مصروفیت کی وجہ سے ملاقات نہیں ہوتی اور خوب صورتی سے تیار ہونا اور عید منانا ہے۔

2۔عید حضرت عمرؓ کا رونا یاد دلاتی ہے کہ وہ عید پر یہ سوچ کر روتے تھے کہ یہ دن وعید کا ہے یا عید کا یعنی وعید اس کے لیے جس کی عبادت قبول نہیں ہوئی اور عید اس کے لیے جس کی عبادات قبول ہو گئی۔

3۔عید کے حوالے سے ایک ڈرنک بتا رہی ہوں۔ دودھ، کیلے، آم، کریم، دہی اور چینی لے کر بلینڈر میں ڈال لیں اسے بلینڈ کریں۔ گلاس کے اندر اطراف میں چاکلیٹ سیرپ ڈالیں اور پھر یہ بلینڈر کیا ہوا مکسچر ڈال کر سرو کریں۔

4۔میری شادی نہیں ہوئی ہے۔

5۔عید کے دن میزبان بننا زیادہ اچھا لگتا ہے۔

6۔عیدی کا ریکارڈ تقریباً 9200 ہے۔

7۔کہا نا میری شادی نہیں ہوئی ہے مگر اپنے مشاہدے سے اتنا ضرور بتا سکتی ہوں کہ میکے میں عید شوخ و چنچل جذبات کے ساتھ عید مناتے ہیں جب کہ سسرال میں ایک ذمہ داری سے مہمان نوازی کر لی جاتی ہے یا پھر سسرال سے میکے میں جا کر عید منائی جاتی ہے۔

8۔عید کے ڈریسز میری امی ٹیلر کو ڈیزائن بتاتی ہیں جس میں میری پسند بھی شامل ہوتی ہے امی اور میری پسند ایک جیسی ہے۔ اللہ کا شکر ہے ہر عید میں میرے لباس شاندار ہوتے ہیں۔

9۔ماں سے وش لینا پسند کروں گی

10۔عید کی صبح سہانی ہوتی ہے جس میں لوگ نہا دھو کر کپڑے بدلتے ہیں نماز پڑھتے ہیں عید ملتے ہیں گہما گہمی ہوتی ہے ایک نئی خوشی و خوشبو سے معطر صبح کا نظارہ جو عید کا سماں باندھتا ہے دلکش لگتا ہے اور شام جب سب تھکے ہوتے ہیں میں چھت پر آ کر

پر رونق روشنیوں سے بھری شام کا سہانا منظر بھی انجوائے کرتی ہوں۔

گیتی آراء.........کراچی

1۔کوئی خاص پلاننگ نہیں ہے۔ وہی پہلے کی طرح اپنے اور میاں کے سارے جوڑے سینڈل رومال اور بہت دل چاہا تو میچنگ کی جیولری، چوڑیاں بھی خرید لیں۔ گھر کی وہی سجاوٹ صفائی وہی پکوان شیر خورمہ اور بریانی وغیرہ۔

2۔عید کن کا خیال لاتی ہے! میاں کے علاوہ، وہ ساتھ ہیں پاس ہیں تو سب ساتھ ہیں سب پاس ہیں۔

3۔یونیک ڈش! وہی خوب بادام پستے والا پتلا لیکن خالص دودھ کا شیر خورمہ اور خوب بادام پستے والا روح افزا ملا ہوا خالص دودھ کا خوب ٹھنڈا یخ شربت۔ میرے لیے تو اس سے بڑی یونیک ڈش اور کوئی نہیں۔

4۔اتنے سال بیت گئے شادی کو اب تو یاد بھی نہیں کہ ان کے گھر سے کیا آیا تھا۔ یا ہمارے ہاں سے کیا گیا تھا۔ ہاں البتہ اتنا یاد ہے کہ ان کے گھر سے پہلی دفعہ بہت عمدہ اور لذیذ حلیم کی دیگ آئی تھی جو سب نے واہ واہ کر کے چاٹ کر کھائی۔

5۔عید کے دن مہمان بننا زیادہ پسند اور اچھا لگتا ہے۔ خوب تیار ہو کر بج دھج کر جاؤ کپڑے دکھاؤ تعریفیں بٹورو، لذیذ پکوان کھاؤ، گپیں لگاؤ انجوائے کرو اور آجاؤ۔

6۔عید کے دن سب سے زیادہ عیدی کا ریکارڈ کچھ ٹھیک سے یاد نہیں شاید ہزار دو ہزار۔

7۔کوئی خاص فرق نہیں عید تو تقریباً ہر گھر کی ایک جیسی ہوتی ہے تیاری ایک سی ہی ہوتی ہے۔ میکے میں رات بھر گھر کی سیٹنگ صفائی ستھرائی سے فارغ ہو کر صبح ہی صبح تیار ہو کر بیٹھ جاتے تھے اور خاص کر عید کے دن امی کے ہاتھ کا قورمہ اور پلاؤ اور کشمیری سویاں کھا کر لمبا سو جاتے یا پھر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے۔ اب سسرال میں پہلے اٹھ کر گھر کی سیٹنگ پھر پکوان سے فارغ ہو کر نہاتے دھوتے ہیں اور عید کے کپڑے پہن کر تیار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور اگر موڈ ہوا تو بہن بھائی کی طرف عید ملنے نکل جاتے ہیں ورنہ وہی حسب معمول بیڈ پر جا کر ٹی وی لگا لیتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے سو جاتے ہیں۔

8۔اپنے پسندیدہ ڈیزائن ٹیلر کو دکھا سمجھا دیتے ہیں وہ ویسا ہی سی کر تیار کر دیتا ہے۔

9۔یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے ظاہر ہے میاں۔

10۔بچپن میں تو شاید صبح سہانی لگتی تھی۔ صبح ہی صبح فجر کے وقت اٹھ کر سب سے پہلے مہندی کا رنگ دیکھتے تھے کتنا چڑھا اور پھر نہا دھو کر تیار ہو کر عیدی وصول کر کے بازاروں اور رشتے داروں میں گھومنے پھرنے نکل جاتے تھے ابا کا ہاتھ تھام کر۔ اور اب شاید شام سہانی لگتی ہے تھکے تھکے بدن کے ساتھ سب مہمانوں سے فارغ ہو کر سنہری سنہری شام میں بیڈ پر لیٹ کر ٹی وی پر عید کے پروگرام انجوائے کرتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔

سحر مبین..........فیصل آباد

السلام علیکم! سب سے پہلے تو سب سویٹ فرینڈز کو بہت بہت عید مبارک ہو۔ اب آتے ہیں جوابات کی طرف۔

1۔ہم مم مم یار ابھی تو کوئی خاص پلاننگ نہیں ہے ہاں عید سے دو دن پہلے میرا بائیو کا پریکٹیکل ہے۔ اس دن سب فرینڈز نے عید شاپنگ کا پلان کیا ہے اور عید کے دنوں میں ہی اقراء کی برتھ ڈے ہے تو اسے اس کے گھر سیلیبریٹ کرنے کا سوچا ہے۔

2۔عید ہمیں ہمارے پیاروں کی یاد دلاتی

ہے۔ وہ جو ہمارے دل کے بہت پاس ہوں ان کا ہی خیال آتا ہے۔ ہاں اس سب کے ساتھ ساتھ ان غریب غرباء کا بھی خیال لاتی تھی جو سال بھر ترستے جوتے، کپڑے لینے کو عید کی آس میں رہتے ہیں۔

3۔میں تو کھانے کی شوقین ہی نہیں میں کیا بتا سکتی ہوں (ہاہاہا)۔

4۔وہ ہیں ہی نہیں تو آنا پر کیا ہے۔ (ہاہاہا کنوارے ہیں ابھی تو)۔

5۔گیدرنگ اچھی لگتی ہے عید کے دنوں میں تو مہمان سے زیادہ مگر میزبان بننا پسند ہے میزبان بننے میں زیادہ مزہ ہے۔

6۔ریکارڈ (ہاہاہا) ہم مم انٹرسٹنگ ماموؤں کی طرف سے تو اکثر قسطوں میں عیدی ملتی ہے، گھنٹے گھنٹے بعد چند نوٹ وہ بھی صرف مجھے چڑانے کو پھر بھی دو ہزار تک ہو گی شاید۔

7۔اس کا تو ابھی پتا نہیں۔

8۔زیادہ تر تو میرے ڈریسز ریڈی میڈ ہی ہوتے ہیں۔ ہاں مما خود ہی میری ٹیلر ہیں اور ٹیلر کے آسرے پر چھوڑے جاسکتے ہیں کیا؟ نا....... ایک ایک پوائنٹ نوٹ کرانا ہوتا ہے فل ڈیزائننگ خود کی مما کی ہیلپ سے۔

9۔آف کورس مما کی۔

10۔سارا دن ہی سہانا ہوتا ہے۔ صبح زیادہ۔ اور اس عید کی خوشیوں میں سب کو یاد رکھیے اللہ حافظ۔

درخشاں فیاض.......کراچی

1۔کوئی خاص پلاننگ نہیں ہے۔

2۔عید ان کا خیال لاتی ہے ہمارے وہ پیارے جو ملک سے باہر ہیں۔ عید پر ان کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

3۔عید پر ہمارے ہاں ایک اسپیشل ڈش بنتی ہے۔ اُردہ کی دال کے ساتھ گوشت ڈال کر پکایا جاتا ہے۔ ہر عید الفطر پر اردہ گوشت اور سادے چاول ضرور بنتے ہیں۔ اگر جگہ کی کمی نہ ہوتی تو ترکیب ضرور لکھتی۔

4۔کیا یاد دلا دیا...... دو سوٹ ود آل میچنگ آئے تھے۔ ساتھ میں بچوں کی طرف سے بھیجے گئے گفٹ بھی تھے۔ یادگار عیدی تھی آج تک کچھ چیزیں سنبھال کر رکھی ہیں۔

5۔مجھے تو میزبان بننا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ عید کی صبح مہمانوں کی آمد عید کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

6۔سب سے زیادہ عیدی کا ریکارڈ تو یاد نہیں۔ پچھلے سال عید پر 7 ہزار جمع ہوئے تھے۔

7۔میکے کی عید بے فکری کی عید ہوتی ہے سسرال کی عید میں ذمے داری کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ ذرا سی بات آپ کو عرش سے فرش پر لے آتی ہے۔

8۔الحمد للہ خود ڈیزائن کرتی ہوں۔ موسم کی نسبت سے ہی عید پر کپڑے بناتی ہوں اگر ٹیلرز کے آسرے پر چھوڑیں تو وہ شلوار کا پاجامہ، فراک کی کرتی بنا دیں۔

9۔پہلی وش کی تو نہیں البتہ مجھے اس عید پر اس بات کی تمنا ہے کہ اس عید پر دوست و احباب کی طرف سے کارڈ موصول ہوں۔

10۔عید کی صبح بہت سہانی لگتی ہے۔ مہندی والے ہاتھ دھونا، تیار ہو کر فجر پڑھنا، مرد حضرات نماز پڑھ کر آتے ہیں پھر عیدی ملنا۔ یہ سب بہت اچھا لگتا ہے۔ شام کی نسبت مجھے عید کی صبح زیادہ پسند ہے۔

فرح ناز رفیق.........کراچی

1۔کچھ خاص نہیں معمول کی تیاری رمضان کی ایکسائٹمنٹ کے ساتھ۔

2۔جو بچھڑ گئے سب کا۔

3۔کوشش ہوتی ہے کچھ نیا بنائیں مگر بھائیوں

کی فرمائش بریانی پر تان ٹوٹتی ہے۔

4۔ہم مم ان یا ان یا انہیں والا چکر نہیں ہے ابھی تک۔

5۔مجھے ہر دن میزبان ہی بننا اچھا لگتا ہے اور عید کے دن بھی۔

6۔یاد نہیں ہے شاید چار ہزار تھی۔

7۔شاید کچھ فرق ہو۔ نہیں تو اندازہ نہیں ہے تو میکہ ہی پیارا ہے۔

8۔ڈریسز خود ہی ڈیزائن کرتی ہوں ہر تقریب کے لیے یا ریڈی میڈ لے لیتی ہوں۔

9۔آہ ہاں ہزاروں خواہشیں ایسی رہنے دو یہ سوال۔

10۔عید کی صبح زندگی سے بھرپور ٹھنڈی میٹھی اور حسین ترین شام تک شام کی طرح سورج کی طرح ہم بھی تھک جاتے ہیں۔

روشنی فاطمہ فیصل.........کراچی

1۔عید کی پلاننگ میں گھر کی تو نہیں مگر اپنے روم کو نئے سرے سے ڈیکوریٹ کرنے کی پلاننگ کی ہے۔ انشاء اللہ اس ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں گے۔

2۔عید اپنوں سے ہی پر رونق ہوتی ہے اور اپنوں کا ہی خیال لاتی ہے۔ جن میں دوست، بہن، بھائی، ابو، بھابیاں اور بھتیجی، بھتیجے، بھانجی بھانجے شامل ہیں۔

3۔عید کی خاص ڈش سویٹ ڈش ہے جو کہ ہر گھر کی خاص ہوتی ہے اور روایتی ڈش ہے وہ ہے میری بہت ہی فیورٹ شیر خورمہ۔

4۔ان کے گھر سے پہلی دفعہ سوٹ، سینڈل، چوڑیاں اور عید کا اسپیشل عید کارڈ بھی آیا تھا جس میں اسپیشل بہت اسپیشل Heart بھی بنا ہوا تھا۔ (سو رومانٹک ناں)۔

5۔عید کے دن مہمان بننا بھی اچھا لگتا ہے اور میزبان بننا بھی۔ مہمان داری کے ٹھاٹھ الگ ہوتے ہیں (ہاہاہا) اور میزبان بننے میں مہمانوں کی خاطر داری کرنا مہمان نوازی کرنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

6۔میکے اور سسرال کی عید میں بہت فرق ہوتا ہے۔ سب سے بڑی وجہ تو کنوارے پن سے شادی شدہ ہونے کا ہوتا ہے اور اسی فرق کے سبب خود بخود ہی میکے اور سسرال میں عید میں تبدیلی آجاتی ہے۔ عید میکے کی بھی اچھی تھی اور سسرال کی اور بھی اچھی ہے کیوں کہ ان عیدوں میں فرق یہ ہے کہ ہم اب مہمان بھی بن کر عیدی وصول بھی کرتے ہیں اور میزبان بن کر دوسروں کو خوشیاں بھی بانٹتے ہیں پہلے صرف ہم میزبان ہوا کرتے تھے۔

7۔عیدی کا ریکارڈ یہ تو ہمیں پچھلی عیدیوں کا حساب کتاب رکھنا چاہیے۔ کچھ تو یاد نہیں پر عیدی کا ریکارڈ 6000 ہے۔

8۔عید کے کپڑے بھی ریڈی میڈ لیتی ہوں اور کبھی خود بھی ڈیزائن کرتی ہوں۔ یہ عید اور وقت پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر وقت کم ہوتا ہے تو ریڈی میڈ پر انحصار کرتی ہوں ورنہ خود ہی ڈیزائن کرتی ہوں۔

9۔عید پر پہلی وش یقیناً فیصل کی ہی طرف سے سننا چاہتی ہوں مگر ایسا ہوتا نہیں کیوں کہ عید کی ایڈوانس وشز پہلے ہی سیل فون پر بھیجی، بھابیوں، آپی اور بھائی کی آجاتی ہیں وہ بھی تین چار دن پہلے ہی۔

10۔عید کا دن بھی اچھا لگتا ہے مگر شام اور رات زیادہ خوش کن اور سہانی لگتی ہیں۔ کیوں کہ شام میں ہی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

مدیحہ اعجاز حسین.........کراچی

1۔السلام علیکم صالحہ آپی جی، نورین آپی جی اینڈ آل ردا ٹیم کو مدیحہ اعجاز حسین کی جانب سے

ڈھیر ساری بیسٹ وشز کے ساتھ عید الفطر کی ڈھیروں خوشیاں مبارک ہوں۔ رب العزت کی طرف سے عید الفطر تمام مسلمانوں، روزے داروں کے لیے خوب صورت تحفہ ہے۔ فرسٹ ڈے عید میں اپنی ڈائری میں غزل و گیت ضرور لکھتی ہوں اور یہ گیت جو میرے لیے انسپریشن ہے۔

زندگی کی یہی ریت ہے
ہار کے بعد ہی جیت ہے

2۔ہاں جی! عید انہی کا خیال لاتی ہے لڑکی اگر میرڈ ہے تو اپنے ہسبینڈ سنگ عید کی خوشیاں مناتی ہے اگر ان میرڈ ہے تو اپنے شہزادے کی یاد سنگ عید گزارتی ہے۔ میرے لیے پورے سال میں سب سے جدا اور خوب صورت دن عید کا ہوتا ہے۔ وہ خوشی جب جگمگ کرتے فلک پر چاند کو تکتے محسوس ہوتی ہے اپنی ڈائری لکھتے وقت محسوس ہوتی ہے اور جب ماں کی ممتا کے سائے میں عید کے لمحے گزرتے ہیں۔ یہ وہ پاکیزہ سحر زدہ خوشیوں بھرے خوب صورت عید کے لمحے ہوتے ہیں جو مجھے ان ہی کی یاد دلاتے ہیں۔

3۔Mrinda میری فیورٹ کولڈ ڈرنک ہے۔ جب بات یونیک مشروب کی ہو تو سردی ہو یا گرمی میٹھی عید کے لیے میٹھا مشروب پیپسی، دودھ سوڈا مشروب مزیدار ذائقے کے ساتھ توانائی بھی بخشے۔ میری امی جی زبردست کوکنگ کرتی ہیں۔ چاہے وہ عید کا شیر خورمہ ہو، بریانی ہو، گوشت شوربہ ہو یا کوئی بھی ڈش ہو۔ ان میں ماں کے ہاتھ کا ذائقہ، محبت اور دعا شامل ہوتی ہے (ویسے نو ڈاؤٹ میں بھی سپر کوکنگ ماسٹر ہوں ہاہاہا)۔

4۔زندگی میں اگر آپ کی محبت آپ کے ساتھ ہے تو پھر کسی بھی شے کی خواہش نہیں ہوتی۔ محبت کے بدلے اگر محبت ملے تو وہ چاہت ہی اصل پیار سنگھار ہوتی ہے۔

5۔دونوں عید کے دن گھر آئے مہمانوں کی خاطر مدارت کر کے میزبان بننا اچھا لگتا ہے (اور دعوت پر مہمان بننا بھی اچھا لگتا ہے۔ جی! یہ تو بالکل صحیح کہا)۔

6۔بچپن میں عیدی کا ریکارڈ بہت زیادہ بنتا تھا۔ اب چونکہ ابو جی، دونوں بہنوئی اور دو ماموں اور بھائی ہی عیدی دیتے ہیں، بھائی سے تو میں لڑ کر پچھلے سال کی نسبت اس سال ڈبل عیدی نکلواتی ہوں پھر چاہے وہ پیسے کم ہوں یا زیادہ میرے لیے بہت معنی رکھتے ہیں۔ جنہیں میں کنجوسی کے ساتھ استعمال کرتی ہوں (سچ بتا رہی ہوں بہت ہی زیادہ کنجوس ہوں میں ہاہاہا)۔

7۔میکے میں شروع سے ہر سال ایک ہی روٹین کی طرح عید منائی جاتی ہے جب کہ سسرال میں ہر لڑکی کو اپنی ہر عید ہی بہت زیادہ خوب صورت اور مکمل خوشیوں بھری لگتی ہے کیوں کہ وہ اپنے ہمسفر کے سنگ اپنے خوابوں کے محل کو سجاتی عید کے تمام دنوں کو خوش دلی سے مناتی ہے۔

8۔شادی بیاہ کے عام روٹین میں پہننے کے یا کسی بھی تہوار کے ڈریسز ہوں، وہ ہم اپنی ٹیلر صاحبہ سے ہی سلواتے ہیں جب میں سلائی کے پیسے ریڈی رکھتی ہوں تو وہ ڈریسز سینے میں لیٹ کر دیتی ہیں اور جب وہ ڈریسز کر بجھوا دیتی ہیں تو میں پیسے دینے میں لیٹ کر دیتی ہوں، ہاہاہا۔ خیر عید کا واحد ایسا ڈریس کہ جب میں شاپنگ پر جاؤں اور میری پسند کا رنگ اور سمپل اسٹائلش ڈریس مل جائے پھر چاہے وہ مہنگا ہو یا سستا میں وہی ڈریس عید کے لیے منتخب کرتی ہوں۔

9۔عید کی صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے امی کا ہاتھ چوم کر ان کے گلے لگتی ہوں۔ سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتی ان کی آواز کی چاشنی سے دل و روح میں سکون و راحت بھر جاتی ہے۔

10۔ عید کی صبح گہما گہمی اور رش سہانی شام ٹھنڈی خوشگوار عید اچھی لگتی ہے

وقت بیتتا جائے گا
تہوار آتے جائیں گے
صدیوں پر محیط جدائی مٹاتے
کیا تم لوٹ آؤ گے؟

افشاں علی.........کراچی

ہر آنگن میں خوشیوں بھرا سورج اترے
چمکتا رہے ہر آنگن عید کے دن

سب سے پہلے تو صالحہ آپا، نورین آپی اور تمام پیاری پیاری سی رائٹرز و قارئین بہنوں کو افشاں علی کی جانب سے عید الفطر کی شہد جیسی میٹھی میٹھی سی مبارک باد۔ دعا ہے کہ یہ عید خوشی و مسرت کا پیغام بن کر ہر آنگن میں اترے، (آمین)۔ اب حاضر ہیں عید سروے کے جوابات۔

1۔ عید از خود ایسا سچا اور خوشیوں بھرا لفظ ہے کہ مزید کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں بچتی، میں کسی خاص یا عام دن کی کوئی پلاننگ نہیں کرتی، کیوں کہ میرا ماننا ہے ہونا وہی ہے جو برحق ہے اور ہوتا وہی ہے جو بہتر ہے اور ویسے بھی اگر کوئی انسان کوئی خاص پلاننگ کرے اور وہ پلاننگ کامیاب نہ ہو تو دل پر از حد دکھ افسوس اور مایوسی کے بادل چھا جاتے ہیں، اس لیے میں باقاعدہ کوئی پلاننگ نہیں کرتی۔

2۔ اپنی فیملی کا اپنی سسٹر کا خیال آتا ہے اور خاص کر ان غریب یتیم مفلس بے سہارا لوگوں کا جن کے لیے یہ خوشیوں بھرا دن منانا بھی ممکن نہیں ہو پاتا، جن کے چہروں پر عید کی خوشیوں بھری مسکراہٹ کے بجائے دکھ و کرب کی پرچھائیاں و آنسو ہوتے ہیں۔

ہر کسی کے لیے کہاں ہوتی ہیں عید کی خوشیاں
مسرتیں لاتا ہے کہاں سب کے لیے عید کا چاند

3۔ عید الفطر ہو یا عید الاضحی دونوں عیدوں پر ہمارے یہاں شیر خورما ہی بنتا ہے جس کی ترکیب عموماً سب کو ہی ازبر ہوگی۔

4۔ ہائیں کن کے؟ یہ سوال پڑھ کر یہ ہی لفظ منہ سے نکلا کن کے......؟ وہ کیا ہے ناجی! ابھی ہماری زندگی میں ان کا شمار نہیں ہوا تو پھر ان کے گھر سے عیدی......؟؟

5۔ مہمان بننا اور میزبان بننا دونوں کے ہی اپنی اپنی جگہ مزے ہیں۔ مگر ہائے ری قسمت اب تک ہم میزبان ہی بنتے ہیں۔ مہمان بننے کی...... حسرت آہ......!!

6۔ عیدی کا نام سنتے ہی بچپن کی سنہری عیدیں یاد آجاتی ہیں یادگار عیدیں وعیدی تو بچپن کی ہوا کرتی تھیں۔ ذہن کا دروازہ بارہا کھٹکھٹانے پر بھی ہمیں اس سوال کا جواب ہی نہیں مل پایا تو بس اس عیدی کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے جس کا کوئی ریکارڈ ہی نہیں۔

7۔ گو کہ اس فرق سے اب تک ہم آشکار نہیں ہوئے پھر بھی اپنی بساط کے مطابق ہم اس سوال کا جواب دے رہے ہیں۔ عید جو نام ہے مسرت کا، شادمانی کا، خوشیوں کا، اصل عید تو اپنوں کے سنگ منانے میں مزہ ہے عید کے سچے اور حقیقی رنگ اس وقت نکھرتے ہیں جب ہمارے اپنوں کے دل مسرور ہیں، پھر چاہے وہ عید دیس میں منائی جائے یا پردیس میں، شہر میں ہو یا گاؤں میں، میکے میں ہو یا سسرال میں، دلوں میں جگہ ہو تو ساس بھی ماں بن جاتی ہے کے مصداق سسرال میں بھی میکے کی طرح عیدیں منائی جا سکتی ہیں اگر دلوں میں وسعتیں ہوں تو......

8۔ عید کے ڈریسز ہوں یا عام دنوں کے نا میں خود ڈیزائن کرتی ہوں نا ہی ٹیلر کے سپرد بلکہ یہ کام میری سسٹر کے حوالے ہوتا ہے۔ وہ ہی میری بیسٹ

ٹیلر و ڈیزائنر ہے۔

9۔ چونکہ اب تک ہم کنواروں کی فہرست میں شمار ہوتے ہیں اس لیے جواب بالکل سیدھا سا اور سادہ سا ہے کہ فیملی ہی کی پہلی وش لینے کی تمنا ہوتی ہے اور آفٹر میرڈ لائف...... (آہم آہم سمجھا کریں بھئی، ہمارا تو اشارہ ہی کافی ہے)۔

10۔ عید کا تہوار تو ہوتا ہی خاص ہے پھر کیا صبح اور کیا شام اس لیے عید کی صبح اگر البیلی سی ہوتی ہے تو شام سہانی سی۔

تو یہ تھے عید سروے کے جوابات۔ ہماری یعنی افشاں علی کی جانب سے امید ہے پسندیدگی کی سند پائیں گے۔ آخر میں ایک بار پھر دل کی گہرائیوں سے محبتوں کے سنگ عید الفطر کی ڈھیروں ڈھیر مبارکباد اپنی دعاؤں میں افشاں علی کو بھی شامل دعا رکھیے گا اور یہ شعر آپ سب کے نام

سجے الفاظ کم ہیں اور تمنائیں ہزار
مبارک ہو تم سب کو عید کی خوشیاں یار

ذارا صدف نصر.........کراچی

1۔ گھر کے لیے فانوس بنانے کا پلان ہے۔

2۔ I thing میری Mom کی ہمیشہ انہیں یاد رکھتی ہوں۔

3۔ مجھے بریانی بنانی اچھی لگتی ہے دنیا کے تمام فلیور ٹرائی کرنے کی خواہش ہے۔

4۔ ابھی تک عیدی سا کے گھر سے کچھ نہیں آیا، ایسا کچھ ہوا ہی نہیں دیکھو پھر بھی پیا کے گھر میں ہی ہے تو کائنات کی ہر شے آتی ہے۔

5۔ دونوں ہی اچھا لگتا ہے مہمان بھی میزبان بھی۔

6۔ Selected ہوگئی ہے اب تو عیدی کم ہی ملتے ہیں پھر بھی 4000۔

7۔ میکے میں عید انجوائے کی جاتی ہے بھرپور انداز میں اور سسرال میں عید انجوائے کرائی جاتی ہے۔ بس پھر پیا جی ہی ہوتے ہیں جو میری عید کا خوشگوار احساس بن کے میرے سامنے رہتے ہیں۔

8۔ خود ڈیزائن کرتی ہوں چونکہ آج کل مصروفیت عروج پر ہے تو لہٰذا ٹیلرز کی خوشامد کرنی ہے۔

9۔ وش اپنی پریوں کی رانحہ اور فیہا، اللہ انہیں اچھی پرسنالٹی عطا کریں تاحیات اسی طرح جیسے آج چمکتی ہیں میری ننھی پریاں۔

10۔ صبح سب سے زیادہ سہانی ایک نئی روشنی نیا خوشگوار احساس واہ کیا بات ہے تیری اے عید صبح۔

نائلہ طارق.........کراچی

السلام علیکم! صالحہ آپی، نورین، ردا کی تمام ساتھی مصنفین اور عزیز قارئین آپ سب کو رمضان المبارک کی بے حد مبارکباد اور ساتھ ہی پیشگی عید مبارک۔ عید سروے کے لیے جوابات حاضر ہیں۔

1۔ عید کے حوالے سے کوئی خاص پلاننگ نہ پہلے کبھی کی نہ اس بار کی ہے۔ عید کے حوالے سے جو تیاریاں اور آرائش و زیبائش کے لوازمات ہوتے ہیں بس وہی بروقت مکمل ہو جائیں، بہت ہے۔

2۔ اس بار تو عید بار بار ان کا خیالات لائے گی جن کے گھروں کے چراغ گل کر دیے گئے۔ بے شک سانحہ پشاور کے زخم دل میں تازہ رہیں گے۔ اللہ ان تمام متاثرہ والدین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

3۔ عید کی روایت کے مطابق شیر خرمے کی جگہ کوئی ڈش نہیں لے سکتی۔ عید کی صبح جب تک شیر خرمے کی میٹھی مہک نہ پھیلے عید کی خوشی ہی دوبالا نہیں ہوتی۔

4۔ اس سوال کی کیٹیگری میں فی الحال میں شامل نہیں (ظالم سوال)۔

5۔ عید کے دن میزبان بننا ہی اچھا لگتا ہے۔

6۔ عید کا ریکارڈ...... لگ بھگ اتنا تو بن جاتا

ہے کہ مایوسی نہ ہو۔
7۔اس سوال کا جواب بھی پہنچ سے دور (دوسرا ظالم سوال)۔
8۔عید کے ڈریسز ٹیلر کے آسرے پر ہی چھوڑنا پڑتے ہیں۔ رمضان اور عید کی تیاریوں کی مصروفیت کی وجہ سے۔
9۔کوئی خاص تمنا نہیں۔ عید کی پہلی وش سے آخروش بھی فرینڈز کی طرف سے ملتی ہے اسی میں خوش۔
10۔عید کی صبح بہت سہانی لگتی ہے ہمیشہ سے ایک الگ ہی رونق ہوتی ہے عید کی صبح کی۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تمام امتِ مسلمہ کو عید کی سچی خوشیاں نصیب کرے، آمین۔

رابعہ افضال..........کراچی

1۔میری سب سے پہلی پلاننگ ردا کے لیے عید کے حوالے سے اچھا سا افسانہ لکھنا ہے۔
2۔عید اپنوں کے صدا خوش رہنے اور کبھی نہ بچھڑنے کا خیال لاتی ہے۔
3۔فی الحال کوئی خاص ڈش یا مشروب ذہن میں نہیں ہے۔
4۔ابھی ہم سنگل ہیں (بس آپ سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے) ہاہاہا۔
5۔عید کے دن مہمان بننا بہت اچھا لگتا ہے۔ مہمان بن کر جو وی آئی پی پروٹوکول ملتا ہے اس کی تو کیا ہی بات ہے۔
6۔تقریباً 1500 روپے (باقی چھوٹوں کو عیدی جو دینی پڑتی ہے وہ بھی زبردستی چھین جھپٹ کر لیتے ہیں ورنہ کون کنگال ہونا پسند کرے گا، ہاہاہا۔
7۔فی الحال تو اس تجربے سے گزرے نہیں ہیں۔
8۔عید بہت اسپیشل تہوار ہے تو عید کے ڈریسز نہ ٹیلر کے آسرے پر چھوڑتی ہوں نہ خود اپنے آسرے پر عید کے ڈریسز کی ساری ذمے داری اپنی سسٹر کے سر ڈال کر خود مزے سے عید کا ویٹ کرتی ہوں۔
9۔پہلی وش اپنے پیرنٹس کی لیتی ہوں اور بہت خوشی ملتی ہے۔ آفٹر آل دنیا کا سب سے انمول رشتہ پیرنٹس کا ہے۔
10۔عید کی صبح اور شام دونوں ہی خاص ہوتی ہے مگر شام کی تو کیا ہی بات ہے۔ نانی کے گھر ایک اسپیشل دعوت اور سب کزنز کا مل کر ہلہ گلہ کرنا عید کی خوشیوں میں مزید چار چاند لگا دیتا ہے۔

ثناء کنول اللہ دتہ..........لودھراں

السلام علیکم قارئین! عید......! یہ لفظ سنتے ہی ہر طرف خوشی سی پھیل جاتی ہے، دل مسکرانے لگتا ہے پورے ایک سال بعد اس دن کی آمد انسان کو سرشار کر دیتی ہے مگر وہاں جہاں ہر طرف دکھ درد ہوں، تکلیف ہو، آنسو ہیں اور سسکیاں ہوں وہاں پر اس لفظ کی کچھ خاص اہمیت نہیں ہوا کرتی۔ وہاں نہ تو خوشی پھیلتی ہے نہ دل مسکراتا ہے اور نہ ہی کوئی احساس انسان کو چھو کر گزرتا ہے۔ مجھے تو اب یہ عید کا دن بھی عام سے دنوں میں سے ایک دن لگتا ہے۔ رنگ بے مزہ دکھ سے بھرا آنسو لیے ہوئے۔ پتا نہیں میری کیسی عجیب سی طبیعت ہے ہر عید پر سوائے دکھ بھری یادوں کے مجھے کچھ یاد ہی نہیں آتا اور اب اس دکھ میں ایک اور دکھ بھی شامل ہو گیا ہے تو سوائے یاسین کے مجھے کوئی یاد نہیں آئے گا۔ اس کا خیال ہی پہلا اور آخری خیال ہوگا۔ حنا آپی کی شادی سے پہلے تو وہ سویاں کسٹرڈ بریانی نمکین نوڈلز وہ خود بناتی تھیں اب ذمہ داری ہے مجھ پر تو یہ سب مجھے بنانا پڑے گا۔ (پتہ نہیں کیا ہوگا دل بے قرار کو چین اک پل نہیں) آئی تھنک مہمان بننا یاسین کے گھر اس طرح شاید میرے دکھوں میں ہی کمی ہو۔ مجھے میزبان سے زیادہ مہمان بننا پسند ہے۔ ٹھیک سے تو یاد نہیں مگر اچھی خاصی عیدی مجھے مل ہی جاتی ہے۔ ویسے ابھی میں سسرال تو گئی نہیں مگر بہنوں کی زندگی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ میکے کی عید زیادہ اچھی ہوتی ہے سسرال میں آپ کو سب کا خیال کرنا پڑتا ہے اور میکے میں صرف اپنا۔ بچپن سے لے کر آج تک ہر فنکشن ہر تہوار کے کپڑے میری امی اور حنا آپی خود تیار کرتی ہیں جو کہ کسی بوتیک سے کم نہیں ہوتے۔ صرف اور صرف یاسین۔ وہ ہو جس کے منہ سے میں سب سے پہلے عید مبارک سنوں۔ جس کا چہرہ میری آنکھیں سب سے پہلے دیکھیں۔ ہائے ری قسمت۔ میری نظر میں دونوں ہی اچھی ہوتی ہیں۔ ان کے لیے جو انہیں دل سے مناتے اور میرا دل وہ تو دکھوں کے جنگل میں ایسا گم ہوا ہے کہ خوشی کا کوئی احساس ہی نہیں ہوتا۔

آپ سب کو میرے جواب پڑھ کر کافی حیرت ہوگی نا مگر میں بھی کیا کرتی جھوٹ مجھ سے لکھا نہیں گیا اور پورا سچ میں لکھ نہ سکی۔ سب دوستوں کو بہت بہت عید مبارک ہو۔ صبح سے ایک شعر بار بار زبان پر آ رہا ہے سو لکھ رہی ہوں

ہاتھوں کی لکیروں کو کھرچ ڈالا ہے فراز
کسی عامل نے کہا تھا وہ پرایا ہو گا

افشاں آفتاب..........کراچی

1۔عید کے لیے پلاننگ تو کوئی خاص نہیں ہے۔ عید کی شاپنگ باقی ہے۔ میاں جی جو سوٹ لا کر دیں گے وہ پہنوں گی کیونکہ میرے میاں جی کی چوائس اچھی ہوتی ہے۔
2۔عید ہمیشہ ہی ان کا خیال لاتی تھی۔ شادی سے پہلے تیار ہو کر افسردہ ہو جاتی تھی لیکن اب بڑے مزے سے تیار ہو کر داد وصول کرتی ہوں۔
3۔عید کے حوالے سے میرے پاس مینگو ود فریش کریم کی ترکیب ہے آپ بنائیں اور انجوائے کریں۔ مینگو چار عدد، فریش کریم ایک پیکٹ، چینی حسب ضرورت۔ مینگو کو چھوٹے چھوٹے کیوبز میں کاٹ لیں اور اس میں چینی اور فریش کریم کو شامل کریں اور اچھی طرح مکس کریں۔ ٹھنڈا کر لیں اور سرو کریں۔
4۔ان کے گھر سے پہلی عید پر میرا ڈریس، میری جیولری، فٹ ویئر اور میری پوری فیملی کے لیے گفٹس، ڈھیر سارے فروٹس اور مٹھائیاں آئی تھیں۔
5۔مجھے میزبان بننا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ ویسے بھی فرسٹ ڈے میرے سسرال میں میرے ان کے چچا کی فیملی آتی ہے تو اچھا لگتا ہے۔
6۔عیدی ٹھیک ٹھاک مل جاتی ہے مگر اتنی نہیں کہ ریکارڈ بن سکے۔
7۔فرق تو ہے۔ میکے میں ناشتے کے بعد ہمارے یہاں سب سو جاتے ہیں۔ کیوں کہ گیسٹ اور ابو کے فرینڈز شام تک آتے ہیں مگر سسرال میں گیسٹ صبح ہی آتے ہیں تو مصروفیت زیادہ ہوتی ہے۔
8۔شادی سے پہلے اپنا ڈریس خود ڈیزائن کیا کرتی تھی۔ سیتی بھی تھی مگر شادی کے بعد ٹیلر کو دے کر جان چھڑا لیتی ہوں۔
9۔عید پر میری خواہش ہوتی ہے کہ میرے ہسبینڈ مجھے سب سے پہلے وش کریں اور وہی سب سے پہلے مجھے وش کرتے ہیں۔
10۔عید تو خوشیوں کا پیغام لاتی ہے۔ جب آپ خوش ہوتے ہیں تو صبح ہو یا شام سارا وقت ہی سہانا اور خوب صورت لگتا ہے۔

......☆......

ردا کی ڈائری

صبا سحر کی ڈائری سے

عید اب کے برس نہیں آئی

ہے وہی آسماں، زمین وہی
ماہ و انجم اسی طرح روشن
کہکشاں اب بھی مسکراتی ہے
پھول کلیاں مہک رہی ہیں یونہی
بعد مدت کے سارے پردیسی
اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے
ہر طرف رنگ و بو کا میلہ ہے
اور تنہا میں اپنے کمرے میں
کب سے بیٹھی ہوں اور سوچتی ہوں
جانے کیا بات ہے کہ گھر میں میرے
جو گزشتہ برس تھی رونق اب
وہ کہیں بھی نظر نہیں آتی
ہے فضا میں عجیب سناٹا
ہاں فقط ایک تیرے جانے سے
ایسا محسوس ہو رہا ہے مجھے
رت خوشی کی ہے ہر طرف آئی
صرف چھوٹے سے میرے آنگن میں
عید اب کے برس نہیں آئی
عید اب کے برس نہیں آئی

شمائلہ ملک کی ڈائری سے

ایک نظم

بھیڑ دیکھی تو خیال آیا ہمیں
جانے کب بچھڑے ہوئے لوگ ملیں
جی میں آیا ابھی تم سے کہیں
عید کا چاند مبارک ہو تمہیں
ہم نہیں خاموش ہمیں ڈر ہے یہی
لب کھلیں گے تو پکاریں گے تمہیں
تم سے بچھڑے ہوئے برسوں بیتے
تم سے کہنا ہے یہی آج ہمیں
ہاں نہ بھول جانا ہم کو
چاند کو دیکھ کر اگر یاد آئیں

نوشین مدثر کی ڈائری سے

عید مبارک

ہجر کے لمحوں کی ساری
اذیت اس پل ہوگئی دور
تم نے جب دھیرے سے چاہت بھرے
وصل لمحوں کی مہک کے ساتھ کہا
عید مبارک

عانیہ نیازی کی ڈائری سے

فاطمہ نجیب کی نظم

عید آئی گلاب مہکے
ہماری آنکھوں کے خواب مہکے
مہکتی کلیوں کو دیکھ کر پھر
محبتوں کی وہ سوئی خواہش
جنم کے بیدار ہوگئی ہے
گلوں کے شانے پر سر ٹکا کے
ہوا بھی سرشار ہوگئی ہے
وہ بھولے بسرے تمام لمحے
وہ ساعتیں وہ تمام جذبے
جو وقت کی دھول میں اٹ گئے تھے
خود اپنے اندر سمٹ گئے تھے
وہ لے کے انگڑائیاں جی اٹھے ہیں
ہماری آنکھوں میں جھانکتے ہیں
اے کاش دل کی ویران زمیں پر
محبتوں کی پھوار برسے
بری برکھا کہاں مقدر
دو بوند ہی تیرا پیار برسے
تو دیکھنا پھر کہ جان جاناں
ہماری آنکھوں کے ٹمٹماتے
چراغ یوں لو دے اٹھیں گے
کہ چاند سورج مدھم لگیں گے
دل کے غنچے یوں کھل اٹھیں گے
کہ پھول بھی مسکرا کے اپنی
قباؤں کو پھر سمیٹ لیں گے

کیتی آراء کی ڈائری سے

علامہ اقبال کی ایک خوب صورت غزل

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تیری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی
کھنچے خود بخود جانب طور موسیٰ
کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

ریما نور رضوان کی ڈائری سے

سباس گل کی غزل

عید کا دن اور ہم جاناں
آنکھ پھر سے ہوئی نم جاناں
روز عید تو سبھی آ کے عید ملتے ہیں
ہم سے ملتا ہے تیرا غم جاناں
وہی لمحہ بنے گا عید اپنی جب
گھر میں قدم رکھو گے جاناں
ہم زمین پر اور چاند افق پر تنہا
فاصلہ یہ ہو گا کیسے کم جاناں
گئے برس کی طرح پھر سے عید آئی ہے
ڈھونڈتی ہے تمہیں چشم نم جاناں
دیر اب بھی نہیں ہوئی آؤ
عید مل کر منائیں جاناں

روشنی فیصل کی ڈائری سے

امجد اسلام امجد کی ایک غزل

تم سے بچھڑ کر ملنا اچھا لگا
ہم سے تم تک کا فاصلہ اچھا لگا
غصے سے گھور کر تمہارا دیکھنا
پھر کھلکھلا کے ہنسنا اچھا لگا
تمہارا آنکھوں سے آنکھیں ملا کر دیکھنا
یوں شرارت سے اچھا لگا
تمہارے ہونٹوں پہ پھیلتی
بے ساختہ سی مسکراہٹ دیکھنا اچھا لگا
پوچھا مجھ سے میں کیسا لگا
تمہارا یوں پوچھنے کا انداز اچھا لگا

......☆......

نورین ملک

اشعار

درخشاں ضیاء.............. کراچی
خط میں لکھا ہے عید کب ہو گی
ہم کو تاریخ لکھ کر بھجوائیں
چونکہ جھگڑا تھا اس لیے ہم نے
لکھ دیا آپ جب بھی آجائیں

عانیہ نیازی.............. ربوہ
تارے اترے جب پھیلایا دامن کو
عید کے چاند میں دیکھا میں نے ساجن کو
چاند رات کی مہندی مجھ سے کہتی ہے
تم بھی اک پیغام لکھو نا ساجن کو

حنا علی.............. سیالکوٹ
عید آئی ہے تو آنکھوں میں اتر آئے ہیں
ہجر کی اوس میں بھیگے ہوئے پنچھی کتنے

رابعہ منیر.............. سرگودھا
اک بچھڑے ہوئے انسان کی رفاقت کے بغیر
گلشن دل میرا ویران رہا عید کے دن
اے غم دوست تجھے میری وفاؤں کی قسم
میری پلکوں پر ستارے نہ سجا عید کے دن

نوشین مدثر.............. لاہور
ہلال عید دیکھ کے مانگتی رہی ہوں جو دعا
اب کی بار شاید وہ بااثر ہو جائے

امبرین حیدر.............. اسلام آباد
میں تیری راہ میں بکھر جاؤں خوشبوؤں کی طرح
میرے لیے تو بس یہی ہے منتہائے عید

نگہت توقیر.............. چیچہ وطنی
جس سے چاند تیرے بام پر ابھرا ہو گا
تو نے اس پل میں اسے غور سے دیکھا ہو گا
عید کے کارڈز تیری میز پر بکھرے ہوں گے
اور سرہانے کوئی پھول بھی رکھا ہو گا

حیا سحر.............. ہارون آباد
اس نے بھیجے ہیں چاہت میں لپٹے ہوئے
پھول، خوشبو، حنا، چوڑیاں عید پر
کاش وہ آجائے جس کے ہیں منتظر
میرا دل بام و در کھڑکیاں عید پر

نور بانو.............. کوئٹہ
سچ سچ اگر ہے الفت لوٹ آؤ جانِ جاں
لگاتا ہے اور آگ یہ بھیجا ہوا ساماں
یہ کیا ہر دفعہ ہی دوری میں عید ہو
تحفہ دو تو یہ دو جو تحفہ دید ہو

اریشہ.............. کمالیہ
کاش عید سعید کے حسین لمحوں میں
میری ذات گم گشتہ بھی تجھے یاد آئے

عمازہ شکیل.............. کوہاٹ
چاک داماں کو جو دیکھا تو ملا عید کا چاند
اپنی تصویر کہاں بھول گیا عید کا چاند
ان کے ابروئے خمیدہ کی طرح تیکھا ہے
اپنی آنکھوں میں بڑی دیر چھپا عید کا چاند

نیناں تبسم.............. راولپنڈی
وفا کا سندیس لے کر اترے تمہارے آنگن میں
گواہ رفاقتوں کا محبتوں کا بن کر ہلال عید
تمہارے روز و شب یونہی فروزاں رہیں ہر دم
ہر شب، شب برات ہو ہر روز روز عید

سپاس گل.............. رحیم یار خان
سنو تم چاند جیسے ہو
مگر کہنا نہیں جانا

فرزانہ شوکت.............. کراچی
تم مجھ سے بچھڑ کر میری خواہش نہ رہنا
جب دھوپ کو سہنا ہے تو بارش میں نہ رہنا
سچائی کے رستے میں نہیں سائبان کوئی
چلنا ہے تو پھر چھاؤں کی خواہش میں رہنا

راؤ تہذیب حسین تہذیب.............. رحیم یار خان
اس طرح بچھڑے چمن سے طائرا نہ دلربا
ایک ویرانی سی اب اس گلشنِ ہستی میں ہے
کیا کوئی گل پھر فدا شانِ چمن پر ہو گیا
کیسی یہ آواز رونے کی چمن بستی میں ہے

سعدیہ عابد.............. کراچی
میں اگرچہ آخری زمانے میں پیدا ہوا ہوں
لیکن وہ کام کروں گا جو میرے پیشرو نہ کر سکے

سیدہ بشارت شاہ.............. کراچی
ڈرنے لگے ہیں ان سے ہم خاک نشین لوگ
دیتے ہیں بچھڑوں کو اذیت حسین لوگ

ریما نور رضوان.............. کراچی
سنا ہے کوئی اور چاہنے لگا ہے تمہیں جان
ہم سے بڑھ کر چاہے تو بس اسی کے ہو جانا

امینہ رؤف.............. جہلم
یہ بارش کی ادا بھی کتنی ظالم ہے مسکان
یاد دلاتی ہے بڑی شدت سے اپنے بچھڑوں کی

مصباح مسکان.............. جہلم
بدلی نہیں تدبیر سے کبھی کسی کی تقدیر مسکان
جو ہو رب کو منظور وہ ہوتا ہے ضرور

سعدیہ اقبال.............. کراچی
مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں
میری آہٹوں سے نہ سوال کر
میری سانسیں کب کی ہیں تھم چکیں
تم ہی تو ہو میرے زوال گر

ہاجرہ امین خان ہاجی.............. کراچی
ان کے روٹھنے کی یہ ادا بھی کیا خوب ہے ہاجی
آنکھ پر ہاتھ رکھ کے کہتے ہیں ہم خفا ہیں آپ سے

امبر ہاشمی.............. کراچی
یاد رکھنا ٹوٹے اگر ہم تو بکھر تم بھی جاؤ گے
ہم نے خود میں تم کو پرویا ہے تسبیح کی طرح

رمشا.............. کراچی
ملنے کا وعدہ منہ سے تو ان کے نکل گیا
پوچھی جگہ جو میں نے کہا ہنس کے خواب میں

سدرہ شاہین.............. خانیوال
لب پر مسکان لاتے کیوں ہو؟
ہم کو روز ستاتے کیوں ہو؟
کردو نا اظہارِ محبت
شاہین سے کتراتے کیوں ہو؟

نوشین مدثر.............. لاہور
یہ کیا ہوا کہ بھرے آسمان کے آنگن میں
بچھڑ گیا وہ ستارہ جو ہمارے نام کا تھا
بڑھا کے اس سے راہ رسم یہ سوچتے ہیں
وہی بہت تھا رشتہ جو دعا سلام کا تھا

رابعہ منیر.............. سرگودھا
آئینہ دیکھ کے خوش ہیں میری آنکھیں بے حد
کہ میرے چہرے میں شباہت میری ماں کی ہے

......☆......

اس ماہ میں

اس ماہ کا اقتباس

عظیم ہستی ماں کے نام

ابا جی مارتے تھے تو امی بچا لیتی تھیں۔ ایک دن میں نے سوچا امی پٹائی کریں گی تو ابا جی کیا کریں گے؟ یہ دیکھنے کے لیے میں نے امی کا کہنا نہ مانا۔ انہوں نے کہا ”بازار سے دہی لا دو۔“ میں نہ لایا۔ انہوں نے سالن کم دیا میں نے زیادہ پر اصرار کیا۔ انہوں نے کہا۔ ”پیڑھی کے اوپر بیٹھ کر روٹی کھاؤ۔“ میں زمین پر دری بچھا کر بیٹھ گیا۔ لہجہ بھی گستاخانہ! مجھے پوری توقع تھی کہ امی ضرور ماریں گی مگر!! انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر کہا۔ ”ماں صدقے پتر تو بیمار تو نہیں؟“ اس وقت میرے آنسو تھے کہ رکتے ہی نہیں تھے۔

(مرزا ادیب کی کتاب ”مٹی کا دیا“ سے انتخاب)

سیدہ فرزانہ حبیب فرزین۔ کراچی

اس ماہ کے آنسو

(غم اور خوشی کے ترجمان)

آنسو کیا ہیں؟ چار حروف پر مشتمل یہ لفظ یہ نمکین پانی کے چند قطرے جن کو ہم آنسو کہتے ہیں۔ اپنے اندر غم اور خوشی دونوں سمیٹے ہوئے ہیں۔ موتی ہیں چمکنے والے بہنے والے گرم آنسو۔ انسان کی فریاد ہیں پرانی یادوں کے ترجمان ہیں۔ یہ آنسو انمول خزانہ ہیں۔ معصوم و پاکیزہ مستور و دوشیزہ کے حسن سے زیادہ حسین حور سے زیادہ مکنون، دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلنے والا آب حیات کا چشمہ، خواہشات کے صحرا میں نخلستان کا مژدہ۔ یہ آنسو جہاں زیست انسانی اور اس سے پیوستہ جذبات کے ترجمان ہوتے ہیں وہیں یہ کسی شخص کی بصیرت اور بے ثباتی کے آئینہ دار بھی ہوتے ہیں۔ آنسوؤں کی قیمت اس کے ماخذ سے مربوط ہے کسی کی آنکھ سے نکلے ہوئے آنسو موتی کے مترادف اور کسی کے آنسو برکھا رت کے قطرے کی مانند بے وقعت و بے معنی کسی کے آنسوؤں کے چہرے سے گرنے سے پہلے ہی ہاتھ بڑھا کر تھاما جاتا ہے۔ تو کسی کے آنسوؤں کو کئی ہاتھ منتوں سے برسنے پر مجبور کرتے ہیں۔ بہر حال آنسو چاہے موتی نما ہوں یا کسی برکھا رت کی برسات کے ہم چشم، یہ بہر حال میں موسم دل کی نمائندگی کرتے ہیں۔

آنسو بھی پھولوں کی مانند ہیں جو غم اور خوشی دونوں میں ہی انسان کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ مختلف انداز میں آنکھوں سے بہتے ہیں۔ کسی کے بچھڑنے پر کسی کی جدائی پر یا کسی کے اچانک مل جانے پر یہ آنسو موتیوں کی طرح ہماری آنکھوں سے بہنے لگتے ہیں۔

افشاں علی۔ کراچی

اس ماہ کا اشتہار

ایک عدد دل کا تاج محل ویران ہے، جسے سابقہ مکین ویران صحرا بنا کے راہ عدم اختیار کر گئے اگر کوئی وفا پرست اسے دوبارہ سرسبز و شاداب بنا سکتا ہے یا بنانے کا خواہش مند ہے تو فوراً اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی درخواست کے ساتھ حاضر ہو۔ چند شرائط حاضر خدمت ہیں۔

☆ تاج محل کے اندر ویران باغیچوں میں تا عمر رفاقت اور وفا کی شجر کاری کرنا آپ کی ذمہ داری ہوگی۔

☆ پیار و محبت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے والے حضرات سے معذرت۔

☆ بے پروا حضرات بھی درخواست دینے سے اجتناب کریں۔

☆ دل کے تاج محل میں بیک وقت لاتعداد لوگ رہ سکتے ہیں تاکہ دل میں رہنے والے حضرات میں نفرت پیدا نہ ہو۔

☆ اپنے کمرے کی دیواروں پر اپنا نام لکھ سکتے ہیں مگر ذات اور ایڈریس لکھنے کی قطعی اجازت نہیں دی جائے گی۔

☆ دل کے کمرے میں دکھوں کی ہنڈیا بھی پکا سکتے ہیں مگر مستقل کچن بنانے کی اجازت نہیں ہے۔

☆ دل کے تاج محل میں محبت کا کھیل اور دوستی کی آنکھ مچولی کھیل سکتے ہیں مگر کرکٹ، تاش، فٹ بال جیسے کھیلوں سے مکمل پرہیز کرنا ہوگا۔

☆ دل کے اندر موجود محبت کے پلیٹ فارم پر زندگی کا جوا کھیل سکتے ہیں تو آئیے تشریف لائیے۔ دل آپ کا منتظر ہے۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اس ماہ کی اچھی بات

ظاہری صفائی آپ کو ہر دل عزیز بناتی ہے اور باطن کی صفائی آپ کو دل بنانے والے اللہ کے قریب کر دیتی ہے اس لیے ظاہر کی نہیں باطن کی صفائی پر توجہ دیجیے کہ باطن کی خوب صورتی ظاہر کو خود ہی سنوار دیتی ہے۔

سعدیہ عابد۔ کراچی

اس ماہ کا مزاحیہ قطعہ

پیش لاکٹ کیا تو فرمایا
یہ تو مجھ سے بھی خوبصورت ہے
دیا دل تو بولیں رہنے دو
اس تکلف کی کیا ضرورت ہے

حنا علی۔ ملتان

اس ماہ کچھ خاص

☆ خون کا رشتہ کتنا ہی اذیت ناک کیوں نہ ہوتا دم آخر ہمارے احساسات کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔

☆ کسی کے ساتھ بداخلاقی کا مظاہرہ کرنے والا مقابل سے زیادہ اپنا نقصان کرتا ہے۔

☆ ہر کام صرف اس وقت تک مشکل لگتا ہے جب تک کہ اس کو سرانجام دینے کے لیے پہلا قدم نہ اٹھا لیا جائے۔

☆ زندگی میں ہر کام نہایت سوچ سمجھ کر کیجیے کیوں کہ زندگی کے کسی موڑ پر اس کے نتائج آپ کے لیے اہمیت اختیار کر جائیں گے۔

☆ گفتگو سوچ کے تبادلے کا نام ہے۔

☆ اگر آپ دوسروں سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں تو بہتر یہی ہے کہ لوگوں سے دور رہا جائے تاوقت یہ کہ آپ ان کے خلاف خود میں مدافعت پیدا نہ کریں۔

☆ جہاں تلواریں نہ لڑ سکیں وہاں اذہان کی جنگ ہوتی ہے۔

☆ آپ دوسروں سے واقف ہوں نہ ہوں لیکن خود کو ضرور جانتے ہیں۔

☆ ہر چیز ثابت نہیں کی جا سکتی۔

☆ اگر آپ معافی کا مطلب سمجھنا چاہتے ہیں تو ایک ایسے شخص کو معاف کرنے کی سعی کر کے دیکھیں جو آپ کی کردار کشی کا مرتکب ہوا ہو آپ جان جائیں گے کہ معاف کر دینے کا اجر اتنا زیادہ کیوں رکھا گیا ہے۔

☆ ضروری نہیں ہر دکھ کو اشتہار بنا لیا جائے۔ ذاتیات کو یہ نام اسی لیے دیا گیا ہے کہ یہ شخص اپنے آپ تک محدود رکھی جاتی ہیں۔

عانیہ نیازی۔ ربوہ

اس ماہ کی نظم

باہر دسمبر کی دھوپ ہے
اور کمرے میں
تیری یاد کے سرمئی بادل چھائے ہیں
مجھ کو اذنِ رہائی دے
تیری یادوں کے معبد میں
مدت ہوگئی دوزانو ہوں
دھوپ کا ذائقہ بھول گیا ہوں

(عافر شہزاد)
نوشین مدثر۔ لاہور

اس ماہ کا فلسفہ

پانی سے آگ بجھ سکتی ہے، چھتری سے دھوپ رک سکتی ہے۔ لکڑی سے دوسرے جانور رک سکتے ہیں۔ ہر بیماری کے لیے ایک دوا ہے۔ ہر گناہ کی تلافی کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ ہے لیکن احمقوں کی حماقت کسی طرح دور نہیں ہو سکتی۔

امبرین حیدر۔ اسلام آباد

اس ماہ کا سوری

اب مگر کچھ بھی نہیں
کچھ بھی نہیں ہو سکتا
اپنے جذبوں سے یہ رنگین شرارت نہ کرو
کتنی معصوم ہو
نازک ہو
حماقت نہ کرو
بارہا تم سے کہا تھا
کہ محبت نہ کرو!

(وصی شاہ)
سلمیٰ وحید۔ خانیوال

اس ماہ کی ہری مرچیں

☆ کیبل کے سائے میں پلنے والے محمد بن قاسم یا ٹیپو سلطان نہیں بلکہ شاہ رُخ اور عامر خان بنیں گے۔

☆ جس شادی کی مووی نہ بن رہی ہو اس شادی میں شریک لڑکیاں ایسے لگتی ہیں جیسے صدیوں کی بیمار ہوں۔

☆ عورت ایک جھوٹا آنسو بھی بہا دے تو مرد قربان ہونے کو تیار ہو جاتا ہے، پھر بھی صنفِ نازک کو شکوہ رہتا ہے کہ مرد وفادار نہیں۔

☆ عورت کو زبان درازی کا طعنہ دینے والے اس کی ایک لمحے کی خاموشی پر تڑپ کر رہ جاتے ہیں۔

☆ بھائی کے پاس بہن کے لئے وقت نہیں جبکہ دوسرے کی بہن کے لئے وقت ہی وقت ہے۔

☆ مرد ہر حال میں رعب ڈالنا چاہتا ہے خواہ باپ ہو، بھائی ہو یا خاوند۔

نور بانو۔ کوئٹہ

اس ماہ کی اچھی بات

اگر کوئی تم سے ناراض ہو اور اُسے اس بات کا غرور ہو کہ تم اُسے منالو گے، تو اس کے غرور کو ٹوٹنے مت دینا۔

شازیہ علی...... گجرات

اس ماہ کا لطیفہ

مریض: "میں بہت خوش رہتا ہوں، نیند سکون سے آتی ہے، زندگی میں امن ہی امن ہے، ہر کام میں دل لگتا ہے، کوئی پریشانی نہیں، ایسا کیوں ہے ڈاکٹر صاحب؟"

ڈاکٹر: "میں آپ کی بیماری سمجھ گیا ہوں جناب! آپ کی زندگی میں وٹامن She کی شدید کمی ہے۔"

بسمہ علی۔ سکھر

☆......☆



حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"جس نے میری کسی ایسی سنت کو زندہ کیا جو میرے بعد مٹ چکی تھی تو اس کو ان لوگوں کے ثواب کے برابر اجر ملے گا جنہوں نے اس پر عمل کیا اور ان کے ثواب میں بھی کچھ کمی نہیں ہوگی اور جس نے کوئی بدعت کا کام ایجاد کیا جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ پسند نہیں فرماتے تو اس کو ان لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ ملے گا جنہوں نے اس پر عمل کیا اور ان کے گناہوں میں کچھ کمی نہیں ہوگی۔" (ترمذی)

رسول کریمؐ سورج ڈھلنے کے بعد ظہر کی نماز سے پہلے 4 رکعت (سنت) پڑھا کرتے اور آپؐ نے فرمایا: "یہ ایسا وقت ہے جس میں آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور میں پسند کرتا ہوں کہ اس وقت میرا نیک عمل (نماز پڑھنا) اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہو"۔ (ترمذی)

حضرت عمران بن حسینؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اپنے مومن، تنگ دست، سوال سے بچنے والے بال بچوں والے بندے سے محبت فرماتا ہے۔"

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نادار مومن دولت مندوں سے آدھا دن یعنی پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے۔" (صحیح مسلم)

سیدہ نورین۔ کراچی

حکایت

عربی کی ایک حکایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے مدین گئے تو انہیں بخار نے آلیا اور اس کے بعد بھوک ستانے لگی تو انہوں نے دعا مانگی۔

"اے میرے رب! میں مسافر بھی ہوں، مریض بھی ہوں اور میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

اللہ جل شانہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے موسیٰ (علیہ السلام) کیا تو جانتا ہے کہ غریب کون ہے۔ مریض کون ہے اور بغیر مال والا کون ہوتا ہے؟"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ "اے میرے پروردگار مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "غریب وہ ہے جس کا مجھ جیسا پروردگار نہ ہو۔ مریض وہ ہے جس کا مجھ جیسا طبیب نہ ہو اور بغیر مال والا وہ ہے جس کا مجھ جیسا کارساز نہ ہو۔"

نوشین مدثر۔ لاہور

مہکتی کرنیں

☆ جب ہم کسی سے رشتہ جوڑتے ہیں تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے بعد میں وجہ ختم ہو جاتی ہے، رشتہ رہ جاتا ہے۔

☆ بعض لوگوں کی زندگی میں اگر غم بڑھ جائیں تو قہقہوں میں شدت آجاتی ہے۔ کبھی شعوری طور پر اور کبھی لاشعوری طور پر۔

☆ فاصلے بڑھ جائیں تو دلوں کے بندھن کمزور پڑتے پڑتے کبھی کبھی ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔

☆انتظار مرتا نہیں، آنکھوں میں جم جاتا ہے ہاں بس آنکھیں مرجاتی ہیں۔

☆اکثر محبتیں اس لیے ضائع ہو جاتی ہیں کہ ہم غلط انسان کو سونپ دیتے ہیں۔

☆رشتے جب اذیت کے سوا کچھ نہ دیں تو ان سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے خواہ وقتی ہی سہی۔

☆میں نے دو طرح کے لوگوں سے دھوکا کھایا ہے ایک وہ جو میرے اپنے نہیں تھے اور ایک وہ جو میرے بہت اپنے تھے۔

دھنک ناز۔کراچی

کبھی کبھی

کبھی کبھی زندگی میں صحیح آدمی کا انتظار اسی طرح ہے جیسے ایئرپورٹ پر کھڑے ہو کر ٹرین کا انتظار کیا جائے۔

امبرین حیدر۔اسلام آباد

فرق

صورت اور سیرت میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ صورت دھوکا دیتی ہے جب کہ سیرت پہچان کراتی ہے۔

مصباح مسکان رؤف۔جہلم

حضرت علیؓ کے اقوال

☆مشکلات ہمیشہ بہترین لوگوں کے حصے میں آتی ہیں کیوں کہ وہ اس کو بہترین طریقے سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

☆دنیا اس کو یتیم سمجھتی ہے جس کے ماں باپ نہیں ہوتے مگر میں اس کو یتیم سمجھتا ہوں جس کے اچھے دوست نہ ہوں۔

☆بیکاری میں عشق بازی یاد آجاتی ہے۔

☆عقیدہ میں شک رکھنا شرک کے برابر ہے۔

☆موت ایک بے خبر ساتھی ہے۔

☆زمانہ کے پل پل کے اندر آفات پوشیدہ ہیں۔

☆معافی نہایت اچھا انتقام ہے۔

امینہ مصباح۔جہلم

وہ بیتے دن یاد ہیں......!

زمانہ واقعی بدل چکا ہے۔اب تو ہر پل بیتے دن یاد آتے ہیں۔بچپن میں جب ہم چھوٹے تھے تب ہم کاکے تھے اور آج بھی ہم نام کے کاکے ہی ہیں۔ جب ہم واقعی چھوٹے تھے تو محلے میں کوئی امیر خاندان بکرا قربانی کے لیے خریدتا تو سب لوگ ان سے پوچھتے۔''بھائی صاحب بکرا کتنے میں خریدا؟'' اور وہ کہتے۔''2 ہزار میں لیا ہے۔'' یہ بات پورے محلے میں پھیل جاتی اور اگلی عید تک قربانی کے بکرے کا چرچا رہتا۔وقت بدلا، ہزار والا بکرا 20 ہزار میں بدل گیا جب کہ چرچے والی بھی نہ ہوئی۔

اب جدید زمانے میں لوگ بکرے کو تو نہیں البتہ آٹے کے تھیلے کو نایاب بنا بیٹھے ہیں۔کل ایک نوجوان آٹے کا تھیلا لے کر گزرا تو سارے محلے نے پوچھا۔''بھائی کتنے کا لیا اور کہاں سے لیا؟'' یہ سن کر مجھے بچپن والا بکرا یاد آگیا۔اب بکرا تو مل جاتا ہے آٹے کا تھیلا نہیں ملتا۔روٹی نہیں مل رہی بکرا مل رہا ہے۔ہمارے ملک کا تو امریکہ سے بھی زیادہ نخرہ ہو گیا ہے۔آٹے کی قلت ہے اور بکرے کی فراوانی۔

پچھلے زمانے میں ساس اور بہو، ماں بیٹی کے روپ میں ایک دوسرے کا خیال رکھتی تھیں۔جدید زمانے میں بھارتی چینلو نے ساس، بہو کو دشمن کے روپ میں پیش کر کے لوگوں کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ماں ہر روپ میں رحمت اور نعمت ہے اور رہے گی۔بہو ہر روپ میں عزت اور پیار کے قابل رہی ہے اور رہے گی۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ساس اور بہو ایک دوسرے کی عزت کریں۔انڈین ڈراموں پر لعنت بھیجیں اور گھر کو جنت بنائیں۔ ماضی میں بھی گھر بار کے بندھن میں بندھے تھے اور آج بھی بندھ سکتے ہیں صرف خلوص اور محبت سے۔

ایس امتیاز احمد۔کراچی

خوشبو

☆اخلاق وہ چیز ہے جس کی قیمت کچھ نہیں دینی پڑتی مگر اس پر انسان خریدا جا سکتا ہے۔

☆خوشی انسان کو اتنا نہیں سکھاتی جتنا غم۔

☆جن کا کوئی اچھا دوست نہیں وہ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح ہوتے ہیں۔

☆جس دل میں برداشت کی ہمت ہو وہ کبھی شکست نہیں کھاتا۔

☆خاموشی ایسا درخت ہے جس پر کبھی کڑوا پھل نہیں لگتا۔

☆ذہانت ایسا پودا ہے جو محنت کے بغیر نہیں لگتا۔

☆انسان کو خاک سے آسمان پر پہنچا دینے والی اس کی دعا ہی ہے۔

☆بے شک مشکل وقت بتا کر نہیں آتا مگر سمجھا کر اور سکھا کر بہت کچھ جاتا ہے۔

فرزانہ شوکت۔کراچی

قطعہ

میرے وطن کے سپاہی ہیں جب تلک زندہ
بقا پہ پاک وطن کی نہ آنچ آئے گی
یہ وہ وطن ہے جسے جانیں لٹا کے پایا ہے
وفا کی خوشبو نہ اس کی فضا سے جائے گی

سہاس گل۔رحیم یار خان

شرط

ایک انگریز اور ایک آئرش تھیٹر میں فلم دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ فلم میں ایک سین آتا ہے کہ، ایک شخص ایک بدکے ہوئے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور گھوڑا بہت تیز دوڑ رہا ہوتا ہے۔انگریز فوراً چیخ کر کہتا ہے یہ ضرور گر جائے گا۔آئرش بھی چیخ کر کہتا ہے کہ نہیں گرے گا۔دونوں میں شرط لگ جاتی ہے اور تھوڑی دیر بعد وہ آدمی گھوڑے سے گر جاتا ہے۔انگریز ہنستے ہوئے بولتا ہے دیکھا میں نے کہا تھا ناں یہ گر جائے گا۔آئرش منہ لٹکاتے ہوئے کہتا ہے۔''دراصل میں نے کل رات بھی یہ فلم دیکھی تھی اور یہ کل رات بھی گر پڑا تھا تو میرا خیال تھا کہ اس بار یہ گھوڑا سنبھل کر چلائے گا۔

صائمہ قریشی۔حیدرآباد

زعفرانی قطعات

چلن آلودگی نے اس طرح بدلا ہے دنیا کا
جو تھے ایذا رساں اپنے مسیحا ہوتے جاتے ہیں
بدن پہ چل کر کبھی مرض کی تشخیص کرتی ہے
ہمیں بستر پہ مچھر رات بھر ٹیکے لگاتے ہیں

☆

مالک نے ڈانٹا تو نے مچھر تو مارنے تھے
بھیں بھیں کی کچھ صدائیں کانوں میں ہو رہی ہیں
نوکر یہ بولا مچھر تو مر چکے ہیں سارے
بیوائیں ان کی آ آ کر کانوں میں رو رہی ہیں

افشاں علی۔کراچی

مددگار

محبت خان میں مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے کا بے حد جذبہ تھا۔ایک روز وہ سائیکل پر اپنے گھر جا رہے تھے کہ ایک سنسان گلی میں انہوں نے ایک لمبے تڑنگے طاقتور آدمی کو دیکھا، جو ایک کمزور اور پستہ قد آدمی کو مار رہا تھا۔

''خبردار...رک جاؤ، بزدل کہیں کے!'' محبت خان نے طاقتور آدمی کو للکارا اور سائیکل سے اتر کر دو چار زبردست قسم کے گھونسے رسید کر کے اسے بے ہوش کر دیا۔

تب کمزور اور منحنی سا آدمی کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور زمین سے ایک بٹوا اٹھاتے ہوئے بولا۔''اب ہم اس بٹوے کے پیسے آدھے آدھے کر لیتے ہیں، جو میں نے اس آدمی کی جیب سے نکالا تھا''۔

شہروز احمد۔سکھر

......☆......

ذرا پیہرس کہنا

میری عید بن جاؤ

میری خوشیوں کی یہ راہیں
تمہارے بن ادھوری ہیں
میرے جذبوں کی قندیلیں
تمہارے بن اندھیری ہیں
یہ سوتی جاگتی آنکھیں
ہر لمحہ خواب بنتی ہیں
میری سوچوں خیالوں میں
تمہاری چاپ سنتی ہیں
میرے دل کی ہر اک دھڑکن
میری سانسوں کا ہر ایک پل
تمہارا نام لیتی ہیں
میرے جیون میں آ جاؤ
میری تشنہ نگاہوں کی
انوکھی دید بن جاؤ
تم میری عید بن جاؤ
تم میری عید بن جاؤ

تبسم فیاض

سنو ساجن

عید آئی ہے سکھیاں کہتی ہیں
عید آئی ہے مہندی چوڑی کنگنا اور
خوشیاں سنگ لائی ہے
مگر او میرے بے خبر ساجن
یہ عید کیسی عید ہے جس کے
آنے سے نہ من میں خوشی دوڑی
نہ دل کو تسلی ہوئی
تو سنو ساجن یہ عید بھی پچھلی
عیدوں کی طرح بیکار گزاری
نہ مہندی لگی نہ چوڑی بجی
نہ ہی عید گزاری صرف
تیرے بغیر

ثناء کنول اللہ دتہ

سنو جاناں

عید کے اس اہم موقع پر
بیتی باتوں کو بھلا کر
گیت محبت کا گنگنائیں
بہت کاٹ لی سزا دوری کی
اب کہ لمحہ وصل کو دہرائیں
نہ تم کچھ کہو ہم سے
نہ ہم کچھ کہیں تم سے
گئے دنوں کی چبھن کو بھلا کر
روز عید محبتوں کے گلاب چنتے
چپکے سے ہمقدم ایک دوجے کے ہو جائیں
آؤ کہ ہمسفر ہو جائیں

رابعہ افضال خان

یہ شب بھر جاگنے والے

یہ شب بھر جاگنے والے
یہ کچھ پاگل سے لگتے ہیں

یہ کچھ گھائل سے لگتے ہیں
یہ آنکھوں میں کوئی سپنا کبھی سجنے نہیں دیتے
یہ خوابوں میں کوئی اپنا کبھی آنے نہیں دیتے
یہ شب بھر جاگنے والے!
عجب خبطی سے ہوتے ہیں
نہ خود سوتے ہیں
اور نہ خوابوں کی انمول پریوں کو یہ
آنکھوں کے حسین بستر پر سونے دیتے ہیں
یہ شب بھر جاگنے والے
بہت گھائل سے ہوتے ہیں
یہ کچھ پاگل سے ہوتے ہیں
یہ شب بھر جاگنے والے

سباس گل

فرق

زندگی اور محبت
دونوں میں ہم کو تو بس
فرق یہ نظر آیا
کہ زندگی کی خاطر ہم
رو رو کے ٹوٹ ٹوٹ گئے
اور
محبت کی جستجو میں ہم
ٹوٹ ٹوٹ کے روئے

اسویرہ علی

نظم

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں
یہ جو میرے آنگن میں گل کھلے ہیں
ان کے گرد منڈلاتی شوخ و چنچل
تتلیاں بالکل تمہاری طرح ہیں
اور میں کسی بے بس گل کی مانند
تمہیں چھو بھی نہیں سکتا
اور تم سے دور ہو بھی نہیں سکتا
زیست کے سرد و گرم میں
ایک دن میں بکھر جاؤں گا
تم سے بچھڑ جاؤں گا
تب میں یہ سوچتا ہوں
تم کس گلشن بسیرا کرو گی
کس گل پہ رنگ بکھیرا کرو گی
کبھی کبھی میں سوچتا ہوں

ریمل آرزو

نظم

صاف و شفاف سا دھڑکتا جو دل ہے
یہ تمہارے دل میں بسے سارے غموں کو
اپنے اندر سمو لے گا
تمہارے غم اپنے اندر سموتے سموتے
اس کی دھڑکنیں ہی
کیوں نہ تھمنے لگیں
مگر یہ اپنی آخری دھڑکن تک
تم سے کیا وعدہ نبھائے گا
سنو!
میری گداز انگلیوں کی حساس پوریں
تمہارے حسیں آنکھوں سے
نکلنے والے ہر شفاف موتی کو
اپنے اندر جذب کر لیں گی
سنو!
اس سے قبل کے
میرے سینے میں دھڑکتا
یہ کانچ سا دل
ٹوٹ کر بکھر جائے
یا اس کی دھڑکن تھم جائے
پل دو پل کے لیے ہی سہی
مجھے اپنا ہمسفر کر دو
غم میں ڈوبا اپنا دل مجھے عطا کر دو
گویا خوشیوں کی مجھ پر برسات کر دو

ہاجی کو اپنا ہمدرد کر دو

ہاجرہ امین خان ہاجی

میرا عشق

عشق میرا عشق
پیار، محبت، چاہت
دیوانگی، جنون، دلیری
دعا، عبادت، وفاداری
ان مفہوم لفظوں کو
جوڑ کر عشق بنتا ہے
عشق ہے وہ گیت
عشق ہے وہ جذبات
عشق ہے وہ احساس
جو بدل دے دنیا
بدل دے یہ حالات
عشق کبھی ختم نہیں ہوتا
عشق کبھی نہیں مرتا
عشق کرنے والا
چلا جاتا ہے دنیا سے
اور! دنیا میں
عشق
چھوڑ جاتا ہے
زندہ
عشق میرا عشق!

مدیحہ اعجاز حسین

غزل

ہجر میں رونا اور وصل کی رات میں رونا
اس کی عادت ہے ہر ملاقات میں رونا
کبھی چہرے کو میرے تک کر کاندھے پر سر رکھ کر
اس کی عادت ہے بھری برسات میں رونا
اس کی دعا ساتھ رہی تو سنور جاؤں گا میں
اس کی عادت ہے میرے لیے ہر مناجات میں رونا
ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھے تو رو پڑتا ہے اکثر
یوں اچھا نہیں ہے تیرا ہر بات پہ رونا
گل کو شاخ سے جدا دیکھے تو بلکتا ہے پہروں
اس کی عادت ہے بے ضرری وجوہات پر رونا
شب و شام کا غم ہو تو بے کل ہو اٹھتا ہے
اس کی عادت ہے خوشی کی بارات میں رونا
اب کہ سوچا ہے تجھ سے بچھڑ ہی جاؤں میں
کہاں تک برداشت کروں تیرا ہر بات میں رونا
لوگوں کے سامنے تماشا نہ بنے اب مون
کہنا اسے چپکے چپکے اپنی ذات میں رونا

مون شاہ

تمہاری یاد

تمہاری یاد بڑی ہی بداخلاق ہے
کبھی بھی کہیں بھی
بے وجہ چلی آتی ہے
مجھے بے کل کر جاتی ہے
ساتھ میرا سکون لے جاتی ہے
روح کو تڑپا جاتی ہے
سنو!
اپنی یاد سے کہو
یوں نہ مجھے تڑپایا کرے
بنا دستک نہ آیا کرے
ہم نازک دل لوگ
تمہاری یاد کے اس حملے کو
سہہ نہیں پاتے
گھائل ہو جاتے ہیں
ٹوٹ جاتے ہیں

دانیہ آفرین

عورت

وہ مجھے آنکھوں میں سجا لے
تو خواب بن جاؤں
وہ مجھے سانسوں میں بسا لے

تو گلاب بن جاؤں
وہ مجھے سینے سے لگا لے
تو کتاب بن جاؤں
وہ مجھے ہونٹوں سے لگا لے
تو شراب بن جاؤں
مگر
وہ مجھے صرف عورت سمجھتا ہے
اور
پاؤں کے نیچے رکھتا ہے

شہلا گل سحر

ساتھ تمہارا

دل کی ہر دھڑکن پر نقش انداز تمہارا ہے
میری یادوں کی ہر یاد میں نام تمہارا ہے
میری زندگی کی صبح میں آغاز تمہارا ہے
پھر کیوں اتنے دور ہو تم
جب میری زندگی کے ہر قدم پر ساتھ تمہارا ہے

علیشبہ احمد

غزل

میں چاہوں اور تجھ کو کیا
بتاؤں میں اور تجھ کو کیا
یہ دل ہے ایک شیشہ سا
تجھے اب اور کہنا کیا
میری جاں تم ہی ہو
اب تمہارے جیسا ہو گا کیا
میں چاہوں اور تجھ کو کیا
بتاؤں میں اور تجھ کو کیا
میں اپنے بس میں نہیں ہوتا
کوئی دیکھے جو تجھے درجہ
اگر اس کے سوا تم کو
شکایت ہو تو بولو کیا
بھلا اس دل سے اب تم کو
شکایات ہو گی بھی اب کیا
ہوئی تم سے پہلے جو خطا مجھ سے
وہ اب تک تم بھولے نہیں ہو کیا
میرے بس میں اگر ہوتا
تیری مانگ میں تارے سجا دیتا
لینی ہو تو لے لے جاں
چاہیے اب اور تجھ کو کیا
راہوں میں تیری پلکیں
اور دل کو بچھا دیتا
لگتی ہے میری چاہت جھوٹی
یا اعتبار نہیں ہے کیا

نور الصباء

غزل

شام کے یہ منظر سہانے اس دیوانے کے لیے کچھ بھی نہیں
وہ چھوڑ چکا ہے مجھے ستانے کے لیے کچھ بھی نہیں
محبت، دوستی، وفا یہ جذبے اب مر چکے ہیں
دل کی بنجر زمین پر اگانے کے لیے کچھ بھی نہیں
آنکھیں سوگ میں ہیں خواب روگ میں ہیں
اے میری تنہائی تم پر لٹانے کے لیے کچھ بھی نہیں
یہاں اب کوئی اپنا نہیں سچ ہوتا کوئی سپنا نہیں
میرے پاس اب آزمانے کے لیے کچھ بھی نہیں
یہ سلسلہ اناؤں کا ختم ہوتا نہیں اپنوں میں
خوشی کی دلہن کو منانے کے لیے کچھ بھی نہیں
بس اک مسکراہٹ ہے اپنی وہ بھی پھیکی سی ساتھی
دوستوں کو اس کے سوا دکھانے کے لیے کچھ بھی نہیں

"ساتھی" زبیر پنہیار

عورت

مسجد و مندر جانے والو
عورت کا حق کھانے والو
اس کے بت میں جان نہیں ہے؟

یا عورت انسان نہیں ہے؟
بیٹی کو شر جاننے والو
رب سے بیٹے مانگنے والو
اس کا رب رحمٰن نہیں ہے؟
یا عورت انسان نہیں ہے؟
اس کے ہاتھوں جھولنے والو
احسانوں کو بھولنے والو
اس کی کوئی شان نہیں ہے؟
یا عورت انسان نہیں ہے؟

سید بشارت شاہ

غزل

وہ سنا ادھر سے گزر گئے
میرے دل کے در سے گزر گئے
ہیں نصیب میں ان کے منزلیں
وہ اگر بھنور میں سے گزر گئے
کیا بتائیں یہ بھی ہوا کبھی
کہ ہم اپنے گھر سے گزر گئے
گو قدم قدم پہ تھیں مشکلیں
پھر بھی ہم سفر سے گزر گئے
تیرے بھولے میرے خیال میں
میری چشم و تر سے گزر گئے
یہ زمانہ امتیاز ہے انہی کا جو
بلا خوف ادھر سے گزر گئے

ایس امتیاز احمد

غزل

غنچہ دل بکھرنے والا ہے
اب وہ مجھ سے بچھڑنے والا ہے
شب گزیدو! تمہیں مبارک ہو
کوئی سورج ابھرنے والا ہے
بجھ نہ جائے کہیں چراغ دل
رخ ہوا کا بدلنے والا ہے
کوئی جا کر اسے خبر دے دے
زخم دل کا یہ بھرنے والا ہے
ساتھ میرے یہ سوچ کر چلنا
یہ زمانہ تو جلنے والا ہے
اتنا نازک نہیں یہ دل میرا
چوٹ کھا کر سنبھلنے والا ہے
کون کہتا ہے بے وفا ہے حکیم
تیرے غم میں تڑپنے والا ہے

حکیم خان حکیم

غزل

انداز وفا میرا کام تو آیا آئے ہیں اپنانے لوگ
شمع امید کی جلانے آئے ہیں انجانے لوگ
شام سحر تو آئی ہیں کتنے سورج ڈوب گئے
چڑھتے سورج کو آتے ہیں پھولوں کو برسانے لوگ
پیار کا منظر کیا دیکھیں کے پھولوں کے بدلے کانٹے پائے ہیں
کل تک جن کو اپنا جانا آج ہیں وہ بیگانے لوگ
رکھیں کیوں آس چاہت ہم ان سے اپنا رشتہ کیا
کام کسی کے کب آتے ہیں دولت کے دیوانے لوگ
کس کو دل کا درد سناؤں کون اپنا کون پرایا
جانے کہاں سے آجاتے ہیں محفل میں تڑپانے لوگ
دل اپنا اب یہ کہے کہ دشت کو ہم پھر آباد کریں
شہر میں تیرے جیسوں کو کہتے ہیں دیوانے لوگ
آنکھوں دیکھا حال کہو سنی سنائی بات نہ کرنا
سنتے ہیں کہ غم کو بھلانے جاتے ہیں میخانے لوگ
حسن پہ تجھ کو ناز ہے اپنے تم کو کسی سے نسبت کیا
ڈھونڈو گے تو پا نہیں سکتے جاوید جیسے مستانے لوگ

محمد اسلم جاوید

لمحہ

جاتے جاتے تمہارا رک کر مڑنا
تمہاری آنکھوں کے ہیروں کا چمکنا
میری طرف ادھ کھلے گلاب کو بڑھانا

جو میرا تیری
یاد کو بنا کر اپنی کتاب میں رکھ لینا
آج جب اوراق کھولے تو
گلاب غمگین دکھ رہا تھا
مگر اس میں مہک تھی اس کی
اسی گھڑی کی کہ جب دیا تھا گلاب تم نے
ہزار لمحوں کو کر دیا تھا گلاب تم نے
مگر یہ کیا ہے
جو اس گھڑی میں
بدل گیا ہے
اس ایک لمحے میں مر گیا ہے
وہ ایک لمحہ جو جاتے جاتے
تمہیں کہیں اور لے گیا ہے

مہرین کنول

نظم

کوئی آنکھ کہیں پُرنم نہ ہو
کسی کی زندگی میں غم نہ ہو
نہ ملے کبھی کسی کو ایسا زخم
جس کا کہ کوئی مرہم نہ ہو
فاصلے آنے نہ پائیں دلوں میں
رشتوں میں پیار کم نہ ہو
نہ ہوں ایسے ساتھی زندگی میں
کہ جن سے اپنا بھرم نہ ہو
انھیں چھوڑ کے دیں سب کو باہم
دلوں سے وفا کی ختم نہ ہوں
نہ آئے زندگی میں کوئی ایسا ستم گر مسکان
اپنا کوئی پیارا جہاں ہم قدم نہ ہو

مصباح مسکان رؤف

اک مشرقی لڑکی

میں اک مشرقی لڑکی ہوں
جس کے ارد گرد تہذیب اور
رشتوں کا تقدس قائم ہے
جس کو نامحرم کی طرف نظر ڈالنے کی
اجازت نہیں
جس کے آس پاس
رسم و رواج کی مضبوط دیوار ہے
کون بدبخت کہتا ہے
کہ میں تمہیں بھول گئی ہوں
کون بدبخت کہتا ہے
کہ دل سے تمہاری یاد مٹا چکی ہوں
میں اک مشرقی لڑکی ہوں
اور میرا مذہب میرا ضمیر میرا دل
مجھے بغاوت نہیں کرنے دیتا
میں کسی اور کی پابند ہو گئی ہوں
میری زندگی میرے شریک حیات کی
امانت ہو گئی ہے
میری ہر چیز اسی کی ہے
اور میں کسی ایک ہی کی رہنا چاہتی ہوں
کیونکہ میں اک مشرقی لڑکی ہوں
رشتوں کی بناوٹ جھوٹ
بغاوت سے انجان ہوں
دھوکہ دھڑی میں نے سیکھی ہی نہیں
اپنا تن من دھن محبت میں
قربان کر دینا
میری ذات کی تکمیل ہے
میری ذات کا محور ہے
میرے وجود کا دائرہ ہے
میرے مقدر کی سچائی ہے
کہ میں کسی اک کی ہوں
کیوں کہ میں اک مشرقی لڑکی ہوں

ریما نور رضوان

خواب نگر

خواب نگر میں رہنے والی وہ سادھو پاگل سی لڑکی

جانے کیسے نکل پڑی ہے خواب نگر سے ہجر کے رستے
شاید اس کو پتا نہیں ہے یہ رستہ یہ ہجر کا رستہ
اس کو دادِ غم کی منزل پر ہی لے جائے گا
رک جاؤ اے پاگل لڑکی! خواب نگر کی سادھو باسی
اس منزل پر خواب کوئی نہ بادل جگنو
خاردار ہے رستہ سارا خواب نگر کا الٹ ہے سارا
کیسے ہجر میں رہ پاؤ گی؟
کیسے داد کو سہہ پاؤ گی؟
میری مانو ایسا کر لو خواب نگر میں منزل ڈھونڈو
ہاں زاہی خواب نگر میں منزل ڈھونڈو

زاہدہ ہاشمی زاہی

بیگانہ

میں سمندر کے سفر پر نکلا
کنارے کی تلاش میں
سمندر کی ہر لہر مجھے
کنارے سے دور لیتی گئی
اور ایک تلاش!
مجھے مجھ سے ہی بیگانہ کر گئی

سعدیہ عابد

نظم

میں سب کچھ بھول جاتی ہوں
بس تم یاد رہتے ہو
ہر بات بھول جاتی ہوں
کھلے بالوں میں کلپ لگانا
الماری کھول کر تالا لگانا
کسی کے فون پر چونک جانا
زندگی کی تلخیاں
دوستوں کی سالگرہ
دوپہر کا کھانا، رات کو سونا
گھریلو مسئلے، میں سب کچھ بھول جاتی ہوں
بس اک تم یاد رہتے ہو!!

سیدہ فرزین حبیب

غزل

پھول برسیں گے مہکے گی ساری فضا
جب اسماء میرے گھر سے ہو گی وداع
جگمگانے کو شادی کی محفل حسین
چاند کرنوں کا تحفہ لیے آئے گا
جب محل تیرے خوابوں کے سج جائیں گے
آ کے پریاں کہیں گی تجھے مرحبا
جھومتی ناچتی یوں بہار آئے گی
دے گی تن من کو تیرے گلوں سے سجا
تو نے جو چاہ جب چاہ رب نے دیا
تیری چاہت میں دنیا ہے ساری فدا
تجھ کو اپنوں سے بڑھ کر محبت ملے
جیت لے گی دلوں کو تیری ہر ادا
جس جگہ تو رہے برسیں خوشیاں وہاں
دل سے نکلے یہ ماں باپ کے اک دعا
سونپ کے دل کا ٹکڑا کسی اور کو
آنسوؤں میں کہوں کس طرح الوداع

ساجدہ جمشید

نظم

میں ہوں، تنہائی ہو
گھر کی چھت ہو
ایک کپ چائے ہو
ڈائجسٹ ہو، ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو
اور دور کہیں سے کشور کمار کی یہ
آواز سنائی دے
تیرے بنا زندگی سے کوئی شکوہ تو نہیں
شکوہ نہیں شکوہ نہیں
تیرے بنا زندگی بھی لیکن زندگی تو نہیں
کاش ایسا ہو آج کی رات چاند ڈوبے گا نہیں
رات کو روک لو......

شیریں تبسم

......☆......

سندیسے

افشاں علی..............کراچی

پرخلوص دعاؤں اور محبت کے سنگ تلے افشاں علی حاضر ہے تمام پڑھنے والی آنکھوں اور خوب صورت بصارت کو میرا اسلام! خوب صورت سے سرورق کے ساتھ 11 جون کی تپتی سہ پہر کو ردا ہاتھوں کی زینت بنا۔ ماڈل کا ڈریس بہت پیارا لگا۔ گوشہ آگہی میں صالحہ آپا کے قلم سے نکلے خوب صورت سے بکھرے موتی سمیٹتے آگے بڑھے۔ قمروش شہک کا پیار بھرا ناول اختتامی مراحل کی طرف جاتا بہت اچھا رہا۔ سڈنی شہر اور فائن آرٹس کے ارد گرد گھومتا فاطمہ خان کے ناول کا پہلا حصہ کافی دلچسپ رہا۔ حنا کنول شہزاد کا افسانہ بھی خوب رہا۔ آگے بڑھے تو میرا افسانہ نظر آیا۔ آپ تمام قارئین ضرور بتایئے گا میرا افسانہ کیسا لگا؟ فرزانہ رضوی نیا نام گھر کے عنوان سے آپ کا ناول پسند آیا۔ ”تنہا تنہا دن جیون کے“ عریشہ مسعود کا ناولٹ بھی اچھا رہا۔ واقعی کبھی اپنے بھی ہمیں تنہا کر دیتے ہیں۔ ”محبت کی تھام سکے ڈوری“ نائس نیم، انجم نیا اضافہ، بہت اچھا لکھا آپ نے بھی۔ باقی تمام افسانے جو کہ گل عزل، افسانہ آفتاب، فرزانہ اور اقراء سیف کے قلم سے تھے بہت خوب اور اچھے لکھے آپ نے۔ اقراء سیف کا افسانہ مختصر مگر بہت ہی اچھا اور میننگ فل رہا۔ نائلہ طارق کے ناول کی یہ قسط بھی اچھی رہی پر شانزے مصطفیٰ کی کمی بھی محسوس ہوئی۔ ”ردا کی ڈائری“ میں ریما نور، صبا عبدالغنی اور صبا سحر کی ڈائری پسند آئی۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں سب کی شاعری عمدہ رہی۔ اب آتے ہیں سندیسے کی جانب، قمروش شہک کا سندیسہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سندیسے میں کیتی آراء، فریدہ فرید، رابعہ افضال، ثناء کنول، مصباح مسکان، درخشاں ضیاء اور ریمل نے بھی خوب رونق لگائی، مصباح کے ایم اے پارٹ II کے پیپرز ہیں۔ دعا ہے اللہ آپ کو کامیابی عطا کرے، آمین۔ سویٹ فریدہ جی! بہت بہت شکریہ آپ کی پسندیدگی اور اتنے پیار کا۔ نائلہ طارق کا سندیسہ اور اس میں میرا نام، ہائے میری خوش نصیبی بہت شکریہ آپی۔ رابعہ افضال۔ ریمل آرزو میرے سندیسے کی پسندیدگی کا بہت شکریہ۔ ڈیئر ثنا میری دوست رئیلی سوری میں آپ کی برتھ ڈے بھول گئی۔ معذرت کے ساتھ یہ چھوٹی سی دعا آپ کے نام

تیرے رخ رخسار پر نہ گرے کبھی کوئی آنسو
خدا تیری ہر دعا تیری سوچ سے پہلے قبول کرلے

ساتھ ہی میری تمام لکھاری پیاری دوستوں و بہنوں اور قارئین کو رمضان المبارک کا مسرتوں و رحمتوں بھرا مہینہ بہت بہت مبارک۔ اب اجازت کے ساتھ معذرت طبیعت خرابی کے باعث میں تفصیلی تبصرہ نہیں کر پائی امید ہے آپ سب ناراض نہیں ہوں گے۔ اپنی دعاؤں اور محبتوں میں مجھے یاد رکھیے گا۔

رابعہ افضال خان..............کراچی

ڈیئر صالحہ آپی، کیوٹ سی نورین ملک اینڈ آل

ردا اسٹاف وقارئین کو رابعہ افضال خان کا دعاؤں اور محبتوں سے سجا سلام قبول ہو۔ آپ سب کو رمضان بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ عید سب کے لیے ڈھیر ساری خوشیوں کا پیغام لائے۔ اب بات ہو جائے جون کے ردا کی۔ سرورق پر جلوہ افروز منا ہل سو سو لگی۔ صالحہ آپی کی ''گوشہ آگہی'' اور ''ردائے جنت'' میں بکھرے ڈھیر سارے موتیوں کو سمیٹتے آگے بڑھے۔ ''ردا کی ڈائری'' سے افشاں علی، ماہ نور اور ریما نور کا انتخاب پسند آیا۔ ''اس ماہ میں'' عانیہ نیازی کا انتخاب اچھا تھا۔ ''خوشبو'' میں ہر لفظ خوشبو سمیٹے ہوئے تھا۔ ''ذرا پھر سے کہنا'' میں سب کا کلام بہت اچھا تھا۔ سب ہی نے بہت اچھا لکھا۔ سلسلے وار ناولز میں قمروش شہک کا ناول ''تیرے پیار کی خوشبو'' پڑھ کر دل میں شدید خواہش جاگی کہ اگلی قسط بھی ابھی پڑھنے کے لیے مل جائے۔ شازیہ جی آپ کی غیر حاضری نے دل توڑ دیا آپ کی غیر حاضری بالکل اچھی نہیں لگی۔ افشاں علی کا افسانہ بیسٹ رہا۔ سندیسوں میں افشاں علی، فریدہ فرید، ثنا کنول اللہ دتہ، گیتی آرا کے تفصیلی تبصرے پسند آئے۔ ظہیر بھائی کی والدہ کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی والدہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ لولی اینڈ کیوٹ سی فریدہ فرید، افشاں علی آپ دونوں نے میری دوستی کا جواب اس قدر محبت اور خلوص سے دیا ہے کہ خوشی اس قدر ہے کہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی اتنے پیار اور خلوص کے لیے جزاک اللہ (جانتی ہوں دوستی میں سوری اور تھینکس نہیں چلتا) دل خوشی کے احساس سے لبالب بھرا تو چند الفاظ کاغذ کی نذر ہو گئے۔ ثناء کنول اللہ دتہ میں ایک دم فٹ فاٹ ہوں۔ اتنی محبت سے دعا دینے کے لیے جزاک اللہ بر تھ ڈے بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش و مسرور رکھے، آمین۔ فریدہ فرید یو آر سو کیوٹ آپ کے ہر لفظ سے محبت کی خوشبو آتی ہے۔ اس دفعہ ردا بہت دیر سے ملا۔ باقی کے ناول و افسانے زیر مطالعہ ہیں۔ ڈیئر صالحہ آپی، نورین ملک، کیوٹ سی افشاں علی، فریدہ فرید، ثناء کنول اللہ دتہ، صبا عبدالغنی، لولی سی ملالہ اسلم، قمروش شہک، نائلہ طارق، شازیہ مصطفیٰ عمران، ریما نور رضوان، عانیہ نیازی اور جن کے نام رہ گئے (معذرت کے ساتھ) آپ سب کو میری طرف سے رمضان المبارک اور ایڈوانس میں عید کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو ڈھیر ساری خوشیاں عطا کرے۔ آپ کے لبوں پر ہر دم یوں ہی مسکراہٹ سجی رہے، آمین۔ اس کے ساتھ ہی اپنی دوست رابعہ افضال خان کو اجازت دیجیے انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔

صبا عبدالغنی.........کراچی

سب سے پہلے تمام پڑھنے والی بصارتوں اور سننے والی سماعتوں کو خوب صورت سی باربی ڈول کا خوب صورت سا سلام الفت قبول ہو۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، اور کیسے ہیں آپ سب یقیناً ٹھیک ہوں گے کیوں کہ ما بدولت کی دعائیں جو آپ کے ساتھ ہیں (ہے ناں؟) آپ لوگ بھی سوچتے ہوں گے کہ ایک بار جھلک دکھا کے پھر غائب ہو جاتی ہے۔ کبھی سندیسے کی محفل میں شامل نہ ہو پاؤں تو مجھے بھی دلی افسوس ہوتا ہے۔ پر کیا کروں ہائے رے مصروفیت۔ مئی کے ردا کی تعریف تو نہ کر سکی پھر بھی اتنا ضرور کہوں گی کہ مئی کے شمارے میں شاہدہ علی، ثناء کنول، ندا حسنین اور فرح ناز محمد رفیق نے بے حد اٹریکٹ فل لکھا، ویری ویلڈن۔ باقی نیو رائٹرز بھی کم قابل تعریف نہیں تھیں۔ افشاں علی اینڈ علیشبہ احمد آپ دونوں نے بھی بہت خوب لکھا، اب آگے بڑھتے ہیں جون کے شمارے کی طرف تو ناٹیل گرل کے ڈریس کے کلر نے اٹریکٹ کیا۔ ''گوشہ آگہی'' میں جہاں عید نمبر کے بارے میں پڑھ کر خوشی ہوئی تو وہیں دوسری طرف ظہیر بھائی کی والدہ کے انتقال کا سن کر ساری خوشی ہوا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اے اللہ تو ظہیر بھائی کی والدہ کی مغفرت فرما۔ ان کے درجات بلند فرما اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرما، آمین۔ خیر بوجھل دل لیے آگے بڑھے اور فٹافٹ ''تیرے پیار کی خوشبو'' پڑھنے کے لیے دوڑ لگائی۔ پڑھ کر شکر ادا کیا کہ زرمیل اور ژالے کے درمیان کشیدگی ختم ہو گئی لیکن اب عارفین اور معصوم کے درمیان کشیدگی شروع ہو گئی۔ قمروش آپی! اختتام کی طرف قدم بڑھاتا یہ ناول سپر ڈوپر ہٹ ہے۔ ''جو عشق میں بنتی وہ عشق بتا جانے'' میں خرمن کے ہارون کے بارے میں لکھے گئے الفاظ نے مجھے ساکت کر دیا۔ اس بار شازیہ آپی کا ناول شامل نہیں تھا۔ بہت افسوس ہوا۔ امید ہے اگلی بار ضرور شامل ہوگا۔ ''میرے دل میرے مسافر'' بھی اچھا اچھا سا ناول تھا۔ فاطمہ جی! ابھی فرسٹ قسط ہے تو کچھ کہنا مشکل ہے آگے ضرور رائے دوں گی معذرت۔ ''عکس'' فرزانہ جی ناول بہت ہٹ تھا۔ شروع شروع میں تیمور کے رویے پر بہت غصہ آیا پر پیپی اینڈنگ نے سارا غصہ بھلا دیا۔ ''تنہا تنہا دن جیون کے'' عرشیہ جی! ناولٹ اچھا تھا۔ اب آتے ہیں افسانوں کی طرف تو ٹاپ آف دی لسٹ افسانے ضمیر پر ضرب مہلک، تمام محبت کی، تمام سکے ڈوری اور توکل تھے۔ افشاں علی! میری پیاری سی دوست آپ کا تو نام ہی کافی ہے۔ آپ کے افسانے نے سحر زدہ کر دیا۔ انجم صبغت اللہ جی! آپ کا افسانہ بھی واقعی لاجواب تھا ویلڈن۔ اقراء سیف جی! آپ نے صحیح نکتے پر قلم اٹھایا۔ آپ کو جتنا ملے چاہے کم یا زیادہ اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔ یہ بات آپ نے واضح فرما دی۔ ''میری زیست کا حاصل'' حنا کنول شہزادا! آپ کی تحریر واقعی قابل تعریف ہے ویری ویلڈن۔ ''ہم تم سے محبت کرتے ہیں'' پڑھ کر میں بھی کہتی ہوں ہم آپ سب سے اور ردا کے پورے اسٹاف سے محبت کرتے ہیں۔ ''ایسا بھی ہوتا ہے'' افسانہ آفتاب کاوش۔ آپ نے لکھا ہے تو برا کیسے ہو سکتا ہے۔ کہانی سچ میں بہت زبردست تھی۔ ''وہ اجنبی میرا اپنا تھا'' فرزانہ عمر دراز اتنے دن کی غیر حاضری کے بعد اتنے اچھے افسانے کے ساتھ حاضری پر ویلکم۔ افسانہ بہترین تھا۔ ''ردا کی ڈائری'' میں ماہ نور کا انتخاب اچھا لگا۔ باقی سب کے انتخاب بھی بہترین تھے۔ ''اشعار'' میں سارے شعر عمدہ تھے۔ ''اس ماہ میں'' کو نورین ملک نے خوب سجایا اور ''خوشبو'' کو بھی خوب مہکایا۔ ''ذرا پھر سے کہنا'' میں سب سے اچھی نظم طاہرہ حسن کی تھی۔ باقی سب کی شاعری بھی متاثر کن تھی۔ ''سندیسے'' میں تو اس بار بڑی بڑی ہستیوں نے شرکت کی۔ افشاں علی، قمروش شہک، گیتی آراء، فریدہ فرید، نائلہ طارق، رابعہ افضال خان، ثناء کنول، ریما نور، مہرین کنول، سعدیہ اقبال، مصباح مسکان، اینڈ امینہ، درخشاں ضیاء اور ریمل آرزو سب نے بہترین لکھا۔ ریما نور، سعدیہ اقبال اور درخشاں ضیاء کو دل سے ویلکم۔ اب شامل ہوتی رہیے گا۔ ''کچن'' اس بار بہت لذیذ تھا۔ پڑھ کر ہی دل چاہا کہ سب کچھ کھا لوں ہاہاہا۔ ''سنگھار'' بھی بہترین تھا۔ اور ہمارا ردا ہمیں ہر اسٹائل میں پیارا لگتا ہے۔ سندیسہ کافی طویل ہو گیا۔ اس کے لیے معذرت اور آخر میں ردا سے جڑے ہر ایک فرد کو رمضان کی برکتیں اور عید کی ساعتیں بہت بہت مبارک ہوں۔ اب

اپنی پیاری دوست و بہن کو اجازت دیں پھر ملاقات ہوگی، اللہ حافظ۔

ثمینہ فیاض............کراچی

بہت سی نیک تمناؤں اور خلوص کے ساتھ صالحہ آپی، نورین، ردا کے تمام اسٹاف، رائٹرز اور تمام پڑھنے والوں کو ثمینہ فیاض کا السلام علیکم! کتنی عجیب بات ہے کہ مجھے جون کے شمارے کا انتظار مئی کے ڈائجسٹ سے زیادہ شدت سے تھا۔ مئی میں میرا افسانہ ''اعتماد'' چھپا جس کی مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور جون میں شمارے کا انتظار اس لیے تھا کہ پتہ نہیں آپ لوگوں کو میری تحریر کیسی لگی ہو گی۔ جب ردا ہاتھ میں آیا تو سب کچھ چھوڑ کر سب سے پہلے سندیسے پڑھنے بیٹھ گئی کس کس کی کہانیاں چھپی ہیں، کون سرورق پر براجمان ہے سب بھول کر صرف آپ سب دوستوں کی رائے جاننے کے لیے بے قرار تھی۔ افشاں علی نے مجھ پر اتنا بھروسہ کیا اور ہمیشہ کھل کر تعریف کرتی ہیں۔ بہت شکریہ۔ گیتی آراء اور ریمل آرزو نے بھی سراہا بہت شکریہ۔ فریدہ فرید، نائلہ طارق، رابعہ افضال، ثناء کنول، اقراء سیف، سدرہ مرتضیٰ، سحرش فاطمہ اور دیگر بہت سی دوستوں کا بہت بہت شکریہ جنہوں نے میری اس چھوٹی سی تحریر کو اپنی پسندیدگی کا درجہ دیا۔ جون کے شمارے میں بھی ہمیشہ کی طرح سرورق پرکشش رہا۔ ''گوشہ آگہی'' اور ''ردائے جنت'' سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ نائلہ طارق اور قمروش کے ناولز کی تو کیا ہی بات ہے۔ سب کی طرح میں بھی فین ہوں۔ ''ضمیر پر ضرب مہلک'' اور ''توکل'' خوب صورت تحریریں۔ میری زیست کا حاصل، ایسا بھی ہوتا ہے، تھام محبت گر تھام سکے، ہم تم سے محبت کرتے ہیں، وہ اجنبی میرا اپنا تھا سب اپنی اپنی جگہ منفرد لگے۔ عرشیہ مسعود نے بھی بہت خوب لکھا۔ باقی میں پڑھ نہیں سکی بچے چھوٹے ہونے کی وجہ سے مصروفیت زیادہ ہوتی ہے جیسے جیسے موقع ملے گا انشاءاللہ میں آپ سب کے لیے اپنی تحریریں بھیجتی رہوں گی۔

ثناء کنول اللہ دتہ..........لودھراں

السلام علیکم! پرخلوص دعاؤں اور محبتوں کے ساتھ ثناء کنول اللہ دتہ حاضر ہیں۔ ردا اس بار بڑی مشکلوں اور صبر کے بعد بالآخر 8 تاریخ کو ملا جو کہ آج ہے۔ صبح کو میں ڈائجسٹ لے کر آئی تھی اور اب بیمار ہونے کے باوجود تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ اپنی تو ردا سے محبت ہی ایسی ہے جو بیان کرنا چاہیں بھی تو نہ کر سکیں۔ خیر سب سے پہلے حنا آپی کی کہانی شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ ''میرے دل میرے مسافر'' بڑا ہی رومنٹک نام تھا کہانی بھی بہت اچھی تھی۔ مجھے پسند آئی۔ لیکن جاری ہے بہت برا لگا انتظار کی کوفت۔ ''گھر'' فرزانہ رضوی بہت ہی اچھی کہانی تھی۔ خاص کر ریم کا کردار کہانی کی جان تھا۔ کلاسی فرینڈ۔ ''تنہا دن جیون کے'' بہت ہی زبردست اسٹوری تھی۔ عرشیہ مسعود شاباش۔ ''تھام محبت کی گر تھام سکے'' انجم آپ تو آتے ہی چھا گئیں۔ ویری گڈ پلیز اب ردا کو چھوڑنا مت۔ ویلکم ہوم۔ ہم تم سے محبت کرتے ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے، وہ اجنبی میرا اپنا تھا، بڑی ہی اچھی کہانیاں تھیں شاباش۔ اب بات کروں گی اقراء سیف کی کہانی کی اور افشاں علی کی۔ تمہاری کہانی ''ضمیر پر ضرب مہلک'' بڑی ہی اچھی کہانی تھی۔ مجھے بے حد پسند آئی بالکل حالات حاضرہ پر تھی، گڈ۔ اب بات کروں گی اقراء سیف آپ کی کہانی ''توکل'' کی، تو بڑی پیاری تحریر لکھی ہے تم نے۔ میری جان سدا خوش رہو۔ اب بات کروں گی سندیسے کی تو وہ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ بس ایک کمی تھی ''گوشہ چشم'' کی اور دوستوں کے آئے پیغام کی پلیز ایسا اگلے مہینے نہ کرنا۔ کچن اس بار بڑا ہی زبردست تھا۔ آپ کی ڈائری سے زینب شاہ، ماہ نور، افشاں علی نے زبردست لکھا۔ ذرا پھر سے کہنا میں سیدہ فرزانہ حبیب تمہاری نظم میرے دل کی آواز تھی۔ ثناء ناز محمد رفیق، حافظ مون شاہ، وفا شاہ، افسانہ آفتاب، مریم مغل اور نوشی نے زبردست لکھا۔ اچھا اب میں چاہتی ہوں اجازت اگلے مہینے پھر آؤں گی۔ اگر زندگی رہی تو۔

تبسم فیاض............کراچی

السلام علیکم آپی! رمضان کے اس بابرکت مہینے میں ردا پوری عظمت و حرمت کے ساتھ سنت نبوی سے سج جاتا ہے اور ''گوشہ آگہی'' سے لے کر رمضان کے دسترخوان تک قارئین کے ذوق و شوق کا خیال رکھتا ہے۔ آپی آپ سب کی محنت کو میری طرف سے ویلڈن اللہ تعالیٰ اسے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دے اور آپ سب کی محنت کا صلہ اللہ تعالیٰ دونوں جہانوں میں عطا کرے، آمین۔ آپی میری طرف سے سب کو ایڈوانس عید مبارک، رمضان مبارک ہو۔

گیتی آراء............کراچی

سب سے پہلے تو آپ اور نورین کو ہماری طرف سے رمضان شریف کی دلی مبارک باد۔ اللہ ہم سب کو ایسی ہزاروں ساعتیں دیکھنا نصیب کرے آمین۔ اب بات ہو جائے ماہ جون کے ردا کی تو ''گوشہ آگہی'' کی خوب صورت باتوں سے گزر کر ''ردائے جنت'' میں داخل ہوئے تو غصے پر قابو پانے پر احادیث اور دینی تعلیمات۔ واہ سبحان اللہ پڑھنے والوں کے لیے ایک مشعل راہ بن کر دل میں گھر کر گئی اور اب بات ہو جائے مکمل ناول، ناولٹ اور سلسلوں کی جو کہ ہمیشہ کی طرح قارئین کی جان اور نمبر ون ہوتے ہیں۔ ''جو گوشہ میں بجتی'' سے لے کر ''تنہا تنہا جیون کے دن'' تک زبردست رہے۔ عرشیہ مسعود کافی عرصے بعد نظر آئیں اپنی منفرد سی نایاب تحریر کے ساتھ واہ! کیا خوب لکھا۔ فرزانہ رضوی نے بھی گھر میں گھر کی اہمیت کا احساس جگا دیا اور اب بات ہو جائے افسانوں کی جس میں سب سے پہلے افشاں علی ''ضمیر پر ضرب مہلک'' میں ہم جیسے ہزاروں بے ضمیر لوگوں کا احساس جگانے میں کامیاب ہوئیں ہوں یا نہ ہوئیں ہوں لیکن اپنی خوب صورت طرز تحریر پر ڈھیروں داد وصولنے پر میں ضرور کامیاب رہی۔ ویلڈن افشاں۔ انجم صبغت اللہ ''تھام محبت کی گر تھام سکے ڈوری'' منفرد سے ٹاپک اور نفسیاتی مسائل پر قلم اٹھانے میں نمبر ون رہیں۔ ہمارے معاشرے میں روز بروز بڑھتے نفسیاتی مسائل پر آپ نے بہت خوبی سے قلم اٹھایا بہت خوب۔ اقراء سیف کا ''توکل'' اللہ پر بھروسہ کرنے اور توکل کرنے کا احساس بہت خوب صورتی سے جگا گئی۔ میری زیست کا حاصل، ہم تم سے محبت کرتے ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے، وہ اجنبی میرا اپنا تھا بھی اچھی رہی۔ ''ردا کی ڈائری'' میں بہادر شاہ ظفر کی غزل اچھی رہی۔ ''اس ماہ میں'' اس ماہ کا اقتباس خوف اس ماہ کا فلسفہ بڑے لوگ بڑی باتیں، کام کی باتیں، خاص کر اس ماہ کی خوب صورت بات واہ کیا بات کہی ہے نفرت کو ہزار موقع دو کہ وہ محبت بن جائے لیکن محبت کو ایک موقع بھی نہ دو کہ وہ نفرت بن جائے اور اب باری تھی ''خوشبو'' کی جو کہ خوشبو تو پھر خوشبو ہے۔ خوشبو بن کر پورے ردا کو مہکا رہی ہے جس کے احادیث اور دعا زبردست۔ دل میں اتر جانے والے ہوتے ہیں اور باقی مضامین کالم بھی اپنی مثال آپ ہوتے ہیں کسی دوسرے سے مقابلہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ''ذرا پھر سے کہنا'' حافظ مون شاہ کی نعت نمبر ون فرسٹ کلاس فرسٹ رہی۔ باقی تمام نظمیں اور غزلیں بھی اپنی جگہ اچھی

تھیں۔ سندیسے میں حسب معمول افشاں علی سبقت لے گئیں۔ کچن، اس ماہ تمام ہی پکوان لاجواب تھے۔ ''سنگھار'' میں جلد کی حفاظت کے لیے بہت مفید ٹپس رہیں۔ اب اجازت ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ۔

درخشاں ضیاء............کراچی

پیاری صالحہ آپی السلام علیکم! امید کرتی ہوں ردا کا تمام اسٹاف خیریت سے ہو گا۔ جون کا ردا اب کی دفعہ وقت پر ملا۔ ٹائٹل بس ٹھیک تھا۔ سب سے پہلے ''گوشہ آگہی'' میں آپی کی باتیں پڑھیں۔ مجھے ان کی سب سے اچھی بات لگتی ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیں خودکشی اور حادثاتی موضوعات سے دور رہنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ خود مجھے بھی وہ کہانیاں بالکل اچھی نہیں لگتیں جس میں اینڈ ہیپی نہ ہو۔ قمروش آپی آپ کے قلم میں جادو ہے بہت ہی زبردست لکھ رہی ہیں آپ۔ انجم صبغت اللہ نے بھی بہت اچھا لکھا ہے۔ ہمارے ارد گرد ایسے ہونہار لوگ موجود ہوتے ہیں جو محبت اور توجہ نہ ملنے کے باعث ذہنی بیمار ہو جاتے ہیں۔ اقراء سیف کا قلم تو جب بھی چلتا ہے کچھ اچھا ہی پڑھنے کو ملتا ہے۔ ''توکل'' ایک بہت ہی سادہ مگر جامع تحریر تھی۔ اللہ پر توکل ہماری تمام پریشانیوں کا حل ہے۔ افشاں علی نے ہماری توجہ ایک اچھی چیز کی طرف دلائی ہے۔ موضوع بے شک پرانا تھا مگر انہوں نے اسے اپنے انداز میں لکھ کر نئے طریقے سے پیش کیا۔ فرزانہ رضوی نے ''گھر'' لکھ کر ثابت کر دیا کہ وہ ایک بہترین لکھاری ہیں۔ بہترین تحریر تھی گھر۔ اس کے علاوہ بھی تمام کہانیاں اور افسانے اچھے تھے۔ فاطمہ خان کے ناول کی پہلی قسط پڑھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ آگے ناول مزید مزیدار ہونے والا ہے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ سندیسے میں کسی ایک کے سندیسے کی تعریف کرنا غلط ہو گا۔ تمام سندیسے پڑھ کر مزا آیا۔ اوور آل دیکھا جائے تو ردا بہتر سے بہترین کی طرف گامزن ہے۔ میری طرف سے تمام قارئین اور ردا اسٹاف کو پیشگی عید مبارک قبول ہو۔ نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہوں گی، اللہ حافظ۔

افسانہ آفتاب کاوش............کراچی

پیاری سی صالحہ آپی السلام علیکم! آپی اللہ آپ کو ہمیشہ خوش اور امن و امان میں رکھیں۔ ردا کے تمام اسٹاف اور پڑھنے اور لکھنے والے تمام دوستوں کو افسانہ آفتاب کاوش کا سلام قبول ہو۔ دوستوں آپ سب تو جانتے ہیں مصروفیت کے باعث میں ہر ماہ سندیسہ نہیں لکھ پاتی مگر ہر ماہ پڑھتی ضرور ہوں۔ میری وہ دوستیں جو مجھے وقتاً فوقتاً ردا میں یاد کرتی ہیں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں آپ سب میرے لیے بے حد خاص ہیں۔ میں آپ سب سے الگ نہیں ہوں۔ ہم سب ایک ہیں میں صالحہ آپی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ جن کی حوصلہ افزائی کی بدولت مجھ میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ ردا جون کے شمارے میں میرا افسانہ ''ایسا بھی ہوتا ہے'' ردا کی زینت بنا۔ رسالہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا، شکریہ آپی۔ اب آتے ہیں رسالے کی جانب۔ ''گوشہ آگہی'' کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جو میں تعریف کے لیے لکھ سکوں۔ پڑھ کر بے ساختہ واہ واہ کہا۔ ''ردائے جنت'' میں آپ نے اسلامک انفارمیشن غضب کی دیں، زبردست۔ مکمل ناول ''گھر'' بہت اچھا لگا۔ افشاں علی تو میری بہت پیاری دوست ہیں ان کی لکھی تمام کاوشیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ تمام افسانے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ مستقل سلسلوں کی کیا ہی بات ہے۔ آپ لوگوں کو میرا افسانہ کیسا لگا۔ ضرور بتایئے گا۔ مجھے دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔

☆

دوستوں کے نام پیغام

صالحہ آپی جان کے لیے عید ٹائیٹل

بہاریں آپ سے زندہ ہیں چمن آپ سے عبارت ہے
آپ کے سامنے کلیوں سے مرجھایا نہیں جاتا

نورین ملک کے لیے عید ٹائیٹل

اس کے لہجے کی نغمگی مت پوچھ
چلتے چلتے ٹھہر گئے ہیں لوگ

نائیلہ طارق کے لیے عید ٹائیٹل

مجھے معلوم نہیں حسن کی تعریف مگر
میری نظر میں حسین وہ ہے جو تجھ سا ہے

مہربان ردا سکھیوں کے لیے عید ٹائیٹل

تمہارا میرا تعلق بس ایک لفظ کا ہے
لغت کے انت میں سمٹا ہوا فقط ایک لفظ
اس ایک لفظ میں سچائی ہے زمانے کی
چلو کہ آج یہی لفظ اختیار کریں
تمام عمر پڑی ہے منافقتوں کے لیے
اس ایک لفظ کا دامن نہ داغدار کریں
اسے شمار کریں، درد آشکار کریں
چلو آج کچھ حساب زیاں جان کریں
اور کچھ پلوں کے لیے دوریوں کو بھول کر
باہم خلوص سے بات کریں

فریدہ فرید۔۔۔پاکپتن شریف

عید کی خوشیاں زندگی کی ساتھیوں کے نام

سب کہتے ہیں عید آئی ہے
تمہیں دیکھیں تو یقین آجائے

صالحہ آپی! اور نورین آپی آپ کو اور آپ کے سارے اسٹاف کو عید بہت بہت مبارک ہو۔ سدا خوش رہیں۔ آباد رہیں اور سب کے دلوں کو خوشیاں دیتی رہیں، آمین۔ افشاں علی جون میں تمہاری اپنے لیے دعا پڑھی تو بے اختیار آنسو ہی نکل آئے اتنی محبت اتنا پیار میں اس قابل کہاں، کیا لکھوں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنے آس پاس محسوس کیا ہے۔ ہر وقت تمہارے لیے دعا کی ہے۔ تمہیں عید بہت بہت مبارک ہو میری جان سدا خوش اور آباد رہو، آمین۔ مہرین کنول، جون میں آپ کے خط میں اپنا نام دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی چلو کوئی تو ہے جو مجھے چاہتا ہے جسے میری خوشی عزیز ہے جو میرے مرنے پر روئے گا تو سہی۔ عید مبارک میری جان! ہمیشہ مجھے یاد کرتی رہنا میں تمہاری محبتوں کی بہت مشکور ہوں آئی لو یو مائی لائف، فریدہ فرید، رابعہ افضال خان، سعدیہ اقبال، ریما نور، مصباح مسکان، درخشاں ضیاء، کشف ضیاء، ریمل آرزو میری تحریر پسند کرنے اور میری منگنی کی مبارک باد دینے کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ صبا عبدالغنی، میری جان عید بہت بہت مبارک ہو تم سب کو۔ صبا سحر، دھنک ناز، فرزانہ شوکت، زاہدہ ہاشمی، نور بانو، شاہدہ علی، ملالہ اسلم آپ سب کو عید بہت مبارک ہو۔ سو شاد آباد رہو۔ آسمان پر چمکتے چاند کی طرح چمکو، آمین۔ حنا کنول شہزاد میری جان تمہیں بھی عید مبارک ہو۔ سدا خوش رہو۔ حمیرا عروش تمہیں حمیرا شعیب بننے کی بہت مبارک باد قبول ہو اور ساتھ میں عید بھی مبارک ہو۔

یار پلیز ردا میں انٹری مارو نا۔ تمہارے بغیر کچھ کمی سی لگتی ہے میری ہر دعا تمہارے نام۔

☆ پیاری ثناء! رائٹرز کے نمبرز شیئر نہیں کیے جاتے۔

ثناء کنول اللہ دتہ۔ لودھراں

عزیز ہستیوں کے نام

حسب عادت تمام قارئین! رائٹرز اور ردا کے پورے اسٹاف کو سلام پرخلوص قبول ہو السلام علیکم۔ اس مرتبہ ایک بات کی طرف آپ لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ امید ہے غور فرمائیں گے۔ سب کو لگتا ہے کہ اگر میں ہر ایک کی تعریف کرتی ہوں تو یہ میرا بڑا ظرف ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ دراصل جب مئی 2014ء کے ردا میں میرا خط چھپا تھا تو مجھے لگ رہا تھا کہ شاید کوئی تعریف کردے یا ویلکم کہہ دے۔ وہ تو میری نادانی تھی لیکن مجھے پھر بھی افسوس ہوا کہ کسی کو میرا سندیسہ پسند نہیں آیا۔ پھر میں نے دل کو تسلی دی یہ کہہ کر کہ آج جو اتنے لوگوں کی تعریفیں ہو رہی ہیں انہیں سراہا جا رہا ہے ان سب کو بھی اس مقام پر پہنچنے کے لیے کتنے سال کی انتھک محنت کرنی پڑی ہے۔ اس لیے میں نے پھر کوششیں شروع کردیں۔ تعریف تو پھر بھی نہیں ہوئی مگر دوستیں بننا شروع ہو گئیں۔ پھر میں نے اپنی دوستوں کے لیے لکھنا شروع کیا آپ لوگ یقین نہیں کریں گی لیکن آپ لوگوں نے جب اپنے انٹرویوز میں اپنی برتھ ڈے ڈیٹس بتائی تھیں وہ میں نے لکھ کر محفوظ کرلیں تاکہ جب بھی شامل ہوسکوں آپ لوگوں کو آپ کی برتھ ڈے وش کرسکوں اور جب وش کردیتی تھی تو عالم تصور میں آپ لوگوں کو خوش ہوتے ہوئے دیکھتی تھی۔ اور پھر مجھے بھی بہت خوشی محسوس ہوتی تھی۔ یہ سب بتانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جب کوئی نیو قاری ردا میں شمولیت اختیار کرتی ہے تو آپ لوگ اسے ویلکم کیوں نہیں کہتے۔ یہ ایک معمولی بات نہیں ہے۔ میں نے تو اپنے آپ کو بہلا لیا تھا لیکن بعض لڑکیاں دلبرداشتہ ہو جاتی ہیں اور پھر لکھنا چھوڑ دیتی ہیں۔ سینئرز کی تو ہر کوئی تعریف کرتا ہے اصل کمال تو یہ ہے کہ جونیئرز کی تعریف کی جائے۔ اگر انہوں نے اچھا نہ بھی لکھا ہو تب بھی تاکہ ان میں ہمت پیدا ہو اور آگے لکھنے کا عزم مزید پاورفل ہو۔ لکھتے رہنے سے ان کی صلاحیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ پھر بالآخر وہ لوگ ایک پر اثر تحریر لکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ پلیز غور کریں کہ ہمارا ایک جملہ کسی کی صلاحیت کو سنوار بھی سکتا ہے اور بگاڑ بھی سکتا ہے۔ کیوں کہ بقول مفکر خوشی سے خوشی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے خوش رہیں اور دوسروں کو خوشی دیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نئے لکھنے والوں کو بھی نصیحت کرنا چاہوں گی کہ دلبرداشتہ نہ ہوں اور یہ مت سوچیں کہ اچھا نہیں لکھا میں نے اب نہیں لکھوں گی بلکہ یہ سوچیں ابھی اچھا نہیں لکھا تو کیا ہوا آگے اور اچھا لکھوں گی۔ میں نے اتنی عزت صرف سندیسے کے ذریعے کمائی ہے اور اس سب کے لیے کوئی پہاڑ نہیں کھودا۔ آپ سب بھی محنت اور لگن سے اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں جہاں آج میں اور نہ جانے کتنے لوگ کھڑے ہیں۔ کوئی بات بری لگی ہے تو معاف کردیجیے گا۔ امید ہے آپ سب کو میری بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ میں کیا بتانا چاہ رہی ہوں۔ پیغام طویل ہوگیا ہے اب اپنی دوست و بہن کو اجازت دیں اور ہاں آخر میں آپ سب کو اور ردا کے پورے اسٹاف کو رمضان اور عید کی خوشیاں بہت بہت مبارک ہوں، اللہ حافظ۔

صباء عبدالغنی۔ کراچی

کال پر بات کرنے والی کے نام

مجھے نہیں معلوم آپ کا کا نام کیا ہے، شکل کی کیسی ہے یا عمر میں مجھ سے کتنی بڑی ہیں۔ میرے لیے بس یہی کافی ہے کہ آپ نے مجھے دکھوں میں مسکراہٹ کا

تحفہ عطا کیا۔ آپ اتنے اچھے طریقے سے فون پر بات کرتی ہیں کہ دل آپ کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کردینے کو چاہنے لگتا ہے خدا سے دعا ہے آپ کو خوش حال، صحت مند اور باعمل دراز زندگی عطا کرے، آمین۔

☆ سویٹ ہاجرہ! کال پر آپ کی نورین ملک سے بات ہوتی ہے۔ آپ کا پیغام اور دعائیں ان تک پہنچ گئیں اور جواباً ان کا شکریہ اور پیار آپ کے لیے بھی حاضر ہے۔

ہاجرہ امین۔ کراچی

دوستوں کے نام

مائی ڈیئرسٹ فرینڈز عانیہ نیازی، افشاں علی، صبا نور، شازیہ، قمروش، نائیلہ طارق، صالحہ میڈم، نورین ملک، رابعہ افضال اور میری ہماری ردا کی گم شدہ رائٹر جن کی وجہ سے ردا پڑھنا شروع کیا، وریال خان اور تمام قارئین رائٹرز کو خلوص دل سے عید مبارک۔ اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھیں۔ یہ ہی میرا تحفہ ٹھہرا آپ کی طرف سے شکریہ آپ سب کے لیے میرا تحفہ بصورت اشعار

ہر پل تو خوشیوں میں کھلے
مہکیں صدا دن رات تیرے
خود کو کبھی تنہا نہ سمجھنا
میری دعا ہے ساتھ تیرے

فرح ناز محمد رفیق۔ کراچی

اپنوں کے نام

السلام علیکم! ثناء کنول اللہ دتہ آپ کو منگنی کی مبارک ہو۔ اللہ پاک اس بندھن کو پائیداری عطا کرے اور آپ کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے، آمین۔ ڈیئر رابعہ افضال خان خلوص اور دعا کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ صبا عبدالغنی یہ اچھی بات ہے کہ آپ ناراض نہیں ہوتیں۔ آپ مسکراہٹوں کا تحفہ پایا چاہتی ہیں تو پیاری صبا جب زندگی میں مخلص لوگوں کا ساتھ میسر ہو جائے تو لبوں پر مسکان تو رہتی ہے ناں...... بس میری یہ گزارش ہے کہ آپ اور آپ جیسے مخلص دوست برابر مجھ ناکارۂ خلائق کے لیے دعا گو رہیے گا۔ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان عالیشان ہے کہ اللہ پاک ارشاد کرتے ہیں اے بنی آدم! مجھ سے اس زبان کے ساتھ دعا مانگو جس سے تو نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔ لہٰذا دوسروں سے دعا کروایا کرو کیوں کہ دوسروں کی زبان سے ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہوتا۔ پاک پروردگار رحمٰن رحیم رب سے دعا ہے کہ آپ سب کو سلامت تاقیامت رکھے۔ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ عالم اسلام اور وطنِ عزیز کی خیر فرمائے، آمین۔ آخر میں پیاری آپی صالحہ کے لیے ایک شعر

مانگتے ہاتھ پہ کلیاں دھر دے
اتنا مہربان تجھ پہ میرا خدا ہو جائے

مون شاہ۔ سرگودھا

فرینڈز کے نام

ردا پڑھنے والے اور لکھنے والے تمام قارئین اور رائٹرز کو میری طرف سے رمضان اور عید کی بہت بہت مبارک باد۔ اس ماہِ مبارک کی تمام برکتیں اور ساعتیں ہم سب کو نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے یہ عید باعث رحمت کردے۔ عید کی خوشیوں میں ان لوگوں کو بھی یاد رکھیں جو اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ ایک بار پھر میری جانب سے عید مبارک۔

تیری آنکھ کبھی نم نہ ہو
تیری زندگی میں کوئی غم نہ ہو
تیری مسکراہٹ جو چھین لے
کہیں ایسی کوئی رسم نہ ہو
تو دل میں بسے اس طرح
تیرا خیال دل سے کم نہ ہو

شاہینہ حبیب۔ کراچی

......☆......

مھندی کے ڈیزائن

کچن

عید کا موقع ہوتا ہے خوشیاں بانٹنے کا، گلے شکوے دور کرنے کا، بات خوشی کی ہو تو دسترخوان کا سجنا بھی شرط ہے اور عید تو ہوتی ہی کھانے پینے کے لیے۔ تو آپ بھی اپنے دسترخوان کو ہمارے بتائے ہوئے کھانوں سے منفرد بنادیں۔

شاہی ٹکڑے رنگین سویوں کے ساتھ

اجزاء

رنگین سویاں : ڈیڑھ کپ
دودھ : ایک لیٹر
چینی : آدھا کپ
بادام، پستہ (کترے ہوئے) : حسب ضرورت
ڈبل روٹی کے سلائس : آٹھ عدد
تیل یا گھی : تلنے کے لیے
چینی : آدھا کپ
پانی : آدھا کپ

ترکیب: دودھ کو ابال لیں اور چینی اور سویاں ڈال کر پکائیں۔ سویاں نرم ہو جائیں تو چولہا بند کردیں اور ڈش میں نکال لیں۔ ڈبل روٹی کو حسب پسند شیپ میں کاٹ کر تل لیں۔ چینی میں پانی ڈال کر پکائیں کہ چینی گھل جائے۔ اب تلے ہوئے سلائس شیرے میں ڈال کر نکال کر سویوں پر رکھیں۔ سلائس پر کھویا، بادام، پستہ رکھ کر پیش کریں۔

سویوں کا زعفرانی زردہ

اجزاء

سویاں : ایک پیکٹ
گھی : آدھا کپ
الائچی (کچلی ہوئی) : چھ عدد
چینی : ایک کپ
دودھ (پکا کر گاڑھا کرلیں) : ایک کلو
کھویا : ایک پاؤ
زعفران : ایک چائے کا چمچہ
زعفرانی ایسنس : آدھا چائے کا چمچہ
زعفرانی رنگ : ایک چٹکی

ترکیب: ایک کڑاہی میں گھی گرم کریں۔ الائچی ڈالیں پھر سویوں کو ڈال کر ہلکی آنچ پر بھونیں۔ اب چینی، زعفران، زعفرانی رنگ، دودھ ڈال کر مکس کریں اور پانچ منٹ پکائیں۔ اب کھویا مکس کردیں اور دم پر رکھ دیں۔ سویاں الگ الگ ہو جائیں تو زعفرانی ایسنس، ناریل، کشمش مکس کردیں اور ڈش میں نکال لیں۔ کھوئے، پستہ، بادام، ناریل، کشمش سے سجاوٹ کردیں۔

سرخ تل والا تکہ

اجزاء

مرغی (چکن تکہ پیس) : ایک عدد
لہسن، ادرک پیسٹ : آدھا چائے کا چمچہ
نمک : حسب ذائقہ
گرم مصالحہ پاؤڈر : آدھا چائے کا چمچہ
خشخاش : آدھا چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ پاؤڈر : حسب ذائقہ

لال مرچ پاؤڈر : حسب ذائقہ
لیموں کا رس : دو کھانے کے چمچے
دہی : آدھا کپ
جائفل، جاوتری پاؤڈر : آدھا چائے کا چمچہ
ووسٹر شائر سوس : ایک کھانے کا چمچہ
تیل : دو کھانے کے چمچے
تل : دو کھانے کے چمچے
کھانے کا سرخ رنگ : آدھا چائے کا چمچ

ترکیب: گوشت میں نمک، لال مرچ پاؤڈر، سیاہ مرچ پاؤڈر، لہسن، ادرک پیسٹ، گرم مصالحہ پاؤڈر، خشخاش، لیموں کا رس، جائفل، جاوتری، دہی، ووسٹر شائر سوس، تیل، تل اور کھانے کا رنگ لگا کر اچھی طرح سے مکس کرکے ایک گھنٹے میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد اسے باربی کیو کریں۔ روسٹ کریں یا پھر تیل میں فرائی کرلیں اور چٹنی، چپس اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

مٹن ایگ بریانی

اجزاء

مٹن : آدھا کلو
چاول : آدھا کلو (دو کنی رکھ کر ابال لیں)
لیموں : ایک عدد (رس نکال لیں)
تیز پات : ایک عدد
بڑی الائچی : دو عدد
پیاز : دو عدد (سلائس کاٹ لیں)
لونگ : دو تین عدد
ہری مرچ : دو تین عدد (کاٹ لیں)
انڈے : چار عدد (ابال لیں)
فرائیڈ پیاز : پون کپ
دہی : آدھا کپ
لہسن پیسٹ : ایک کھانے کا چمچ
ادرک پیسٹ : ایک کھانے کا چمچ
زیرہ : آدھا چائے کا چمچ
دار چینی : ڈیڑھ انچ کا ٹکڑا
زردہ اور سرخ رنگ : ایک ایک چٹکی (تھوڑے سے پانی میں الگ الگ حل کرلیں)
ہرا دھنیا : آدھی گٹھی (چوپڈ)
کُٹی سرخ مرچ : حسب ذائقہ
نمک : حسب ذائقہ
آئل : حسب ضرورت

ترکیب: دار چینی، لونگ، بڑی الائچی، زیرہ اور تیز پات ڈرائی روسٹ کرکے گرائنڈ کرلیں۔ آئل گرم کرکے پیاز، لہسن اور ادرک پیسٹ ہلکا فرائی کریں۔ اب مٹن، نمک، کٹی سرخ مرچ، ہری مرچ اور آدھا ہرا دھنیا ڈال کر بھونیں۔ دہی اور گرائنڈ کیا گیا مصالحہ شامل کرکے بھونیں پھر پانی ڈال کر گوشت گلا لیں۔ پین میں چاولوں کی تہ لگا کر اوپر مٹن پھیلائیں پھر چاول کی مزید ایک تہ لگا دیں۔ آخر میں بقیہ ہرا دھنیا، فرائیڈ پیاز، لیمن جوس، زردہ اور سرخ رنگ ڈال کر دم لگا دیں۔ ابلے ہوئے انڈوں سے سجا کر گرم گرم سرو کریں۔

چکن نہاری

اجزاء

مرغی کا گوشت : ایک کلو
نہاری مصالحہ : ایک پیکٹ
گھی : ڈیڑھ کپ
لہسن، ادرک پیسٹ : دو چائے کے چمچے
پیاز : ایک عدد (سلائس کاٹ لیں)
آٹا : آدھا کپ

نمک : حسب ذائقہ
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا) : آدھا کپ
ہری مرچیں : دو عدد (چوپ کرلیں)
ادرک کے سلائس، لیموں : سجاوٹ کے لیے

ترکیب: دیگچی میں گھی گرم کر کے پیاز ڈال کر سنہری کرلیں۔ لہسن ادرک پیسٹ اور گوشت ڈال کر بھونیں۔ نہاری مصالحہ ڈال کر مزید بھونیں اور حسب ضرورت پانی شامل کر کے ڈھک کر پکائیں۔ آٹا ایک کپ پانی میں گھول لیں۔ گوشت گل جائے اور حسب پسند شوربہ باقی رہ جائے تو آٹا اور نمک شامل کردیں۔ چمچہ مسلسل چلاتی رہیں۔ ڈھک کر دھیمی آنچ پر دس منٹ تک پکائیں۔ تیل الگ ہو جائے تو آنچ سے اتارلیں۔ سرونگ ڈش میں نکال لیں۔ الگ ڈش میں ہرا دھنیا، ہری مرچیں، ادرک کے سلائس اور لیموں کی قاشیں سجا کر نہاری کے ساتھ پیش کریں۔

ملائیشین پراٹھے

اجزاء
میدہ (چھنا ہوا) : آدھا کلو
انڈہ : ایک عدد
مکھن : دو کھانے کے چمچے
چینی : ایک کھانے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر : پون چائے کا چمچہ
نمک : حسب ذائقہ
انڈہ (پھینٹا ہوا) : لگانے لیے
بھرنے کے اجزاء
انڈے (ابلے اور چوپ کیے ہوئے) : چار عدد
پیاز (چوپ کی ہوئی) : ایک عدد
لہسن (چوپ کیے ہوئے) : پانچ جوے
موزریلا چیز (کدوکش) : سو گرام
پسی ہوئی لال مرچ : ایک چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی کالی مرچ : آدھا چائے کا چمچہ
نمک : حسب ذائقہ
تیل : تلنے کے لیے

ترکیب: پیالے میں آٹے کے اجزا ملا کر اسے گوندھ لیں۔ اس کے پیڑے بنا کر چوکور روٹیاں بیلیں، ایک پیالے میں بھرنے کے اجزاء ملا لیں۔ بیلی ہوئی روٹیوں کی ایک جانب پیالے کا تھوڑا تھوڑا آمیزہ پھیلائیں اور اسے دہرا کر بند کرلیں۔ ان کے کناروں کو انڈہ لگا کر بند کردیں۔ پھینٹی ہوئی انڈہ اس کے اوپر لگائیں۔ پراٹھوں کو توے پر دونوں جانب سے سینک کر درمیان سے تکونے کاٹ لیں۔ سرونگ ڈش کو سلاد پتوں سے سجائیں اور پراٹھے رکھ کر پیش کریں۔

کھجور کا ٹھنڈا مشروب

اجزاء
دودھ : آدھا کلو
کھجور : ایک پاؤ
چینی : سو گرام
سبز الائچی : تین عدد
برف کا چورا : ضرورت کے مطابق

ترکیب:
دودھ میں تھوڑا پانی ڈال کر ایک اُبال دے کر اتارلیں پھر کھجور کی گٹھلیاں نکال کر تھوڑے سے دودھ میں نرم ہونے کے لیے بھگودیں پھر بھیگی ہوئی کھجوروں کو کیمچر میں ڈال کر خوب باریک پیس لیں اب اس مرکب کو اور چینی دودھ کو کیمچر میں ڈال کر دوبارہ سے باریک کرلیں پھر اس کو برابر برابر گلاس میں ڈال لیں اور اوپر سے برف کا چورا اور سبز الائچی کا پاؤڈر ڈال کر پیش کریں۔

☆

سنگھار

لو بھگائیں جان چھڑائیں

آج کل گرمی کا موسم اپنے عروج پر ہے گرمیوں کے دن راتوں کی نسبت کسی قدر بڑے ہوتے ہیں دن کے وقت دھوپ کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے، جس کے باعث لوگ دن کے ٹائم باہر کام نہیں کر سکتے، لیکن جو لوگ زندگی گزارنا جانتے ہیں ان کے لیے گرمی کی شدت برداشت کرنا کافی مشکل ہے اور ان کی صحت پر کافی برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خاص طور پر یہ موسم خواتین اور بچوں پر بہت زیادہ اثرانداز ہوتا ہے۔ ایسے ماحول میں دھوپ زیادہ رہنے سے لو لگنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اگر انسان فوری طور پر خود کو ٹھنڈی جگہ پر نہ لے جائے اور بروقت اس کا علاج نہ کیا جائے تو موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ آپ کے جسم پر لو کا حملہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ بہت زیادہ وقت دھوپ میں گزارتے ہیں اور حالت بہت زیادہ نازک ہو جاتی ہے ایسے میں مریض کو ہمیشہ فوری طبی امداد کی ضرورت ہوتی ہے اس کے ساتھ ساتھ مریض کو فوراً پانی پلانا چاہیے تاکہ اس کا جسمانی درجہ حرارت کم ہو سکے۔ لو لگنے کی چند علامات درج ذیل بیان کی جارہی ہیں جن کو جان کر آپ لو سے بچ سکتے ہیں۔

علامات

1۔ لو لگنے کی ابتدائی علامات میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کی جلد خشک اور گرم ہو جاتی ہے۔
2۔ پسینہ آنا بند ہو جاتا ہے جس کے باعث آپ کا جسم خود کو ٹھنڈا نہیں کر پاتا ہے۔
3۔ سانس لینے میں کافی دقت ہوتی ہے تیز سانس لینے کی وجہ سے آپ کا سانس پھولنے لگ جاتا ہے۔
4۔ جسم کا درجہ حرارت اور دل کی دھڑکن دونوں اچانک بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔
5۔ وہ افراد جو باہر دھوپ میں کام کرتے ہیں یا وہ لوگ جو بہت زیادہ ورزش کرتے ہیں اور پانی نہیں پیتے یا پھر ان لوگوں میں جو کپڑے موسم کے مطابق نہیں پہنتے ان کو لو لگنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ویسے تو لو کسی بھی فرد کو لگ سکتی ہے مگر بچے بزرگ اور خواتین اس سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں کیونکہ ان لوگوں میں قوت برداشت کافی کم ہوتی ہے۔

لو سے بچنے کی احتیاطی تدابیر مندرجہ ذیل ہیں۔

احتیاطی تدابیر

☆ خود کو دھوپ اور گرمی سے بچائیں۔
☆ اپنے کام صبح یا شام کے وقت کرنے کی کوشش کریں۔
☆ تیز دھوپ میں باہر مت نکلیں اور اگر جانا بہت ضروری ہو تو چھتری یا گلاسز یا سر پر اسکارف لے کر باہر جائیں۔
☆ زیادہ سے زیادہ پانی پئیں اور اپنے سر کو گرمی سے بچائیں تاکہ آپ کے دماغ میں موجود ٹمپریچر

کنٹرول سسٹم ٹھیک طرح کام کر سکے۔

☆ سبزیوں اور پھلوں کے ٹھنڈے مشروبات زیادہ سے زیادہ پئیں۔

☆ ہمیشہ دھوپ سے ہٹ کر سائے میں چلیں۔

☆ کھانے میں احتیاط سے کام لیں اگر سلاد سبزیوں کا استعمال زیادہ کیا جائے تو بہتر ہو گا۔

☆ گرمی کے موسم میں ہلکے کلر کے اور ایسے کپڑے پہنیں جس میں ہوا آسانی سے گزر سکے۔

دہی کھائیں خوبصورتی پائیں

دہی اور لسی دیہاتوں کی سب سے زیادہ مقبول غذا ہے اور اس کا درست استعمال نہ صرف کھانے پینے بلکہ خوبصورتی کے لئے بھی اہم ہے۔ دہی کے استعمال سے چہرے پر شادابی اور خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ ترک باشندوں کے سرخی مائل چہروں کا راز بھی دہی کا زیادہ استعمال بتایا جاتا ہے۔ دہی ایک حیرت انگیز کلینزر کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے اور چہرے اور سر کی جلد کو صحت مند رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ ماہرین جلد کا کہنا ہے کہ دہی کے اندر قدرتی حسن کو برقرار رکھنے کی بے شمار خصوصیات ہوتی ہیں، کیونکہ اس میں موجود عنصر جلد کو ٹھیک کرنے میں مددگار ہوتا ہے دہی کو جلد پر لگا کر کچھ دیر کے لئے چھوڑ دیں اور ہلکے گرم پانی سے چہرے کو دھولیں جو آپ کو نہ صرف نکھرا نکھرا بنا دے گا بلکہ چہرے پر موجود دانوں کو بھی ختم کر دے گا۔

چمکدار جلد کے لیے

بہترین فوائد کے لیے روزانہ چہرے پر دہی لگانے سے جلد کی چمک بحال ہوتی ہے۔ دہی میں شامل زنک تمام قسم کے جراثیم چہرے سے صاف کر کے اسے خوبصورت بناتی ہے مگر دہی لگانے سے پہلے چہرے کو تمام قسم کے میک اپ سے پاک کر لینا چاہئے چہرے اور گردن پر انڈے کی سفیدی میں چائے کا چمچہ دہی ایک چائے کا چمچہ شہد ملا کر چہرے اور گردن پر لگائیں۔ 15 منٹ کے بعد نیم گرم پانی سے چہرے اور گردن کو اچھی طرح دھولیں چند دنوں میں جلد چمکدار ہو جائے گی۔

کیل مہاسوں کے لیے

بالائی سے پاک دہی میں تھوڑا سا خمیر ملا کر گالوں پر لگائیں چند منٹ بعد سادے پانی سے چہرے کو دھوئیں جلد سے دانوں کیل مہاسوں کا خاتمہ چند ہی دنوں میں ہو جائے گا۔

خشکی کے لیے

اگر آپ کے بالوں میں خشکی بڑھ گئی ہے تو آدھا پاؤ دہی میں ایک انڈا ملا کر بالوں پر لگائیں۔ اس کے بعد تولیے سے اپنے بالوں کو لپیٹ لیں ایک گھنٹے کے بعد سر دھولیں اس طرح سر میں خشکی کی شکایت بھی دور ہو جائے گی۔

نرم ہاتھوں کے لیے

دہی میں سے بالائی الگ کر کے اس میں ایک لیمن کا رس ملا کر چند گھنٹوں کے لیے فریزر میں رکھ دیں یہ آمیزہ ہاتھوں اور ناخنوں پر لگائیں۔ تھوڑی دیر بعد ہاتھ اور ناخن دھو کر خشک کر لیں 2 ہفتے تک یہ عمل کرتے ہیں۔ اس طرح آپ کے ہاتھوں کی جلد نرم ملائم اور خوبصورت ہو جائے گی۔

جھریوں کے لیے

اگر آپ چہرے کو جھریوں سے پاک رکھنا چاہتے ہیں تو ایک ٹی اسپون دہی میں ایک چھوٹا اسپون کینوں کا رس یا آدھے لیمن کا رس شامل کر کے چہرے پر 5 منٹ تک لگے رہنے دیں اس کے بعد نیم گرم پانی سے چہرے کو دھولیں۔ لیمن اور کسی دوسرے رسیلے پھل کا رس بھی دہی میں شامل کر سکتے ہیں۔

......☆......